

اقبال اور قادیانیت

تحقیق کے نئے زاویے

بشیر احمد ایم۔ اے

(فلپس سکول آف لاء اینڈ ڈپلومیسی پولیس اے)

مجلسِ علم و دانش

پوسٹ بکس نمبر 639 راولپنڈی

اقبال اور قادیانیت

تحقیق کے نئے زاویے

بشیر احمد ایم۔ اے

(فلچر سکول آف لاء اینڈ ڈپلومیسی یو ایس اے)

مجلسِ علم و دانش

پوسٹ بکس نمبر 639 راولپنڈی

انتساب

صدیقی العزیز

شکیل عثمانی

کے نام

جن کی تحریک پر یہ کتاب لکھی گئی اور جنہوں نے اس کی ترتیب و تدوین
اور اس کے لئے بعض نکات کی تفہیم و تعبیر میں مدد کی

مجلسِ علم و دانش

مجلسِ علم و دانش ایک آزاد تحقیقی ادارہ ہے۔ اس کا کسی سیاسی یا مذہبی جماعت، تنظیم یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ کوئی این جی او ہے۔

مجلس کا بنیادی مقصد پاکستان کی سلامتی، استحکام اور ترقی کے لیے معاشرے میں امن، یک جہتی اور باہمی یگانگت کو فروغ دینا ہے۔ اس کے روح رواں جناب بشیر احمد ہیں جو ”قادیان سے اسرائیل تک“، ”بہائیت، اسرائیل کی خفیہ سیاسی تنظیم“، "Ahmadiyyah Movement: Brithish- Jewish Connections"، ”تحریک احمدیہ: سامراجی و یہودی گٹھ جوڑ (مترجم احمد علی ظفر)“، ”فری میسنری، اسلام دشمن خفیہ یہودی تنظیم“ اور ”بائبل کا تحقیقی جائزہ“ جیسی فکر انگیز کتابوں کے مصنف ہیں۔

ناشر

تقدیم

ڈاکٹر سفیر اختر

احمدی تحریک کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس تحریک کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی (1835ء - 1908ء) نے اپنی عوامی زندگی کا آغاز ایک مناظر کے طور پر کیا تھا۔ انہوں نے مسیحی پادریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں کے اعتراضات کے جواب میں اسلام کی حقانیت پر سینکڑوں دلائل دینے کا دعویٰ کیا تھا، اور جب مخالفین اسلام کو مرزا صاحب نے ان ہی کے جارحانہ لہجے میں مخاطب کیا تو مرزا صاحب کے لیے بہت سے دلوں کے دروازے وا ہو گئے تھے۔ پچاس جلدوں میں ”برائین احمدیہ“ کی تالیف کے دعوے (جو پانچ جلدوں سے آگے نہ بڑھ سکی) اور ”سرمد چشم آریہ“ نے ان کی شہرت کو پنجاب کے ایک گمنام قصبے ”قادیان“ سے نکال کر برصغیر کے ایک بڑے حصے تک پھیلا دیا تھا۔ مرزا صاحب نے ابتداء میں جو کچھ لکھا، وہ ان کے معاصر مسلم اہل قلم کی تحریروں سے زیادہ مختلف نہ تھا، بلکہ ان کے ہاں مولوی چراغ علی اور بعض دوسرے بزرگوں سے استفادے کی واضح شہادتیں موجود ہیں، تاہم مرزا صاحب کے لب و لہجے میں ماموریت من اللہ کی تعلیٰ بہت نمایاں تھی جس نے انہیں ملہم، محدث، مسیح موعود، مہدی معبود اور نبی کے دعووں تک پہنچا دیا، اور یوں امت مسلمہ کی نمائندگی کرنے کے بجائے انہوں نے اس کے بالمقابل ایک نئی امت کھڑی کر دی جس کی اطاعت کا مرکز و محور مرزا صاحب کی ذات تھی۔

مرزا صاحب کے ان دعووں کا ذمہ دار علمائے کرام نے بروقت ٹوٹ لیا، اور انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا۔ علمائے کرام کے اس فتوے یا فیصلے کو ان لوگوں نے تو اہمیت دی جو مرزا صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کرتے تھے، مگر ان افراد کے ہاں، جو مرزا صاحب کی تحریروں کے قاری نہ تھے، یہ فتویٰ اولاً اس لیے پذیرائی حاصل نہ کر سکا کہ ان کے ہاں، علمائے کرام کا تاثر ”بھگڑالو مولوی“ کا تھا جو شیعہ۔ سنی، مقلد۔ غیر مقلد، وہابی۔ غیر وہابی اختلافات میں عدم برداشت کا اظہار کرتے رہتے تھے، ثانیاً مرزا صاحب اور ان کے پیرو کار سماجی سطح پر خدمت اسلام کا امیج برقرار رکھے ہوئے تھے، اور غالباً انسانی خصائل کے اعتبار سے وہ نسبتاً بہتر افراد تھے۔

علامہ اقبال (1877-1938ء) کا شمار بھی ان ہی آخر الذکر لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک عرصے تک مرزا صاحب کی تحریروں کا مطالعہ نہ کیا، علمائے کرام کی تنگ نظری کے شاکِی رہے، اور مرزا

صاحب کے پیروکاروں کے ساتھ اپنے سماجی تعلقات کے تحت احمدی تحریک سے اچھی توقعات وابستہ رکھیں۔ مرزا صاحب جن دنوں (1864ء-1868ء) سیالکوٹ میں مقیم تھے، ان کی علامہ اقبال کے والد گرامی، شیخ نور محمد اور استاد محترم، مولوی سید میر حسن کے ہاں نشست رہتی تھی۔ مولوی سید میر حسن کے پچازاد بھائی میر حسام الدین اور پھر میر حسام الدین کے صاحبزادے میر حامد شاہ مرزا صاحب کے پیروکاروں میں سے تھے۔ اسی طرح مرزا صاحب کے ایک بڑے جذباتی مرید مولوی عبدالکریم سیالکوٹی، علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد کے احباب میں سے تھے۔ علامہ اقبال کے بچپن کے ساتھیوں اور ہم جماعتوں میں بھی چند نمایاں احمدیوں کے نام آتے ہیں۔ اس سماجی تناظر میں علامہ اقبال نے مرزا صاحب اور احمدی تحریک کے بارے میں اچھی رائے قائم کی اور خطبہ علی گڑھ (1910ء) The Muslim Community: A Sociological Study میں یہ کہا کہ ”پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھینٹہ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔“

علامہ اقبال کو احمدی جماعت کو قریب سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا، جب 1931ء میں انہوں نے اس جماعت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود احمد (1889ء-1965ء) کے ساتھ آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں کام کیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم پر کام کرتے ہوئے علامہ اقبال پر واضح ہوا کہ احمدی جماعت اسلام اور کشمیری مسلمانوں کے درود کے نام پر اصلاً اپنے گروہی مقاصد کے لیے کوشاں ہے، چنانچہ انہوں نے احمدی تحریک کا سنجیدہ مطالعہ شروع کیا، جس کا اظہار ان تحریروں کی شکل میں ہوا جن کی چھن احمدی جماعت آج تک محسوس کرتی ہے۔ علامہ اقبال نے احمدی جماعت کے مکمل صفائی پنڈت جواہر لال نہرو کو جو اپنی قوم پرستی کے سبب معروف تھے، دو ٹوک الفاظ میں لکھا:

”میں اس بات میں کوئی شک و شبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔“

علامہ اقبال کی رائے سے احمدیوں کا اختلاف تو سمجھ میں آتا ہے، مگر یہ بات عجیب لگتی ہے کہ وہ علامہ کی اس رائے کو ان کی آخری اور حقیقی رائے کیوں نہیں سمجھتے؟ اور بار بار علامہ کے اُن اکا دکا جملوں کا ذکر کرتے ہیں جن پر انہوں نے خود خطِ تنبیخ بھیج دیا ہے۔ غالباً یہ مرزا صاحب کی اس مناظرانہ روایت کا تسلسل ہے کہ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اختلاف نظر رکھنے والوں کو مسلسل چیلنج دیتے چلے جائیے، اس

روایت کا ایک مظہر ڈاکٹر جاوید اقبال کی تالیف ”زندہ رود“ کی اشاعت پر سامنے آیا۔ جاوید اقبال صاحب نے علامہ اقبال کی زندگی کے آخری برسوں پر لکھتے ہوئے احمدی تحریک کے بارے میں ان کے فکر و نظر کا حاصل پیش کیا ہے۔ اُن سے بہت پہلے 36-1935ء کے واقعات کے حوالے سے احمدی جماعت کے سرکاری مورخ دوست محمد شاہد ”تاریخ احمدیت“ میں اپنے سارے زور قلم کے ساتھ احمدی نقطہ نظر بیان کر چکے تھے۔ ”زندہ رود“ نہ احمدی تحریک کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی تھی، اور نہ علامہ اقبال کے افکار کے حوالے سے احمدی نقطہ نظر پر دُعا تھا، مگر مناظرے کے خواہشمند احمدی قلم کاروں نے ”زندہ رود“ کو موضوع بحث بنالیا، اور شیخ عبدالماجد صاحب نے یکے بعد دیگرے دو کتابیں تالیف کر دیں۔

شیخ عبدالماجد صاحب نے بانی تحریک کی روایت کے مطابق بھرپور تعلقی سے کام لیا، اور ”زندہ رود“ کے مصنف کو دعوتِ مبارزت دی۔ بعض اہل قلم نے شیخ عبدالماجد صاحب کی کتابوں کا جائزہ لیا ہے، مگر جس دقیقہ رسی سے ان کا جائزہ لیا جانا چاہیے تھا، یہ وطن عزیز کے معروف مصنف جناب بشیر احمد کے لیے مقدر تھا، جنہوں نے احمدی تحریک کا مطالعہ ایک مورخ اور سماجی علوم کے ماہر کی حیثیت سے کیا ہے، اور اس میں ان کا کوئی معاصر، ان کا حریف نہیں۔ اُن کی احمدی لٹریچر پر جتنی گہری نظر ہے، اس کی جھلکیاں ان کی سابق تالیف Ahmadiyya Movement: British-Jewish Connections (اردو ترجمہ):

تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ کے ساتھ زیر نظر کاوش میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جناب بشیر احمد کی زیر نظر کاوش سے شیخ عبدالماجد صاحب کے ہم عقیدہ دوست مطمئن ہو جائیں گے، اور وہ احمدی تحریک کے بارے میں علامہ اقبال کی آخری رائے ہی کو اُن کی اصل رائے مان لیں گے، تاہم غیر جانب دار قاری پر یہ بات ضرور واضح ہو جائے گی کہ احمدی قلم کار علامہ اقبال کی 36-1935ء کی تحریروں کو کیوں بھلا نہیں سکتے؟ نیز یہ امر بھی واضح ہو جائے گا کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حق کو حق سمجھنے اور باطل کو باطل سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اسلام آباد

6 جون 2005ء

دیباچہ

شکیل عثمانی

راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی 24، 25 مارچ 2005 میں لکھا تھا ”اقبال شعلی کی روایت خاصی قدیم ہے۔ صرف دہلی اور لکھنؤ کی اردو کو مستند سمجھنے والوں، عالی وحدت الوجودیوں اور نام نہاد روشن خیالوں کے علاوہ بائیں بازو کے دانشور بھی اس روایت کے علمبردار رہے ہیں، قادیانیوں کو اس ضمن میں پانچویں سوار کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں قادیانیت سے اختلاف کا اظہار کرتے رہے لیکن متعدد وجوہ کی بنا پر (جو ایک مفصل اور مبسوط تحریر کی متقاضی ہیں) انہیں بہ امعان نظر قادیانیت کے مطالعے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ اُس بھرپور رائے کا اظہار نہیں کر سکے جو انہوں نے 1935ء میں کی کہ حکومت قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ جماعت تسلیم کرے۔“ اب راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ زیر نظر تصنیف میں جناب بشیر احمد نے اس حسن و خوبی سے ان وجوہ کو بیان کیا ہے کہ بحث و نظر کا یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اقبال کو بوجہ قادیانی تحریک کا بہ امعان نظر جائزہ لینے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کا اظہار اُس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے 13 نومبر 1915ء کو ہفت روزہ ”پیغام صلح“ لاہور کے ایڈیٹر کو لکھا۔ اس خط میں اقبال نے اپنے اُس خط کو بھی درج کر دیا ہے جو انہوں نے اس سلسلے میں اپنے دوست سید بشیر احمد کو لکھا تھا۔ اقبال لکھتے ہیں:

”انعام اللہ شاہ سیالکوٹی نے مجھ سے یہ منسوب کیا ہے کہ

میں نے کسی محفل میں کہا کہ عقائد کے لحاظ سے [جماعت

احمدیہ] قادیان والے سچے ہیں لیکن مجھے ہمدردی [جماعت

احمدیہ] لاہور والوں سے ہے۔ اختلاف سلسلہ احمدیہ کے متعلق

وہی رائے دے سکتا ہے جو مرزا [غلام احمد قادیانی] صاحب کی

تصانیف سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں“

(کلیاتِ مکاتیب اقبال جلد اول مرتبہ مظفر حسین برنی ص 431)

اسی خط میں اقبال لکھتے ہیں ”اتنی بات ضرور ہے کہ میں نے کتاب حقیقت الدعوة [مصنفہ امام جماعت احمدیہ مرزا بشیر الدین محمود] کی بہ لحاظ اسکی ترتیب کے تعریف کی تھی۔“ اقبال کے اس جملے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوگا کہ انہوں نے اس کتاب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا کیونکہ اقبال جیسا عبقری کسی کتاب کو سرسری طور پر دیکھ کر یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ بہ لحاظ ترتیب یہ کیسی ہے۔

اس کے علاوہ 11 اپریل 1916ء کے روزنامہ الفضل قادیان میں اقبال کے ایک مضمون کا اقتباس اس طرح شائع ہوا ہے:

”لمعات میں ڈاکٹر محمد اقبال صاحب پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کا ایک مضمون چھپا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہے جس کا انکار مستلزم کفر ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے“

(قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ از پروفیسر الیاس برنی ص 61 مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان کا ایڈیشن)

اس اقتباس میں لفظ ”اگر“ قائل غور ہے۔ اس اقتباس کے مطابق اُس وقت اقبال کے سامنے ایسے واضح شواہد نہیں تھے کہ قادیانی نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کی آمد کے قائل ہیں جس کا انکار مستلزم کفر ہے۔

اقبال کی عام سوانح عمریوں میں انکی مرزا غلام احمد قادیانی سے ملاقات کا ذکر نہیں ملتا۔ اس ملاقات کا انکشاف غالباً سب سے پہلے جماعت احمدیہ لاہور کے امیر مولانا محمد علی لاہوری نے کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

”میں اکتوبر 1934ء میں ڈاکٹر اقبال کی عیارت کو گیا۔ دوران گفتگو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ [سر] فضل حسین 1904ء میں مرزا غلام احمد قادیانی سے سیالکوٹ میں ملے تھے۔ [سر] فضل حسین نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہتے ہیں تو مرزا صاحب نے جواب دیا ہرگز نہیں۔“

(Sir Muhammad Iqbal's statement regarding

Qadianis, Maulana Muhammad Ali, Page 6,7)

زیر نظر کتاب کے مصنف جناب بشیر احمد نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اقبال کے ذہن پر مرزا صاحب سے اس ملاقات کے نقوش تا دیر قائم رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عرصے تک قادیانیوں کے ساتھ نہ تو بحث و مباحثہ کیا اور نہ انکی تکفیر کی۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ جب خود بانی سلسلہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہنے سے انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ حقیقی نبوت کے مدعی نہیں ہیں۔ جناب بشیر احمد آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کے جانشین حکیم نور الدین نے مسلمانوں سے تعاون بڑھانے کے لیے اعتدال پسندانہ روش اختیار کی۔ انہوں نے مرزا صاحب کی نبوت اور ان کے دعووں پر ایمان نہ لانے والوں کی تکفیر پر زور نہیں دیا بلکہ خواجہ کمال الدین کی سرگرمیوں کی سرپرستی کی جنہوں نے برصغیر کے طول و عرض میں صرف اسلام کے موضوع پر لیکچر دے، عام مسلمانوں سے میل جول بڑھانے کا سلسلہ شروع کیا اور نفرتوں کی وہ خلیج پائنے کی کوشش کی جو مرزا صاحب کے الہامات، پیش گوئیوں اور اشتعال انگیز تحریروں نے پیدا کر دی تھی۔ یاد رہے

کہ حکیم نور الدین کے ہاں ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں جن سے مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت اور تکفیر مسلمین کی تائید ہوتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کے دور میں احمدی جماعت کی پالیسی معتدل رہی اور نبوت مرزا اور تکفیر مسلمین پر زور نہیں دیا گیا۔ بہر حال جناب بشیر احمد نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ مرزا صاحب نے سر فضل حسین اور اقبال سے ملاقات کے دوران اپنے اصل موقف کو انتہائی عیاری سے چھپایا اور تحریک احمدیت کی حقیقی روح وہ ہے جو مرزا بشیر الدین محمود کی تحریروں سے سامنے آتی ہے۔

جولائی 1908ء میں جب اقبال یورپ سے وطن واپس آئے تو مرزا صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ اقبال کی لاہور آمد پر مرزا صاحب کے پیروکاروں نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان پیروکاروں میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ، مولانا محمد علی لاہوری، خواجہ کمال الدین اور ڈاکٹر بشارت احمد نمایاں تھے۔ یہ لوگ ذاتی سطح پر اچھے اخلاق و کردار کے حامل تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ اقبال کے سماجی مراسم بھی تھے۔ ”یہ علامہ سے علمی موضوعات پر تقریریں کراتے اور انہیں سماجی تقریبات میں آگے آگے رکھتے۔“ (ملفوظات اقبال مرتبہ ڈاکٹر ابوللیث صدیقی، ص 88-87)۔ اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ یہ اقبال سے مرزا صاحب کی خدمت اسلام کا ذکر کرتے اور انہیں بانی تحریک کے دورِ اول کے معتقدات سناتے جن میں دعویٰ نبوت سے انکار اور آنحضرت ﷺ کے آخری نبی ہونے کا اقرار ہے۔

اقبال کو جب 1931-32ء کے دوران مرزا بشیر الدین محمود کے ساتھ آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں کام کرنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا کہ مسئلہ چاہے اجتماعی یا قومی کیوں نہ ہو، قادیانی اپنے گروہی مفادات کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتے اور وہ صرف اپنے امام کی اطاعت کے پابند ہیں اس لئے اقبال 1933ء کے وسط میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔ اسی سال پروفیسر الیاس برنی کی کتاب ”قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ“ شائع ہوئی (مقدمہ قادیانی مذہب، ص 78) اور کثیر تعداد میں ملک کے اہل علم کو بھیجی گئی۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے اقبال قادیانیوں

کے عقائد سے مکمل طور پر واقف ہوئے۔ انہوں نے اس کے دوسرے ایڈیشن پر (جو جلد ہی شائع ہوا) یہ رائے دی کہ یہ کتاب ملک میں وسیع پیمانے پر شائع ہونے کے قابل ہے۔ (افسوس کہ اقبال کی یہ رائے ان کی تحریروں یا خطوط کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ میں نے اسے پروفیسر برنی کی مذکورہ کتاب کی تمہید چہارم مطبوعہ 1935ء سے نقل کیا ہے) بہر حال اقبال کے اس کتاب کے مطالعے کا سال 1934ء متعین کیا جاسکتا ہے۔ اسی سال انہوں نے قادیانیوں کی اصل کتابوں کا مطالعہ کیا اور اپنے مطالعے کا اظہار 1935ء کے اس تاریخی بیان کی صورت میں کیا کہ حکومت قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ جماعت تسلیم کرے۔ اپنے اس موقف کی تائید میں راقم الحروف جسٹس (ر) عطا اللہ سجاد کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتا ہے۔ جسٹس صاحب لکھتے ہیں:

”1935ء کی بات ہے کہ میں روزنامہ احسان (لاہور)

کے چیف ایڈیٹر مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کے ہمراہ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں میں ”احسان“ میں رکن ادارہ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ دوران گفتگو سب سے زیادہ نمایاں موضوع قادیانیوں کے بارے میں حضرت علامہ کا بیان تھا۔ میں نے حضرت علامہ سے دریافت کیا کہ آپ قادیانیوں کے اخبار میں لکھتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ بعض معاملات میں تعاون بھی کرتے رہے ہیں تو پھر اچانک آپ کا رویہ ان کے بارے میں اس قدر شدید کیوں ہو گیا کہ آپ نے مطالبہ کیا ہے کہ قادیانیوں کو عالم اسلام سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔ حضرت علامہ نے کہا کہ میں ان کی جماعت کو اچھا سمجھتا تھا اور مسئلہ کشمیر کے متعلق انہوں نے جو جماعت بنائی تھی، میں اس کا سکرٹری بھی رہا۔ لیکن میری بیماری 10

جنوری 1934ء کو شروع ہوئی [میرے لیے باعثِ رحمت بن گئی
 کہ خدا نے مجھ پر حق و صداقت کے دروازے کھول دئے۔
 انہوں نے کہا کہ میں نے الیاس برنی کی ایک کتاب جو
 قادیانیوں کے عقائد کے خلاف تھی پڑھی اور پھر اس کے بعد
 قادیانیوں کی اصل کتابیں منگوا کر ان کا مطالعہ کیا کیوں کہ میرے
 پاس کافی وقت تھا۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ مسلمانوں کے مختلف
 فرقے ایک دوسرے سے بعض معاملات میں شدید اختلاف
 رکھتے ہیں لیکن ختم نبوت کے معاملے میں امت میں کوئی
 اختلاف نہیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد فصاحت اور علم قرآنی کا
 ایک دریا بہہ نکلا اور علامہ اقبال نے حضور ﷺ کی ختم المرسلین
 اور امت اسلامیہ کے وجود اور اتحاد سے اس کے تعلق کو اس طرح
 جوڑا کہ علم و آگہی کے موتی بکھرنے لگے اور میں اور مولانا میکش
 وہ موتی سمیٹتے رہے“

(روزنامہ نوائے وقت، 21 اپریل 1999ء)

پروفیسر الیاس برنی کے بقول مرزا غلام احمد قادیانی، حکیم نور الدین اور دوسرے قادیانی
 اساطین کی کتابوں میں اس درجہ تکرار، تضاد، ابہام اور التباس ہے کہ اکثر مباحث بھول بھلیاں نظر
 آتے ہیں (قادیانی مذہب، تمہید اول، ص 17)۔ عربی اور اردو کے صاحب طرز ادیب، مولانا
 ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ قادیانی لٹریچر حسن انشاء، حلاوتِ تحریر اور عمقِ فکر سے یکسر خالی ہے
 (ماہنامہ سیارہ لاہور، ستمبر 1965ء)۔ اس تضاد اور التباس کے پیش نظر ملک کے ممتاز ادیب اور
 صحافی شورش کاشمیری نے مرزا صاحب اور دوسرے قادیانی اساطین کی تحریروں اور تعبیروں کو دو شیزہ
 لی کہہ مکر نیاں قرار دیا ہے اور راقم الحروف کی رائے میں ان تحریروں اور تعبیروں پر یہ مصرعہ پوری

طرح صادق آتا ہے۔

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

بہر حال یہ اقبال کی ہمت تھی کہ انہوں نے علم و ادب کے حوالے سے اپنے ذوق پر جبر کر کے نام نہاد سلطان القلم (مرزا غلام احمد قادیانی) اور دوسرے احمدی رہنماؤں کی کتابیں پڑھیں اور صحیح نتائج اخذ کئے۔

جناب بشیر احمد نے ”اسلام اینڈ احمد ازم“ کے زیر عنوان علامہ اقبال کے مشہور زمانہ مضمون کے بارے میں روزنامہ الفضل ربوہ کے ایک شوٹے کا ذکر کیا ہے۔ ممتاز صحافی اور علامہ کے نیاز مند خواجہ عبدالوحید کے بیان کے مطابق پچاس کی دہائی کے اوائل میں الفضل نے اداروں کے طویل سلسلے میں داخلی شواہد کی بنیاد پر دعویٰ کیا کہ یہ مضمون اقبال کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ جناب بشیر احمد نے خواجہ صاحب کی ڈائری کے حوالے سے بتایا ہے کہ کس طرح قادیانیوں کا یہ دعویٰ بے بنیاد ثابت ہوا اور کس طرح اس سلسلے میں انکا منہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ خواجہ عبدالوحید کے بیان کے مطابق سب سے بڑی دلیل جو الفضل کے اداروں میں دی گئی وہ یہ تھی کہ اقبال ایک مدت تک تحریک احمدیت کے حامی رہے ہیں، لیکن اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے کیوں کہ اقبال خود یہ کہہ چکے ہیں:

”مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک [احمدیت] سے اچھے نتائج کی امید تھی۔..... لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے اسے برسوں چاہیٹ۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانی تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستے پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں

اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت، بانی اسلام سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا تھا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا،

(حرف اقبال ص 112)

اس سلسلے میں یہ دلچسپ چیز قابل ذکر ہے کہ خود مرزا غلام احمد قادیانی کے بیانات اور دعووں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”ابتدا سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعویٰ کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر یا دجال نہیں ہو سکتا“

(تریاق القلوب ص 130)

دوسری جگہ ان کا ارشاد ہے:

”خدا تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا کہ ہر وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے“

(تذکرہ مجموعہ الہامات ص 600)

حیات و نزول مسیح علیہ السلام کے حوالے سے بھی مرزا صاحب کے ارشادات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ قرآن مجید کی سورۃ الصف کی نویں آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یہ آیت جسمانی اور سیاستِ ملکی کے طور پر حضرت مسیح علیہ

السلام کے حق میں پیش گوئی ہے اور جس غلبہء کاملہء دین اسلام

کا (اس آیت میں) وعدہ دیا گیا ہے وہ غلبہء مسیح علیہ السلام کے

ذریعہ ظہور میں آئے گا اور جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ

اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو انکے ہاتھ سے دین اسلام جمع
آفاق و اقطار میں پھیل جائے گا“

(براہین احمدیہ ص 498، 499 حاشیہ در حاشیہ 3)

براہین احمدیہ کی اشاعت کے بارہ سال بعد مرزا صاحب نے اپنا موقف تبدیل کر لیا اور
اپنی تالیفات ازالہ اوہام اور توضیح مرام میں لکھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام وفات پا چکے ہیں اور انکی
آمد ثانی کا عقیدہ قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ انہوں نے ضمیمہ حقیقت الوحی میں یہ بھی لکھا کہ
حیات عیسیٰ کا عقیدہ شرکِ عظیم ہے۔ یہاں قادیانیوں کا یہ گھڑا گھڑا یا جواب نہیں چل سکتا کہ براہین
احمدیہ میں مرزا صاحب نے رسمی طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کا ذکر کیا ہے اور جب
انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام فوت ہو
گئے۔ سوال پیدا ہوتا کہ جب مرزا صاحب بقول خود براہین احمدیہ کی تالیف کے وقت رسول تھے تو وہ
اپنی کتاب میں کس طرح ایک خلاف قرآن اور شرکیہ عقیدہ بغیر اختلافی نوٹ کے درج کر سکتے تھے۔
مرزا صاحب نے براہین احمدیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب آنحضرت ﷺ کے دربار میں
رجسٹری ہو چکی ہے اور آپ ﷺ نے اسکا نام قطبی رکھا یعنی قطب ستارہ کی طرح غیر متزلزل و مستحکم
اور یہ کتاب خدا کے الہام اور امر سے لکھی گئی ہے۔ (براہین احمدیہ ص 248، 249)۔ یہاں پھر
سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکار رسالت مآب ﷺ کس طرح اس کتاب کی تصدیق کر سکتے ہیں جس
میں ایک خلاف قرآن اور شرکیہ عقیدہ بغیر کسی اختلافی نوٹ کے درج ہو۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں اور بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے اور انہوں نے اپنے
بنیادی عقیدے میں تبدیلی کی۔ اس حقیقت کا اعتراف خود ان کے صاحبزادے اور دوسرے خلیفہ
مرزا محمود احمد نے ان الفاظ میں کیا ہے:

”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ 1901ء میں آپ [مرزا غلام

احمد قادیانی] نے اپنے عقیدے میں تبدیلی کی ہے اور 1900ء

ایک درمیانی عرصہ ہے جو دونوں خیالات کے درمیان برزخ کے طور پر جد فاصل ہے پس یہ ثابت ہے کہ 1901ء سے پہلے کے حوالے جن میں آپ [مرزا غلام احمد قادیانی] نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے، اب منسوخ ہیں اور ان سے حجت پکڑنی غلط ہے“

(حقیقت المبوت، ص 121)

مجددیت اور نبوت کے دعوؤں کے باوجود اگر مرزا صاحب کے بنیادی عقائد میں تبدیلی آ سکتی ہے تو اقبال (جنہوں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا) کے نقطہ نظر میں اگر تبدیلی آگئی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے بیان پر پنڈت نہرو کے رد عمل نے کئی نئے سوالات کو جنم دیا ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں پنڈت نہرو سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس رد عمل کا اظہار کریں گے کیوں کہ ایک بیدار مغز، سامراج دشمن اور قوم پرست رہنما کی حیثیت سے وہ احمدی جماعت کے کردار سے بخوبی واقف تھے۔ راقم کے اس دعویٰ کا ثبوت خود احمدی جماعت کے امام مرزا بشیر الدین محمود نے فراہم کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خطبہ جمعہ میں کہا:

”پھر یہ خیال کہ جماعت احمدیہ انگریزوں کی ایجنٹ ہے

لوگوں کے دلوں میں اس قدر راسخ تھا کہ بعض بڑے بڑے سیاسی

لیڈروں نے مجھ سے سوال کیا کہ ہم علیحدگی میں آپ سے پوچھتے

ہیں کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کا انگریزی حکومت سے اس قسم کا تعلق

ہے۔ ڈاکٹر سید محمود جو اس وقت کانگریس کے سکریٹری ہیں، ایک

دفعہ قادیان آئے اور انہوں نے بتایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو

جب یورپ کے سفر سے واپس آئے تو انہوں نے اسٹیشن پر اتر کر

جو باتیں سب سے پہلے کہیں، ان میں ایک یہ تھی کہ میں نے اس سفر یورپ میں یہ سبق حاصل کیا ہے کہ اگر انگریزی حکومت کو ہم کمزور کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس سے پہلے احمدیہ جماعت کو کمزور کیا جائے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کا یہ خیال تھا احمدی جماعت انگریزوں کی نمائندہ اور انکی ایجنٹ ہے“

(الفضل نمبر 31، جلد 23، 6 اگست 1935ء)

پنڈت نہرو کی سوانح حیات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ 1927ء کے اواخر میں یورپ سے ہندوستان واپس آئے اور اقبال کے بیان پر انہوں نے 1936ء میں تنقید لکھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ احمدی جماعت کے سیاسی کردار سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود انہوں نے اس جماعت کے وکیل صفائی کا کردار کیوں ادا کیا۔ اس سوال پر اقبال نے اپنے اُس مضمون میں بہت خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے جو انہوں نے پنڈت نہرو کے مضامین کے جواب میں لکھا۔ وہ کہتے ہیں:

”..... میں اس حقیقت کو پنڈت نہرو اور قارئین سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایسے انسان ہیں جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں، میرا ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ وہ جن سوالات کو سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ [خواہش] بالکل خلوص پر مبنی ہے تاہم جس طریقے سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ میں اس خیال کی

طرف مائل ہوں کہ میں نے قادیانیت کے متفق جو بیان دیا تھا (جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصول کے مطابق تشریح کی گئی تھی) اس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانان ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ایک ہندوستانی قوم پرست جس کے سیاسی آئیڈل ازم نے احساسِ حقوق کو عملاً ختم کر دیا ہے یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں حق خودارادیت کا جذبہ پیدا ہو۔ یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں، کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانان ہند کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا یہ مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب ﷺ کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری اس کوشش نے کہ مسلمانان ہند کو اس امر پر متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گزر رہے ہیں، اس میں ان کا اندرونی استحکام کس قدر ضروری ہے اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے جو اصلاحی تحریکات کا روپ دھارتی ہیں، پنڈت جی کو یہ موقع دیا ہے کہ ایسی تحریکوں سے ہمدردی کریں۔

(اسلام اور احمدیت، مترجم شکیل عثمانی)

جماعت احمدیہ کی وکالت کے سلسلے میں پنڈت نہرو کے محرکات کا تجزیہ کرنے کے بعد اقبال آغا خان کے بارے میں پنڈت جی کے اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ کیا اپنے عقائد کی رو

سے انکی اسماعیلی جماعت، اسلامی وحدت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

”ہر بائیس آغا خاں کے متعلق میں دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت نہرو نے آغا خاں پر حملے کیوں کئے۔ شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں شامل ہیں۔ وہ اس بات سے بدانتہا بے خبر ہیں کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں پھر بھی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیلی تسلسل امامت کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک امام حامل وحی نہیں ہوتا وہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے“

(حرف اقبال ص 148)

خوش قسمتی سے قادیانیت کے بارے میں اقبال کے بیان کی اشاعت سے ایک سال قبل آغا خاں نے اپنے پیروؤں کو چند ہدایات دی تھیں جن کا مقصد امت مسلمہ سے یک جہتی کا اظہار تھا۔ اقبال نے ان ہدایات کو اپنے مضمون میں شامل کر کے پنڈت جی سے کہا ہے کہ اب انہیں اس امر کا تحفیہ کرنا چاہئے کہ آیا آغا خاں اسلامی وحدت کی نمائندگی کر رہے ہیں یا نہیں۔ یہ ہدایات درج ذیل ہیں:

”گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔
قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم
مسلمانوں سے اسلام ملے کہ تم کو ملو۔ اپنے بچوں کے اسلامی نام
رکھو۔ مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھو۔ پابندی
سے روزے رکھو۔ اسلامی قانون نکاح کے مطابق اپنی شادیاں

کرو۔ تمام مسلمانوں سے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو“

(روزنامہ اشار الہ آباد 21 مارچ 1934ء)

یہاں یہ بات قارئین کی دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوگی کہ ”حاضر امام“ ہر ہائی نئس آغا خان نے 1929ء میں کپورتھلہ کی جامع مسجد کے امام مولانا سید جعفر شاہ پھلواری ندوی کی اقتداء میں نماز ادا کی (مجلہ جریدہ۔ 29، ص 145، مرتبہ سید خالد جامعی/ عمر حمید ہاشمی، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی)۔ شریعت میں ظاہر کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کو یہ قدرت حاصل نہ تھی کہ وہ آغا خان کا دل چیر کر دیکھتے۔

اس کے برعکس مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے احمدی رہنماؤں نے اپنے پیروؤں کو حسب ذیل ہدایات دیں:

مرزا غلام احمد قادیانی نے ارشاد فرمایا:

”یہ جو ہم نے دوسرے مدعیان اسلام سے قطع تعلق کیا ہے
اول تو یہ خدا تعالیٰ کے حکم سے تھا نہ کہ اپنی طرف سے دوسرے وہ
لوگ ریا پرستی اور طرح طرح کی خرابیوں میں حد سے بڑھ گئے
ہیں اور ان لوگوں کو ان کی ایسی حالت کے ساتھ اپنی جماعت
کے ساتھ ملانا یا ان سے تعلق رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عمدہ اور
تازہ دودھ میں بگڑا ہوا دودھ ڈال دیں جو سڑ گیا ہے اور اس میں
کیڑے پڑ گئے ہیں اس وجہ سے ہماری جماعت کسی طرح ان
سے تعلق نہیں رکھ سکتی اور نہ ہمیں ایسے تعلق کی حاجت ہے“

(رسالہ تحفۃ الاذہان قادیان جلد 6 عدد 8 ص 311)

مرزا صاحب کہتے ہیں:

”صبر کرو اور اپنی جماعت کے غیر کے پیچھے نماز مت پڑھو۔“

بہتری اور نیکی اس میں ہے اور اسی میں تمہاری نصرت اور فتح عظیم ہے۔ دیکھو دنیا میں روٹھے ہوئے اور ایک دوسرے سے ناراض ہونے والے بھی اپنے دشمن کو چار دن منہ نہیں لگاتے اور تمہاری ناراضگی اور روٹھنا تو خدا کے لئے ہے۔ تم اگر ان میں رلے ملے جا رہے ہو تو خدا تعالیٰ جو خاص نظر تم پر رکھتا ہے وہ نہیں رکھے گا، پاک جماعت جب الگ ہو تو اس میں ترقی ہوتی ہے۔“

(ارشاد مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ اخبار الحکم، قادیان جلد 5، نمبر 29)

منقول از کتاب ”ملفوظات“ مرتبہ منظور الہی ص 265

مرزا بشیر الدین محمود، امام جماعت احمدیہ قادیان نے اپنے خطبہ جمعہ میں کہا:

”حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ

میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ غلط ہے کہ

دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا اور چند مسائل

میں ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول اکرم ﷺ،

قرآن مجید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، غرض کہ آپ نے تفصیل سے

بتایا کہ ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے،“

(الفضل قادیان ج 19، عدد 13، مورخہ 30 جولائی 1931ء)

مرزا بشیر الدین محمود لکھتے ہیں:

”کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں

ہوئے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا ہو، کافر

اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں،“

(آئینہ صداقت ص 35)

مولانا محمد علی ابھوری، امیر جماعت احمدیہ لاہور لکھتے ہیں:

”تحریک احمدیت اسلام کے ساتھ وہی رشتہ رکھتی ہے جو

عیسائیت کا یہودیت کے ساتھ تھا“

(ریویو آف ریٹلی جنرل عدد 5، جلد 5، ص 163)

مولانا محمد علی کے اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح عیسائیت اور یہودیت الگ الگ

مذہبی اکائیاں ہیں اسی طرح اسلام اور احمدیت بھی الگ الگ مذہبی اکائیاں ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی اور احمدی رہنماؤں کے مندرجہ بالا بیانات اقبال کے قادیانیت کے

بارے میں 1935ء کے بیان کی صحت کو ثابت کرتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کے مصنف جناب بشیر احمد اس سے قبل ”قادیان سے اسرائیل تک“ اور

"Ahmadiyya Movement: British- Jewish Connections" (اردو ترجمہ،

”تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ“) جیسی معرکہ آرا کتابیں لکھ چکے ہیں۔ وہ قادیانی

تحریک پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کی قادیانی مآخذ تک براہ راست رسائی ہے۔ اس کے علاوہ وہ

اقبالیات کے بھی ایک سنجیدہ طالب علم ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے مسئلہ اقبال اور قادیانیت کا

نئے زاویوں سے جائزہ لیا ہے اور اقبال پر قادیانیوں کے اعتراضات کے مسکت جوابات دیئے

ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب سے اقبال شناسی کی ایک نئی جہت متعین ہوگی۔

راولپنڈی

13 جولائی 2005ء

تعارف

ڈاکٹر ظفر اللہ بیگ

جناب بشیر احمد سے میری طویل عرصے سے شناسائی ہے۔ ان کو اچھوتے موضوعات پر تحقیق کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کی تالیفات، بہایت۔ اسرائیل کی خفیہ سیاسی تنظیم، احمدیہ موومنٹ: برٹش۔ جیوش کنکشنز، فری میسنری اور بائبل کا تحقیقی جائزہ منظر عام پر آچکی ہیں جن کی اہل علم نے پذیرائی کی ہے۔

راقم اسے اپنی عزت افزائی سمجھتا ہے کہ جناب بشیر احمد نے اپنی ہر کتاب کی تالیف و تدوین کے دوران اس سے تبادلہ خیالات کیا۔ راقم نے خصوصاً ”بہایت“، ”احمدیہ موومنٹ“ اور ”بائبل کا تحقیقی جائزہ“ کے مسودات کا مطالعہ کیا اور ان پر اپنی آراء دیں۔ بعض حصوں کو از سر نو مرتب کرنے اور کچھ ابواب کا جدید تحقیقات کی روشنی میں جائزہ لینے کا مشورہ دیا۔ جناب بشیر احمد نے میری اکثر آراء اور تجاویز سے اتفاق کیا اور ان کی روشنی میں اپنے مسودات میں اہم اور بنیادی تبدیلیاں کیں۔ میرے بے لاگ تبصروں اور تجاویز پر انہوں نے کبھی ناراضی کا اظہار نہیں کیا بلکہ میرا شکریہ ادا کر کے میری قدر افزائی کی۔

زیر نظر تصنیف اقبال اور قادیانیت کے سلسلے میں راقم نے جناب بشیر احمد کو اپنی ذاتی لائبریری سے قادیانیت پر نہایت اہم کتب، رسائل اور جرائد کے علاوہ مختلف جگہوں سے ”الفضل“ قادیان، ”پیغام صلح“ لاہور، ”الامت“ لاہور اور ”ریویو آف ریلی جنز“ قادیان وغیرہ کے 1935ء اور دیگر سالوں کے بعض اہم فائل مہیا کئے تاکہ اس عہد میں علامہ اقبال کے بیانات پر قادیانی نقطہ نظر کی تفہیم میں مدد ملے۔ انہوں نے اس مواد کی روشنی میں کتاب کے آخری ابواب مدون کئے۔

جناب بشیر احمد کی زیر نظر علمی کاوش اقبال اور قادیانیت کے موضوع پر بعض نئے گوشوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ ان کے انداز تحقیق اور منظر۔ دطرز استدلال نے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ البتہ راقم اقبال شناسوں کی توجہ بعض سوالات کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہے جو اس

تصنیف میں اٹھائے گئے ہیں:

۱- قادیانی علامہ اقبال سے ایک نظم منسوب کرتے ہیں جو انہوں نے مبینہ طور پر 1883ء میں سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف لکھی جب وہ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں زیر تعلیم تھے۔ یہ نظم اس زمانے میں کس اخبار یا رسالے میں پہلی دفعہ شائع ہوئی۔

۲- علامہ اقبال نے 1900ء میں عبدالکریم جیلی کے نظریہ انسان کامل پر ایک مقالہ لکھا جسے جون 1959ء میں پہلی دفعہ جماعت احمدیہ لاہور کے ہفت روزہ ”لائٹ“ نے شائع کیا۔ اس کے بعد یہ 21 اپریل 1960ء کو روزنامہ ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ لاہور میں چھپا۔ اقبال شناس اس کی تاریخ اشاعت پر روشنی ڈالیں۔ کیا برٹش میوزیم آرکائیوز میں یہ مقالہ موجود ہے؟ ممتاز ماہر اقبالیات ڈاکٹر سلیم اختر اس کا انکار کرتے ہیں جبکہ ہفت روزہ ”لائٹ“ کا دعویٰ ہے کہ اس نے وہاں سے حاصل کر کے اسے شائع کیا۔

۳- رسالہ لمعات مطبوعہ 1916ء کے ایک مضمون میں علامہ اقبال نے ختم نبوت کے بارے میں اپنے عقیدے کا اظہار کیا۔ اس مضمون کے اقتباس کو پروفیسر الیاس برنی نے اپنی کتاب قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ میں روزنامہ الفضل کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ لمعات کے اس شمارے کو تلاش کیا جانا چاہیے جس میں یہ مضمون شائع ہوا تھا۔

۴- علامہ اقبال اور حکیم نور الدین کے درمیان بعض فقہی اور دیگر امور پر خط و کتابت ہوئی۔ قادیانیوں نے ان خطوط کے متن کو شائع نہیں کیا۔ ان خطوط کے متن کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

۵- گورداسپور اور لاہور میں احمدیہ جماعت کے وفود نے 1928ء میں سائنس کمیشن کو الگ الگ میمورنڈم پیش کئے۔ قادیانی مؤرخ دوست محمد شاہد کا دعویٰ ہے کہ ان پر پانچ لاکھ افراد نے دستخط کئے۔ ان یادداشتوں کی تاریخی

اہمیت کے پیش نظر انہیں شائع ہونا چاہیئے۔

۶۔ کشمیر کمیٹی کے قیام سے قبل علامہ اقبال نے خلیفہ قادیان مرزا محمود احمد کے خط کے جواب میں 5 ستمبر 1930ء کو جو خط ارسال کیا تھا قادیانی لٹریچر میں اس کی مفید مطلب دو سطر میں شائع کی جاتی ہیں۔ قادیانی جماعت کو چاہیئے کہ یہ پورا خط شائع کرے۔

علامہ اقبال کا عقیدہ ختم نبوت پر کامل ایمان تھا۔ انہوں نے کبھی مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت نہ کی، نہ وہ قادیانیوں کے بارے میں کوئی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ البتہ ابتداء میں انہوں نے ان کی تکفیر سے احتراز کیا کیونکہ وہ مذہبی مباحث، تکفیر اور باہمی منافرت کو ہوا دینے کے خلاف تھے۔ علامہ اقبال کو کشمیر کمیٹی کے زمانے میں قادیانیوں کے مذہبی عقائد، ان کے سیاسی افکار اور حقیقی کردار کو پوری طرح سمجھنے کا موقع ملا اور اس عملی مشاہدے کے بعد انہوں نے مئی 1935ء میں ان کے بارے میں اپنا پہلا بیان جاری کیا۔

جناب بشیر احمد نے قادیانیوں اور سیکولر عناصر کے ان اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے کہ علامہ اقبال سر ظفر اللہ کے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بننے پر احساس محرومی کا شکار ہوئے اور اس احساس محرومی کے نتیجے میں انہوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ جماعت تسلیم کرے۔ مصنف نے علامہ اقبال کے فکری ارتقاء کو قادیانیت کی تاریخ کے تناظر میں بہت عمدگی سے پیش کیا ہے اور قادیانیوں کی اقبال دشمنی کا بھرپور محاسبہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اقبالیات میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

پروفیسر ڈاکٹر ظفر اللہ بیگ

اسلام آباد

صدر شعبہ تاریخ و مطالعہ پاکستان

31 جولائی 2005ء

کلیۃ اصول الدین

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی

اسلام آباد

عرض مصنف

بشیر احمد

1991-92ء میں جب میں اپنی انگریزی کتاب ”احمدیہ مومنت“: برٹش - جیوش کنکشنز (مطبوعہ 1994ء) مرتب کر رہا تھا تو میں نے اقبال اور قادیانیت پر کچھ اہم مواد اکٹھا کیا تھا اور مختصر طور پر کتاب میں اس پر بحث کی تھی۔ دوسری کتابوں کی تالیف میں مصروفیت کے سبب میں اس کو مرتب کر کے شائع نہ کر سکا۔ گذشتہ برسوں میں ایک قادیانی اہل قلم شیخ عبدالماجد کی دو کتابیں، اقبال اور احمدیت (زندہ رود پر تبصرہ) اور فکر اقبال اور تحریک احمدیہ منظر عام پر آئیں۔ اس سے قبل علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد اسی موضوع پر ایک کتاب مظلوم اقبال لکھ چکے تھے۔ میں نے یہ کتاب ان کتابوں کے جواب کے طور پر نہیں لکھی ہے کیونکہ شیخ عبدالماجد کی کتابوں میں خاصا رطب و یابس اور قادیانیت کا پروپیگنڈہ ہے اور شیخ اعجاز احمد کی کتاب قیاسات اور اصل مسئلہ سے اعراض پر مبنی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ قادیانی مرزا غلام احمد کو ایسا نبی مانتے ہیں جس کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اسی بنیاد پر علامہ اقبال نے ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ راقم نے اس کتاب میں علامہ اقبال پر قادیانیوں کے عمومی اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ امید ہے کہ اقبال شناس اس سلسلے میں مزید تحقیقی کام کریں گے۔

یہاں یہ ذکر کرنا ہے جانے ہوگا کہ پاکستان میں اب تک قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے بیان پر پنڈت نہرو کے مضامین شائع نہیں ہوئے۔ اس کتاب میں نہ صرف ان مضامین کا انگریزی متن دیا گیا ہے بلکہ ان کی تلخیص اور ترجمہ پیش کر دیا ہے تاکہ پنڈت جی کا نقطہ نظر بھی قارئین کے سامنے آجائے۔

محترم ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے اپنے مقدمے میں اس کتاب پر جن گرائفڈ خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے میں انکا انتہائی ممنون ہوں۔

مکرم ڈاکٹر ظفر اللہ بیگ صاحب نے حسب سابق اس کتاب کی تصنیف میں بھی بہت مدد کی۔ انہوں نے روزنامہ الفضل قادیان کے پرانے شمارے اور قادیانیوں کی بعض کتابیں مہیا کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے نہایت مفید مشورے دیئے جن کی روشنی میں راقم نے بعض مقامات پر نظر ثانی کی۔ میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوں۔

اس کتاب کی تصنیف و اشاعت کا سارا کریڈٹ صدیقی العزیز شکیل عثمانی صاحب کو جاتا ہے۔ ان ہی کی تحریک پر اس کا مسودہ تیار کیا گیا اور انہوں نے اس کی ترتیب و تدوین نیز بعض حواشی لکھنے میں از حد محنت کی اور متن میں اہم اضافے کئے جس کے لیے میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جناب مسعود اختر اور جناب محمود اختر نے کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت میں پر خلوص تعاون کیا، اس کے لئے میں ان کا انتہائی مشکور ہوں۔

راولپنڈی

3 جولائی 2006ء

فہرست مندرجات

v	ڈاکٹر سفیر اختر	تقدیم
ix	تھکیل عثمانی	دیباچہ
xxv	ڈاکٹر ظفر اللہ بیگ	تعارف
xxix	بشیر احمد	عرض مصنف

باب - 1 خاندان اقبال اور قادیانیت

1	مرزا غلام احمد قادیانی کا تعارف
3	مرزا صاحب کے دعاوی
5	مرزا صاحب سے شیخ نور محمد کی مبینہ بیعت
9	مبینہ بیعت کی روایات میں تضاد
10	شیخ عطا محمد اور احمدیت
13	علامہ اقبال پر احمدی بنونے کا الزام
17	علامہ اقبال سے منسوب ایک نظم
20	حوالے و حواشی

22	باب - 2 بانی قادیانیت کے متعلق علامہ اقبال کی ابتدائی تحریر
27	1902ء میں علامہ اقبال کا ختم نبوت کے متعلق عقیدہ
28	علامہ اقبال کو بیعت کی دعوت (مئی 1902ء)
30	علامہ اقبال کی 1903ء کی نظم
31	علامہ اقبال کی مرزا غلام احمد قادیانی سے ملاقات (1904ء)
34	حوالے و حواشی

- 37 باب - 3 علامہ اقبال پر انگریز نوازی کا الزام
- 38 ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر علامہ اقبال کی نظم 1901ء
- 41 علامہ اقبال کی دیگر نظمیں اور تقاریر
- 44 قادیانی ایڈریس
- 45 علامہ اقبال کی نظم پنجاب کا جواب
- 46 علامہ اقبال کو سر کا خطاب 1923ء
- 47 شہنشاہِ برطانیہ کی سلور جوبلی فنڈ میں چندہ
- 48 بانیِ کورٹ کی جٹی (1925ء) اور علامہ اقبال
- 51 حوالے و حواشی
- 53 باب - 4 علامہ اقبال کے حکیم نور الدین اور جماعت احمدیہ لاہور سے تعلقات
- 53 حکیم نور الدین کا تعارف
- 56 علامہ اقبال کے حکیم نور الدین سے فقہی سوالات
- 57 حکیم نور الدین کے جوابات
- 60 عربی ادبِ عالیہ کے بارے میں حکیم نور الدین سے علامہ اقبال کا استصواب
- 61 ذاتی شرعی مسئلے میں حکیم نور الدین سے علامہ اقبال کا رابطہ
- 61 علامہ اقبال کے خط پر حکیم نور الدین کا غلط عربی میں القاء
- 62 علامہ اقبال کے قادیانی لڑکی سے نکاح کی غلط خبر 1910ء
- 63 علامہ اقبال کی عمومی خدمات کا اعتراف 1911ء
- 64 آفتاب اقبال کا قادیان کے سکول میں داخلہ 1911ء
- 66 حکیم نور الدین کے عقائد اور اعتدال پسندانہ روش
- 68 خواجہ کمال الدین کے لیکچر

71	دو کنگ مشن
72	قادیانی فرقہ: ”اسلامی سیرت کا ٹھیکہ نمونہ“ 1910ء
76	علامہ اقبال کی لاہوری جماعت کے ایک جلسے میں شرکت 1913ء
77	جماعت احمدیہ کے اختلاف میں علامہ اقبال کو ملوث کرنے کی کوشش
80	رموز بے خودی
81	حوالے و حواشی
86	باب - 5 علامہ اقبال عملی سیاست میں
87	فرقہ وارانہ مسئلہ
87	سائنس کمیشن
88	سائنس کمیشن اور جماعت احمدیہ کے تجویز کردہ مطالبات
89	شفیع لیگ کے مطالبات اور علامہ اقبال
92	قادیانیوں کی جانب سے مسلم مطالبات کی تائید کی وجوہات
94	نہرو رپورٹ پر تبصرہ 1928ء
94	مرزا محمود احمد کی نام نہاد ’خود مختار مسلم ریاست‘ کی تجویز
103	تاریخی حقائق مسخ کرنے کی ایک اور کوشش 1932ء
104	سر ظفر اللہ اور مسلم لیگ کی صدارت
109	کشمیر کمیٹی اور علامہ اقبال
111	کشمیر کمیٹی
122	شیخ عبداللہ، پنڈت نہرو اور کانگریس
124	نتائج
126	حوالے و حواشی

- باب - 6 علامہ اقبال نے 1933ء میں قادیانیت کے خلاف مضامین کیوں نہ لکھے؟ 131
- علامہ اقبال کا تصنیفی منصوبہ 131
- اسلام میں مذہبی تحریکیں 132
- تحریک احرار 133
- قادیانیوں کی سیاسی پالیسی 134
- آل انڈیا نیشنل لیگ 136
- مولانا ظفر علی خاں اور زمیندار 136
- قادیانیت کے خلاف کتابیں اور مضامین 137
- سید حبیب کی 'تحریک قادیان' 1933ء 138
- مرزا ظفر علی کے مضامین 1934-35ء 138
- کے۔ ایل۔ گابا کا مطالبہ 1935ء 138
- مقدمہ بہاولپور کا فیصلہ 1935ء 138
- پروفیسر الیاس برنی کی 'قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ' 138
- 'ہنرہولی نس' 139
- علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف مضامین کیوں لکھے؟۔ فوری محرکات 141
- احرار۔ قادیانی نزاع 142
- قادیانی مبلغ کا خیال 143
- ریویو آف ریلی جنز کا تبصرہ 144
- سر ظفر اللہ کا موقف 144
- ڈاکٹر جاوید اقبال کا تجزیہ 146
- حوالے و حواشی 148

باب- 7 کیا علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف اس لیے مضامین لکھے

- 150 کہ وہ وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر نہ بن سکے؟
152 کیا علامہ اقبال وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بننے کے خواہشمند تھے؟
155 سر ظفر اللہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر کیسے بنے؟
158 سر ظفر اللہ کا وائسرائے کی کونسل میں مستقل تقرر
164 حوالے و حواشی

باب- 8 قادیانیت کے حقیقی خدو خال

- 166 علامہ اقبال کے بیان کے اہم نکات
167 حقائق پر مبنی دلائل
171 علامہ اقبال کے بیان پر اعتراضات
173 ایک پارسی کا مراسلہ
176 علامہ اقبال کے بیان پر مسلم پریس کا رد عمل
176 اخبار 'سیاست' کا تبصرہ
180 روزنامہ حق لکھنؤ کا ادارہ
183 علامہ اقبال کے بیان پر قادیانی رد عمل
184 قادیانیت کی مخالفت کا تدریجی ارتقا
185 علامہ اقبال کے بیان پر جماعت قادیان اور جماعت لاہور کی تنقید
186 مرزا محمود احمد کا خطبہ 24 مئی 1935ء
187 مرزا محمود احمد کا مضمون 8 جولائی 1935ء
189 امیر جماعت احمدیہ لاہور کا جواب 1935ء

- 193 توضیحی نوٹ (الف) ختم نبوت
- 196 توضیحی نوٹ (ب) سکھوں کی علیحدہ حیثیت اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ
- 199 حوالے و حواشی
- باب - 9 علامہ اقبال کے بیان پر قادیانی جرائد کے تبصرے اور پنڈت نہرو کے خطوط 206
- 206 الفضل کا ادارہ
- 208 ریویو آف ریلی جنز قادیان کا تبصرہ جون 1935ء
- 209 پنڈت نہرو کے خطوط - پہلا خط 'اسلامی یک جہتی'
- 212 پنڈت نہرو کا دوسرا خط، 'ہربائی نس آغا خان'
- 216 پنڈت نہرو کا تیسرا خط، 'تمام مذاہب کے راسخ الاعتقاد پیروکارو متحد ہو جاؤ'
- 217 علامہ اقبال کا بنیادی نقطہ نظر
- 219 پنڈت نہرو نے قادیانیت کی حمایت میں خطوط کیوں لکھے؟
- 223 عبدالمجید سالک کا نقطہ نظر
- 224 علامہ اقبال کے مضمون پر ریویو آف ریلی جنز کا تبصرہ (مارچ 1936ء)
- 229 علامہ اقبال کے مضمون کے خلاف قادیانیوں کا شرانگیز پروپیگنڈا
- 231 علامہ اقبال کے مضامین پر اہل علم کی آراء
- 231 ملک محمد جعفر خان
- 232 عبدالمجید سالک
- 232 مرحوم مولانا عبدالقدوس ہاشمی
- 233 میاں محمد شفیع (م۔ش)
- 234 انجمن حمایت اسلام سے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کا اخراج
- 236 اقبال دشمنی کے دیگر انداز

240	حوالے و حواشی
242	باب - 10 علامہ اقبال کے آخری دو سال
242	نیشنل لیگ کا قیام
243	پنجاب مسلم لیگ کے خلاف قادیانی پروپیگنڈا
246	مرزا محمود احمد کی سودے بازی
248	اقبال اور مولانا ظفر علی خاں
249	کانگریس میں شمولیت کے لئے قادیانیوں کی تلگ و دو
253	حوالے و حواشی
256	باب - 11 سر ظفر اللہ کی آئینی سکیم (1940ء)
256	سر ظفر اللہ کی سکیم اور ولی خان
258	سر ظفر اللہ کی سکیم سے پہلے زیر غور سکیمیں
260	سر ظفر اللہ کی سکیموں کا خلاصہ
260	علیحدگی کی سکیم
261	سر ظفر اللہ کی سکیم کا قرارداد لاہور سے موازنہ
262	سر ظفر اللہ کی متبادل سکیم
263	سر ظفر اللہ کی سکیم کے قابل اعتراض پہلو
266	حوالے و حواشی
268	باب - 12 قادیانی سٹیٹ کا خواب
273	حوالے و حواشی
274	منتخب کتابیات
281-283	Select Bibliography.

خاندانِ اقبال اور قادیانیت

مئی 1935ء کے بعد سے قادیانی خاندانِ اقبال پر جو الزامات لگاتے چلے آ رہے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ محمد اقبال کے والد گرامی احمدی تھے، ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد احمدی تھے اور ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد احمدی ہیں۔ (واضح رہے کہ شیخ اعجاز احمد چند سال قبل فوت ہو گئے۔ مصنف) ان کا ایک اور الزام یہ ہے کہ خود اقبال ابتداء میں اپنے آپ کو احمدیہ جماعت میں شمار کرتے تھے۔

آئیے ہم ان الزامات کا جائزہ لیں۔

شیخ محمد اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نرانی شیخ نور محمد ٹوپیوں کی سلائی کا کام کرتے تھے۔ سیالکوٹ پنجاب کا اہم علاقہ تھا۔ یہ سکاچ مشن کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ شیخ نور محمد 1837ء میں سیالکوٹ کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سکھوں کا آخری دور اور انگریزوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ شیخ تھوٹو پیاں والے کے نام سے مشہور تھے اور نہایت نیک سیرت اور صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کے ملنے والوں میں مرزا غلام احمد قادیانی بھی شامل تھے جو اس وقت (1864-1868) سیالکوٹ کچہری میں اہل مد تھے اور ان دنوں ان کو کوئی خصوصی اہمیت حاصل نہ تھی۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا تعارف

مرزا غلام احمد قادیان تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور کے مغل خاندان کے ایک جاگیردار مرزا غلام مرتضیٰ کے فرزند تھے۔ مرزا غلام مرتضیٰ نے پہلے سکھ فوج میں ملازمت اختیار کی اور ہزارہ اور شمالی ہند میں سکھوں کے خلاف مسلمانوں کی بغاوتوں کو کچلنے میں ان کی مدد کی۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت کے خاتمے (1849) کے بعد وہ فوراً انگریزوں سے مل گئے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں انہوں

نے پچاس گھوڑے مع سوار بہم پہنچا کر انگریزی حکومت کی مدد کی (1) ان کے بیٹے مرزا غلام قادر نے دہلی میں حریت پسندوں کو قتل کیا اور جنرل نکلسن سے پروانہ خوشنودی حاصل کیا (2) قادیان کے اس مغل خاندان کی انگریز کے لیے خدمات کا تفصیلی ذکر سر لپیل گرن کی کتاب پنجاب چیفس میں موجود ہے۔ انگریز نے ان کی خدمات کے صلے میں اس خاندان کو نوازنے کے وعدے کئے اور خوشنودی کے خطوط لکھے جن کے عکس مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کئی تصانیف میں دیئے ہیں۔ (3)

مرزا غلام احمد 13 فروری 1835 کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ 1864ء میں مرزا غلام مرتضیٰ نے انگریزوں سے درخواست کر کے ان کو سیالکوٹ کچہری میں ملازم کر دیا جہاں وہ اہل مد متفرق کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس زمانے میں ان کا شیخ نور محمد سے تعارف ہوا۔

مرزا صاحب پہلے محلہ کشمیریاں میں عمر اکشمیری کے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے۔ بعد میں سیالکوٹ کی جامع مسجد کے سامنے ایک بیٹھک میں حکیم منصب علی وثیقہ نویس کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کے دوستوں میں مولوی محبوب عالم اور لالہ بہیم سین وکیل شامل تھے۔ ان کے سکاچ مشن کے پادری بٹلر سے قریبی تعلقات تھے جن کے ساتھ وہ عیسائیت پر بحثیں کرتے تھے۔ جب وہ ولایت واپس جانے لگا تو خاص طور پر مرزا صاحب سے ملنے کچہری گیا (4) 1868ء میں مرزا صاحب نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور قادیان واپس جانے لگے تو سیالکوٹ کچہری کے ڈپٹی کمشنر ایچ ای پرکنس (H.E. Perkins) نے ”آپ کی مشایعت کے اعزاز میں کچہری میں عام تعطیل کر دی کہ ایسا پاکباز شخص ان کے عملے سے جا رہا ہے“۔ (5) کچہری میں کلرکوں کی آمد، استعفیٰ اور ریٹائرمنٹ ایک معمول ہوتا ہے، نہ جانے ڈی سی صاحب نے مرزا صاحب کو اتنا اعزاز کیوں بخشا اور انہیں کونسا مشن سونپ کر سیالکوٹ سے روانہ کیا؟ سیالکوٹ کی دیگر اہم شخصیات سے بھی مرزا صاحب کے تعلقات تھے جن میں اقبال کے استاد سید میر حسن، حکیم حسام الدین، میر حامد علی، مولانا غلام حسن، مولوی عبدالکریم وغیرہ شامل تھے۔ (6) ان میں سے اکثر لوگ بعد میں احمدی ہو گئے۔

1868ء کے بعد مرزا صاحب قادیان میں سکونت پذیر رہے۔ 1876ء میں ان کے والد مرزا غلام مرتضیٰ انتقال کر گئے اور قادیان کی جاگیر پر ان کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر کا تصرف ہو گیا۔ یہ زمانہ مرزا صاحب نے نہایت تنگ دستی اور مالی پریشانیوں میں گزارا۔ وہ 1877ء میں ایک بار سیالکوٹ ایک مقدمے کے سلسلے میں گئے اور اپنے پرانے احباب سے ملے۔

مرزا صاحب کے دعاوی

1880ء میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب براہین احمدیہ کے پہلے دو حصے شائع کیے، تیسرا حصہ 1882ء میں اور چوتھا 1884ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی وحی، الہامات اور کشف و روایہ درج کئے اور آریوں اور عیسائیوں کو الہی نشان دکھانے کے دعوے کیے۔ انہوں نے اس مواد کو بعد میں اپنے دعاوی کے ثبوت کے لئے ڈھال بنایا جو اس زمانے میں انہوں نے اسلام کی تائید کے لیے پیش کئے تھے۔ 1884ء میں انہوں نے میر ناصر نواب کی صاحبزادی محترمہ نصرت جہاں صاحبہ سے دوسری شادی کی۔

مرزا صاحب نے 1885ء میں مجددیت کا دعویٰ کیا۔ 1886ء میں ہوشیار پور میں چلہ کا نا اور 20 فروری کو ایک آنے والے مصلح موعود کا اعلان کیا (7) 1888ء میں انہوں نے اعلان کیا کہ خدا نے انہیں بیعت لینے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے 23 مارچ 1889ء کو لدھیانہ میں باقاعدہ بیعت لینے کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے حکیم نور الدین نے بیعت کی۔

1890ء کے آخر میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ مسیح تاحصری وفات پا گئے ہیں اور وہ ہی آنے والے مسیح موعود ہیں۔ 1891ء میں دور رسائل توضیح مرام اور فتح اسلام تصنیف کئے جن میں دعویٰ کیا کہ وہ مقام محدثیت پر فائز ہیں۔ اس کو انہوں نے جزوی نبوت کہا اور دعویٰ کیا کہ انہیں خدا سے مکالمے اور مخاطبے کا شرف حاصل ہے۔ 1885ء تک عام مسلمان مرزا صاحب کے اصلاح خلق کے لئے مامور ہونے اور مجددیت کے دعوؤں کے باوجود ان کے غیر مسلموں سے مناظرے کرنے کی وجہ سے ان کا احترام کرتے تھے لیکن وفات مسیح کے اعلان، مسیح موعود اور ظلی و جزوی نبوت

(محدثیت) کے دعوؤں کے بعد ان کی سخت مخالفت شروع ہو گئی اور ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ مخالفت کی ایک وجہ ان کی انگریزی حکومت کی حمایت اور جہاد کی مخالفت میں تحریریں بھی تھیں۔ 1891ء میں انہوں نے اپنی کتاب ازالہ اوہام میں اپنے سابقہ دعاوی کی وضاحت کی۔

مرزا صاحب نے 1901ء میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ انہوں نے خود کو لغوی معنی میں نبی نہیں کہا بلکہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی جس میں انہیں رسول اور نبی کہا گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

”چند روز ہوئے ایک صاحب پر ایک مخالف کی طرف سے یہ اعتراض پیش ہوا کہ جس سے تم نے بیعت کی ہے وہ نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کا جواب محض انکار کے الفاظ سے دیا گیا، حالانکہ ایسا جواب صحیح نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوتی ہے اس میں ایسے الفاظ رسول اور مرسل اور نبی کے موجود ہیں، نہ ایک دفعہ بلکہ صد بار دفعہ پھر کیوں کر یہ جواب صحیح ہو سکتا ہے“

(ایک غلطی کا ازالہ، ص 1)

مرزا صاحب نے اپنے آخری خط میں جو ٹھیک ان کے انتقال کے دن اخبار عام لاہور میں شائع ہوا واضح الفاظ میں لکھا:

”میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں اور اگر میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہوگا اور جس حالت میں خدا میرا نام نبی رکھتا ہے تو کیوں کر انکار کر سکتا ہوں؟ میں اس پر قائم ہوں اس وقت تک کہ اس دنیا سے گذر جاؤں“

(اخبار عام، 26 مئی 1908ء منقول از حقیقت النبوة از مرزا محمود احمد، ص 271)

واضح رہے کہ یہ خط 23 مئی 1908ء کو لکھا گیا اور 26 مئی کو اخبار عام میں شائع ہوا اور

ٹھیک اسی دن مرزا صاحب کا انتقال ہو گیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ بھی کہا کہ جو انکے دعوے کو نہ مانے کافر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”خدا تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا کہ ہر وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔“

(تذکرہ مجموعہ الہامات، ص 600)

سیالکوٹ میں جو لوگ مرزا صاحب کے دعاوی پر ایمان لائے ان میں میر حامد سیالکوٹی، مولوی فیض الدین، مولوی عبدالکریم، غلام محمد، حکیم حسام الدین اور (ڈاکٹر) بشارت احمد زیادہ مشہور تھے۔ اقبال کے استاد میر حسن نے مرزا صاحب کے دعاوی کو نہ مانا البتہ وہ ان کی اور حکیم نور الدین کی عزت کرتے تھے۔ مرزا صاحب قیام سیالکوٹ کے دوران عیسائیوں کے ساتھ مناظروں میں میر حسن کو حکم بناتے تھے (8)

مرزا صاحب سے شیخ نور محمد کی مبینہ بیعت

مئی 1935 میں جب علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف مضامین لکھے تو ان مضامین کے شائع ہوتے ہی قادیان کی سرکاری نمکسال میں ان کے اور ان کے خاندان کے بعض افراد کے احمدی ہونے کے بارے میں روایات ڈھلنے لگیں۔ شاید سب سے پہلے مرزا محمود احمد نے 24 مئی 1935 کو علامہ اقبال کے خلاف جو خطبہ دیا اس میں یہ الزام لگایا کہ سر محمد اقبال کے والد احمدی تھے، ان کے بڑے بھائی شیخ عطاء محمد احمدی ہیں اور ان کا بھتیجا شیخ اعجاز احمد سب نج احمدی ہے۔ (9) شیخ نور محمد 1930ء میں وفات پا چکے تھے اور ان کے قریبی دوست سید میر حسن 1929ء میں انتقال کر گئے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس الزام کا خود جواب دیتے۔

اس کے چار سال بعد 1939ء میں ہمیں ’سیرت المہدی‘ میں ایک روایت ملتی ہے کہ شیخ نور محمد احمد یہ جماعت میں شامل ہوئے لیکن بعد میں اقبال کے کہنے پر جماعت سے الگ ہو گئے۔ مرزا غلام احمد کے فرزند مرزا بشیر احمد (والد گرامی ایم ایم احمد) نے مرزا صاحب کے پیروکاروں (قادیانی اصطلاح میں صحابہ اور تابعین) کی روایات کو سیرت المہدی کے نام سے تین جلدوں میں جمع کیا۔ اس کی پہلی جلد 1923ء میں دوسری 1927ء میں اور تیسری 1939ء میں چھپی۔ انہوں نے یہ

روایات ہمارے حدیث کے مجموعوں کی طرز پر جمع کی ہیں یہ سلسلہ احمدیہ کی تاریخ اور مرزا صاحب کی شخصیت کے بارے میں معلومات کا اہم ذریعہ ہیں۔ مرزا بشیر احمد جن کو قمر الانبیا (نبیوں کا چاند) کہا جاتا ہے نے مرزا صاحب کی نبوت، مسلمانوں کو کافر قرار دینے اور ان سے معاشرتی تعلقات منقطع کرنے جیسے قادیانی معتقدات کو مرزا صاحب کے احکام اور ان کی وحی کی روشنی میں پیش کیا۔ ان عقائد کو تقویت دینے کے لئے انہوں نے یہ روایات جمع کیں۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ مرزا صاحب کی ذات کو اسوہ حسنہ قرار دیا جائے۔

سیرت المہدی کی روایت میں کہا گیا ہے کہ شیخ نور محمد نے میر حامد شاہ اور مولوی عبدالکریم کی تحریک پر 1891ء یا 1892ء میں مرزا صاحب کی بیعت کی لیکن چند سال بعد جب اقبال کالج میں پہنچے (1893ء۔ 1895ء) تو انہوں نے انہیں سمجھا بھگا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ پوری روایت درج ذیل ہے۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم:- منشی محمد اسماعیل صاحب سیالکوٹی نے مجھ سے بیان کیا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا جن کو عام لوگ شیخ تھو کہہ کر پکارتے تھے۔ شیخ نور محمد صاحب نے غالباً 1891ء یا 1892ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبال سکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا اس لئے ان دنوں میں انہوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور

انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بھجا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ سیالکوٹ کی جماعت چونکہ نوجوانوں کی جماعت ہے اور میں بوڑھا آدمی ان کے ساتھ چل نہیں سکتا لہذا آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میرا حادشاہ صاحب مرحوم کے نام گیا جس میں لکھا تھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیویں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں۔ اس کے بعد شیخ نور محمد صاحب نے بعض اوقات چندہ وغیرہ دینے کی کوشش کی لیکن ہم نے قبول نہ کیا۔

خاکسار عرض کرتا ہے کہ مجھ سے میاں مصباح الدین صاحب نے بیان کیا کہ ان سے کچھ عرصہ ہوا ڈاکٹر بشارت احمد صاحب نے بیان کیا تھا کہ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام 1891ء یا 1892ء میں سیالکوٹ تشریف لے گئے تھے اور آپ نے وہاں ایک تقریر فرمائی تھی جس میں کثرت کے ساتھ لوگ شامل ہوئے تھے اور ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں پر بھی ہجوم ہو گیا تھا تو اس وقت ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی وہاں موجود تھے اور کہہ رہے تھے کہ دیکھو شمع پر کس طرح پروانے گر رہے ہیں۔

نیز خاکسار عرض کرتا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بعد میں سلسلہ سے نہ صرف منحرف ہو گئے تھے بلکہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں شدید طور پر مخالف رہے ہیں اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈا تھا۔ مگر سر محمد اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب درمیان میں کچھ عرصہ علیحدہ رہنے کے بعد حال ہی میں پھر سلسلہ میں شامل ہو گئے ہیں اور ان کے صاحبزادے

یعنی سر محمد اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب سب جج تو سلسلہ کے نہایت
مخلص نوجوانوں میں سے ہیں۔“ (10)

اس روایت کے مطابق شیخ نور محمد نقو مرحوم نے 1891ء یا 1892ء میں مرزا صاحب کی بیعت کی۔ یہ بیعت کیسے ہوتی تھی؟ اس زمانے میں بعض لوگ خط لکھ کر بیعت کر لیتے تھے۔ بعض خود حاضر ہو کر بیعت کرتے اور بعض کسی احمدی کے ذریعے مرزا صاحب سے بیعت کی تحریری یا زبانی درخواست کرتے۔ مرزا صاحب نے 23 مارچ 1889ء کو لدھیانہ میں باقاعدہ بیعت کا آغاز کیا اور جماعت احمدیہ کی بنیاد رکھی۔ بیعت کنندگان کے نام اور مختصر کوائف ایک رجسٹر میں درج ہوتے تھے۔ (11) ایک بیعت فارم بھی تیار کیا گیا جو نئے احمدی کو پر کرنا ہوتا تھا ان کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ 1891ء یا 1892ء وہ سال ہیں جب علمائے اسلام مرزا صاحب کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ سیالکوٹ میں بھی اہل حدیث علماء ان پر کفر کے فتوے لگا رہے تھے ان حالات میں ہمیں کسی غیر جانبدار ذریعے سے شیخ نور محمد کے احمدی ہونے کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا۔ اس روایت کے مطابق نور محمد مرحوم نے اقبال کے کہنے پر 1893ء سے 1895ء کے درمیانی عرصے میں جب وہ کالج میں پڑھتے تھے ان کو احمدیت سے منحرف کر دیا۔ نور محمد مرحوم نے مرزا صاحب کو ایک خط لکھا کہ سیالکوٹ کی جماعت نوجوانوں کی جماعت ہے اور وہ بوڑھے آدمی ہیں اس لئے ان کے ساتھ چل نہیں سکتے لہذا وہ ان کا نام اس جماعت میں شامل نہ کریں شیخ نور محمد نے مرزا صاحب کو جو خط لکھا اس خط کے جواب میں مرزا صاحب نے میر حامد کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا وہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں اسلام سے بھی الگ ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قادیانیوں نے نہ تو کبھی شیخ نور محمد کے مرزا صاحب کے نام مبینہ خط کا عکس شائع کیا ہے اور نہ ہی مرزا صاحب نے میر حامد کے نام جو خط لکھا تھا اس کا متن یا عکس میر حامد نے شائع کیا تا کہ یہ روایت درست ثابت ہو سکے۔ اور پھر اس زمانے کے سلسلہ احمدیہ کے لٹریچر میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال 5-1893 کے دوران احمدیت کے

خلاف تھے اسی لئے انہوں نے اپنے والد گرامی کو احمدیت سے منحرف کیا۔ مرزا محمود احمد کے 1935ء کے علامہ اقبال کے خلاف دیئے گئے خطبے سے پہلے ہمیں کہیں بھی ایسا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ اقبال کے والد احمدی تھے۔ ان کے مسلمان دوستوں نے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

1892ء میں مرزا صاحب سیالکوٹ آئے تو انہوں نے میر حامد کے والد میر حسام الدین کے مکان پر قیام کیا۔ ان کے مسیح موعود اور محدثیت کے دعوؤں کی وجہ سے ان کی سخت مخالفت کی جا رہی تھی۔ اگر نور محمد احمدی ہوتے تو وہ باقی عقیدت مندوں کی طرح ان سے ملنے ان کی مجلس میں جاتے لیکن ان کی ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مصنف کے دادا بدر دین لہانہ اس زمانے میں سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ ہمارا آبائی مکان بازار کھٹکان میں تھا۔ وہ درزی کا کام کرتے تھے۔ انہوں نے مصنف کو کئی بار بتایا کہ شیخ نور محمد تھو مرحوم نہایت نرم دل اور صوفی منش بزرگ تھے۔ بعض مرزائی ان کی دکان پر آتے جاتے تھے لیکن ان کا مرزائی جماعت سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔

مبینہ بیعت کی روایات میں تضاد

ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی شیخ نور محمد مرحوم کے احمدی ہونے کی تردید کی ہے، لیکن شیخ عطا محمد کے لڑکے شیخ اعجاز احمد (مصنف مظلوم اقبال) کہتے ہیں کہ 1902ء میں ان کی منجھلی پھوپھی طالع بی کا انتقال ہوا تھا۔ سیالکوٹ کی احمدی جماعت ان کے جنازے میں شامل نہ ہوئی۔ اس پر میاں جی (نور محمد) نے میر حامد کے ذریعے مرزا صاحب کو پیغام بھیجا کہ میں عمر رسیدہ ہوں اور آپ کے ساتھ اس قدر تیز نہیں چل سکتا اس لئے وہ پہلے جماعت میں شامل تھے 1902ء میں علیحدہ ہوئے۔ سیرت المہدی کی روایت میں بیعت توڑنے کے لئے خط لکھنے کا ذکر ہے۔ اس میں میر حامد کے ذریعے زبانی پیغام بھجووانے کا کہا گیا ہے۔ سیرت المہدی کی روایت میں بیعت توڑنے کا سن 1895ء کے لگ بھگ بنتا ہے اور اعجاز احمد کی روایت میں 1902ء بتایا گیا ہے۔ اس روایت کا بھی جماعت احمدیہ کے ریکارڈ میں کوئی حوالہ نہیں ہے۔ 1935ء کے بعد گھڑی گئی یہ روایات ناقابل اعتبار ہیں۔ نور محمد مرحوم ہر معاملے میں سید میر حسن سے مشورہ کرتے تھے۔ جب سید میر حسن احمدیت کے خلاف

پڑھنا حرام ہے۔ اس کے خلاف سیالکوٹ سے حضرت مسیح موعود کی اپنی تحریر پیش کی گئی جس کے ماتحت سیالکوٹ کی جماعت حضرت مسیح موعود کی زندگی میں غیر احمدیوں کا جنازہ پڑھتی رہی میاں صاحب نے یہ کہہ کر اسے پس پشت پھینک دیا ہے کہ ایسی تحریر ملی ہے، اس پر بعد میں غور کیا جائے گا مگر فتویٰ میاں صاحب کا چلے گا چنانچہ سال ہا سال گزر گئے ہیں آج تک اس پر غور ہو رہا ہے۔“ (17)

شیخ عطا محمد کے اہل خانہ کا کہنا ہے کہ آخری عمر میں وہ جماعت احمدیہ سے الگ ہو گئے تھے۔ 22 دسمبر 1940 کو انہوں نے وفات پائی۔ امام صاحب کے قبرستان سیالکوٹ میں دفن ہوئے ایک سنی عالم مولوی سکندر خان نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی البتہ ان کے فرزند شیخ اعجاز احمد نے الگ نماز جنازہ پڑھی (18) کیونکہ ان کے نزدیک وہ احمدی تھے اور احمدی غیر احمدی امام کے پیچھے نماز جنازہ نہیں پڑھتے صرف اپنے امام کی اقتداء میں جنازہ پڑھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عطا محمد 1934ء تک احمدی تھے اور مرزا محمود کو خلیفہ مانتے تھے لیکن غیر احمدیوں کا جنازہ پڑھنے کے بارے میں مرزا صاحب کی سیالکوٹ جماعت کو دی گئی ہدایت پر عمل پیرا تھے جیسا کہ اعجاز احمد نے اعتراف کیا ہے کہ ان کا مسئلہ جنازہ پر اختلاف تھا۔ اس سے ایک تو ان کے بیٹے اعجاز احمد کی یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ 1902ء میں شیخ نور محمد جماعت احمدیہ سے اس لئے الگ ہوئے کہ ان کی پھوپھی طالع بی کا احمدیوں نے جنازہ نہ پڑھا۔ سیالکوٹ کے احمدی غیر احمدی کا جنازہ پڑھ لیتے تھے۔ دوسرے شیخ عطا محمد نے احمدی ہونے کے باوجود مرزا محمود سے مسئلہ جنازہ پر اختلاف کے باعث ان کی 1914ء سے 1934ء تک بیعت نہ کی اور 1934ء میں ظفر اللہ کے ایماء پر انہوں نے قادیان بیعت کا خط لکھا۔ اس کے بعد انہوں نے غالباً دوبارہ احمدیت سے رجوع کر لیا تھا، جیسا کہ ان کے اہل خانہ بیان کرتے ہیں (19)

علامہ اقبال پر احمدی ہونے کا الزام

علامہ اقبال نے 1935ء میں قادیانیت کے خلاف جو باطل شکن مضامین لکھے ان کے جواب میں مرزا محمود نے 24 مئی 1935ء کو جو خطبہ دیا اس میں ان کے والد مرحوم اور بھائی کے احمدی ہونے کا ذکر کیا لیکن ان کو احمدی کہنے کی جسارت نہ کی۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ خود اس کی زدید کر دیتے۔ خواجہ کمال الدین کے فرزند خواجہ نذیر احمد باریٹ لاء لاہور میں وکالت کرتے تھے۔ انہوں نے 1953ء کی تحقیقاتی عدالت میں شہادت دی کہ ان کے دوست غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ علامہ اقبال کے ساتھ 1893ء میں قادیان گئے اور مرزا صاحب کی بیعت کی۔ (اس زمانے میں وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ مصنف) پہلے خواجہ نذیر احمد نے سن بیعت 1893ء یا 1894ء بتایا بعد میں قصوری صاحب نے جو اس وقت زندہ تھے انہیں بتایا کہ یہ سن 1893ء نہیں 1897ء ہے۔ (اس وقت وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کے طالب علم تھے۔ مصنف) اس پر خواجہ صاحب نے عدالتی ریکارڈ میں تصحیح کرائی۔ (20)

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ جرح کے دوران گواہ نے پہلے تو یہ کہا کہ یہ بیعت 1893ء یا 1894ء میں ہوئی پھر کہا کہ 1897ء میں ہوئی تھی بعد ازاں گواہ نے اپنی شہادت کے کسی اور حصے میں بتایا کہ اقبال 1930ء تک مرزا صاحب کو مجدد مانتے رہے۔ (21) گواہ نے پھر کہا کہ اس نے اپنے بیان میں یہ کہیں بھی نہیں کہا کہ اقبال احمدی تھے (22)۔ خواجہ نذیر احمد نے عدالت کے سامنے یہ وضاحت پیش کی کہ پاکستان ٹائمز لاہور بابت 4 نومبر 1953ء میں جو یہ رپورٹنگ ہوئی ہے کہ اقبال 1931ء تک قادیانی تھے، یہ ان کی گواہی کو غلط طور پر پیش کیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ علامہ اقبال قادیانی تھے انہوں نے یہ کہا تھا کہ علامہ اقبال نے بیعت کی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے مبینہ بیعت چاہے زبانی ہو یا تحریری، مرزا صاحب کی بیعت کر لینے کے بعد انہیں قادیانی کہنے میں کیا تامل ہے؟ بہر حال خواجہ صاحب کا بیان تضاد کا نمونہ ہے۔ خواجہ نذیر احمد اس وقت اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین تھے۔ انہوں

نے تحقیقاتی عدالت کو بتایا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی (جو 1931ء میں قائم ہوئی۔ مصنف) کے صدر مرزا بشیر الدین محمود احمد اور علامہ اقبال کمیٹی کے ممبروں میں شامل تھے جب ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے (1933ء۔ مصنف) تو انکے والد (خواجه کمال الدین) اقبال سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر گئے۔ اس ملاقات میں وہ (خواجه نذیر احمد) ان کے ہمراہ تھے۔ ان کے والد صاحب نے علامہ اقبال سے بے تکلفی سے پنجابی زبان میں کہا۔

اوے یار تیری بیعت دا کی ہو یا (ابے یار تمہاری بیعت کا کیا ہوا)

علامہ اقبال نے جواب دیا

اوو یلا ہو رسی اے ویلا ہو رے (وہ وقت اور تھا یہ اور ہے)

یہ واقعہ 1933ء کا ہے (23)

خواجه کمال الدین 29 دسمبر 1932ء کو وفات پا چکے تھے۔ (24) 1933ء میں وہ خواجه نذیر

احمد کے ساتھ علامہ اقبال سے ملنے کیسے گئے؟

شیخ عبدالماجد کے والد شیخ عبدالقادر (سابق سوداگر مل) نے 1966ء میں تاریخ احمدیت لاہور لکھی۔ وہ اس میں بابو غلام محمد (م۔ 1946ء) کی ایک روایت درج کرتے ہیں کہ مارچ 1897ء میں لاہور کے بعض تعلیم یافتہ افراد جن میں مولوی محمد علی، خواجه کمال الدین، ڈاکٹر محمد اقبال، مولوی غلام محی الدین قصوری، چوہدری شہاب الدین، مولوی سعد الدین بی۔ اے ایل ایل بی وغیرہ شامل تھے مرزا صاحب سے ملنے قادیان گئے۔ ملاقات کے بعد مولوی محمد علی، چوہدری شہاب الدین، ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولوی غلام محی الدین قصوری اور خاکسار (بابو غلام محمد) نے ان کی بیعت کر لی۔ بعض اور لوگوں نے بھی بیعت کی تھی مگر ان کے نام انہیں یاد نہیں رہے (25)

بابو غلام محمد قادیانی جن کی گواہی پیش کی گئی ہے راقم کی تحقیق کے مطابق فورمین تھے اور ریلوے میں ملازم تھے۔ ان کی جماعت لاہور کے اکابر سے دوستی رہی لیکن مرزا محمود کے غالی مرید تھے۔ انہوں نے مرزا صاحب کی بیعت کی تھی۔ ایسے غیر معروف غالی قادیانی کی روایت کو کوئی

حیثیت نہیں دی جاسکتی نہ ہی ایسی جعلی روایات بیان کرنے کے قابل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اتنے افراد نے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے مرزا صاحب کی بیعت کی لیکن قادیانی لٹریچر میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اس زمانے میں قادیانی اخبار الحکم امرتسر سے شائع ہوتا تھا، 1897ء میں قادیان سے شائع ہونے لگا۔ اس میں نئے بیعت کرنے والوں کا ذکر ہوتا تھا لیکن اس اہم واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے مرزا صاحب نے اپنی کسی تصنیف میں فخریہ طور پر اتنے تعلیم یافتہ افراد کی ایک وقت میں بیعت کا ذکر کیا ہے نہ ہی ان کے ملفوظات میں اقبال اور دیگر افراد کی بیعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ 1897ء میں جن لوگوں نے مرزا صاحب کی بیعت کی ان میں مولوی محمد علی، مولوی شیر علی، غلام رسول راجیکی اور قاضی ظہور اکمل کے نام ملتے ہیں اور یہ نام سلسلہ احمدیہ کے لٹریچر میں موجود ہیں۔ (26)

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں۔ یہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں بہر حال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلے میں مرزا غلام احمد کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا کسی قسم کا کچھ تعلق رہا تھا (27) یا وہ مرزا صاحب کے کسی بھی دعوے کو مانتے تھے۔

شیخ اعجاز احمد بھی تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کی بیعت کرنے کی بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ (28)

سر ظفر اللہ اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں۔
 ’ڈاکٹر اقبال نے جہاں تک میرا علم ہے بیعت نہیں کی ان کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شاید انہوں نے بیعت کی تھی تاہم ان کے بڑے بھائی نے بیعت کی تھی۔ (29)
 سر ظفر اللہ نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی اقبال کے مرزا صاحب سے بیعت کرنے کا انکار کیا ہے۔ (30)

ڈاکٹر بشارت احمد نے مجدد اعظم کے نام سے تین جلدوں میں مرزا صاحب کی سوانح لکھی ہے۔ وہ مجدد اعظم جلد اول میں جو 1939ء کے آخر میں شائع ہوئی لکھتے ہیں کہ فروری 1892ء میں

مرزا صاحب سیالکوٹ آئے (اس زمانے میں ان کے مسج موعود اور محدثیت کے دعاوی کی وجہ سے ان کی مخالفت زوروں پر تھی۔ مصنف) انہوں نے میر حسام الدین کے مکان پر قیام کیا۔ انہوں نے نماز ظہر کے بعد ایک تقریر کی۔ لوگوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ (ڈاکٹر) اقبال مشہور شاعر اس زمانے (1892ء) میں میرے ہم جماعت تھے (میٹرک میں سکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں زیر تعلیم تھے۔ مصنف) یہ مسجد کی ڈیوڑھی کی چھت پر چڑھے بیٹھے تھے۔ مجھے (بشارت احمد کو) دیکھ کر کہنے لگے دیکھو شیخ پر پروانے گر رہے ہیں۔ ان دنوں انہیں حضرت اقدس (مرزا صاحب) سے بہت ارادت تھی چنانچہ شہر سیالکوٹ کے ایک شاعر نے جو جلوہ تخلص کرتا تھا جب ایک نظم حضرت اقدس کی ہجو میں لکھی تو ڈاکٹر اقبال نے اس کا جواب نظم میں ہی لکھا اور اس میں حضرت اقدس کی بڑی تعریف لکھی۔ (31)

ڈاکٹر بشارت احمد 1891ء میں نویں جماعت کے طالب علم تھے 1892ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ان کے انٹرنس (میٹرک) پاس کرنے کا ذکر نہیں ملتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انٹرنس میں یا تو فیل ہو گئے یا تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے گئے اور کسی اور سکول میں داخلہ لے لیا۔ وہ اسکاچ مشن سکول کنک منڈی سیالکوٹ میں پڑھتے تھے۔ 1904ء میں پنڈی گھیب (انک) میں اسٹنٹ سرجن تھے (32) اپریل 1943 میں وفات پائی۔ وہ لاہور جماعت کے ممتاز رکن تھے اور مولوی محمد علی کے رشتہ دار تھے۔

یہ روایت بھی علامہ اقبال کی زندگی میں شائع نہ ہوئی البتہ 1939ء میں شائع کی گئی۔ میٹرک میں زیر تعلیم بشارت احمد کی اس روایت سے 15 سالہ اقبال احمدی ثابت نہیں ہوتے جو محض میٹرک کے طالب علم تھے۔ خود بشارت احمد نے 1902ء میں مرزا صاحب کی بیعت کی۔ (33)

انہوں نے جس شاعر جلوہ کا ذکر کیا ہے ان کا نام میراں بخش جلوہ تھا اور وہ سیالکوٹ کچہری میں وثیقہ نویس تھے۔ ان کے مجموعہ کلام گلشن نعت، جلوہ حق، تحفہ جلوہ، دیوان جلوہ، نوحہ جات جلوہ وغیرہ میں نہ تو مرزا صاحب کی کوئی ہجو درج ہے اور نہ علامہ اقبال کی کسی جوابی نظم کا ذکر ہے جو انہوں

نے مبینہ طور پر مرزا صاحب کی مدح میں کہی۔ احمدیہ لٹریچر میں بھی ایسی کسی نظم کا سراغ نہیں ملتا۔

علامہ اقبال سے منسوب ایک نظم

نومسلم سعد اللہ لدھیانوی مرزا صاحب کے سخت مخالف تھے مرزا صاحب نے ان کو ہندو زادہ، دین فروش، ملعون، شیطان فطرت وغیرہ کہا ہے اور ان کے خلاف ایک نظم کہی ہے جس کا مصرع اولیٰ ہے۔ اک سنگ دیوانہ لدھیانے میں ہے۔ قادیانی کہتے ہیں کہ اقبال نے 1893ء میں جب وہ سکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں ایف اے کے طالب علم تھے سعد اللہ کے خلاف ایک جھوٹی نظم لکھی جس کا پہلا شعر ہے:

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی

مہتروں میں خوب ہوگی قدر دانی آپ کی (34)

اس جھوٹے آخر میں الراقم شیخ محمد اقبال ایف اے کلاس سکاچ مشن سکول سیالکوٹ لکھا ہے۔ شیخ یعقوب علی قادیانی نے اپنی تصنیف آئینہ حق نما (1912) کے صفحہ 107 پر اس کو درج کیا ہے۔ قادیانیوں کا کہنا ہے کہ یہ شیخ محمد اقبال علامہ اقبال تھے۔ البتہ قادیانیوں نے اعتراف کیا ہے کہ یہ نظم ان کے کسی مجموعہ کلام میں نہیں۔ (35)

قادیانیوں نے علامہ اقبال کی زندگی میں یہ بات بیان نہیں کی۔ شیخ یعقوب علی نے 1912ء میں مرزا صاحب کی صداقت پر مبنی مواد اکٹھا کرتے وقت اس نظم کو اپنی تالیف میں درج کیا ہے۔ لیکن علامہ اقبال سے منسوب نہیں کیا ہے۔ یہ سلسلہ قادیانیوں نے ان کی وفات کے بعد شروع کیا۔ پہلی بات یہ ہے کہ مبینہ نظم 1893ء میں کہاں چھپی جہاں سے شیخ یعقوب علی نے نقل کی۔ اس کا ماخذ قادیانیوں نے کبھی نہیں بتایا تا کہ اس پر تحقیق کی جاسکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے 1893ء میں انٹرنس پاس کر کے سکاچ مشن کالج میں ایف اے کلاس میں داخل لے لیا تھا اس میں ایف اے کلاس سکاچ مشن سکول لکھا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس میں مہتروں، خاکروبوں کا ذکر کیا گیا ہے جو سعد اللہ لدھیانوی سے

خوش ہوں گے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظم نگار کا اشارہ مرزا صاحب کے پادری عبداللہ آہتم سے مناظرہ (جنگ مقدس) اور ان کی موت کی پیش گوئی کی طرف ہے۔ یہ مباحثہ امرتسر میں 22 فروری 1893 سے 5 جون 1893ء تک ہوا جس کے بعد مرزا صاحب نے بذریعہ الہام آہتم کے پندرہ ماہ کے اندر مرنے کی پیشین گوئی کی جو پوری نہ ہو سکی۔

اس نظم کے متن سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ سعد اللہ نے پیش گوئی کے پورا نہ ہونے اور آہتم کے ستمبر 1894ء تک وفات نہ پانے کے بعد مرزا صاحب کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ مرزا صاحب نے واضح طور پر اس پیش گوئی کے جھوٹا ہونے کے باوجود اس کے عظیم الشان طور پر پورے ہونے کا دعویٰ کیا۔ سعد اللہ مرزا صاحب کے سخت خلاف تھا اور اس نے ایک کتاب ”شہاب ثاقب بر مسیح کاذب“ لکھی اور 16 ستمبر 1894ء کو ان کے خلاف ایک نہایت سخت الفاظ میں اشتہار شائع کیا جس کے جواب میں مرزا صاحب نے اپنی کتاب انوار الاسلام کے ایک اشتہار مورخہ 15 اکتوبر 1894ء میں اسے عدواللہ اور ابتر کہا۔ شاید اس زمانے (1894ء) میں یہ نظم لکھنے والے نے مرزا صاحب کی پادری آہتم کے متعلق پیش گوئی کا دفاع کرنے کے لئے سعد اللہ کو برا بھلا کہا اور بتایا کہ اس کے اس طرز عمل سے عیسائیوں، مہتروں اور خاکروہوں میں اس کی عزت افزائی ہوگی کیونکہ وہ آہتم کے پیش گوئی کے مطابق وفات نہ پانے پر خوش ہیں اس نظم کا یہ مصرعہ کہ اشتہار آخر اک آنت ہے شیطان کی 16 ستمبر 1894ء کے اشتہار کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے داخلی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم ستمبر 1894ء کے بعد کی ہے کیا ایسی نظم سکاچ مشن کالج کے کسی جریدے میں شائع ہو سکتی تھی جس کو پریسبیٹیرین چرچ سیالکوٹ چلا رہا تھا اور کیا اس میں عیسائیوں کے لئے ایسے نازیبا الفاظ استعمال کئے جاسکتے تھے؟۔ قادیانی اس نظم کا نہ تو اصل ماخذ اور نہ ہی اس کا درست پس منظر بتاتے ہیں۔

اقبال 1894ء میں سکاچ مشن کالج میں ایف اے کے طالب علم تھے۔ سکول سے میٹرک کر لیا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 1935ء کے بہت بعد قادیانیوں نے یہ جعل سازی کی کہ مبینہ نظم

کے آخر میں کسی اور شخص کے نام کی جگہ شیخ محمد اقبال لکھ دیا، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی اور صاحب ہوں۔ بہر حال علامہ اقبال کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان کے کسی غیر مطبوعہ کلام میں اس کا ذکر ہے۔ یہ نظم اتنی گھٹیا، سوقیانہ اور پھپھسی ہے کہ علامہ اقبال کے ابتدائی کلام سے اس کو نسبت دینا ہی حماقت ہے۔ علامہ کا اسلوب بیان ان کی ابتدائی شاعری سے عیاں ہے جو رنگ تغزل لئے ہوئے ہے۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم کہتے ہیں یہ نظم خود ساختہ ہی نہیں بلکہ پھپھسی ہونے کے علاوہ لغو ہے، اس قسم کے شوشے چھوڑنا مرزائیوں نے اپنا وظیفہ حیات بنا لیا ہے۔ (36)

علامہ اقبال سے منسوب نظم

واہ سعدی دیکھ ل گندہ دہانی آپ کی
 بیت ساری آپ کی بیت الخلاء کو نام نہیں
 بتلیاں جاڑوب کی لیتے وہ خامسے عوض
 ان دنوں کو فصل گل کہے ویاہن بھول گئے
 آپ کے اشعار ہوتی ہیں مگر حق کے بغیر
 گو تیرے راجھوٹے ہیں آپ کے منہ سے سبھی
 ہر طرف سوا آ رہی ہو لیں جو درد کی صدا
 آپ کے بڑھکر عروض نے کوئی دنیا میں نہیں
 خاک کو ہم پاٹ کر یہ بات کہہ دی تو ہیں آج
 جب ادھر کو بھی پڑینگے آپ کو سائن کے مول
 کھاؤ گے فراموشی سے پیلہ ہو جائے گا
 دین اور ایمان کی دم میں واہ مندمہ دیدیا
 آفتاب صدق کی گرمی سے گھبراؤ نہیں
 اشتہار آخر ہی ایک آنت ہے شیطان کی
 وہ مثل ہے طویلے کی بلا بندر کے سر
 خرگھاروں کا موداد صوبن سنی ہوتی ہے مفت
 رائے کے چرنے کی صورت کیوں چلے جاتے ہیں آپ
 نیلے بیلے یوں نہ ہو پھر کیا کرو گے اس گھڑی
 بات رہ جاتی ہے دنیا میں نہیں رہتا ہر وقت
 قوم عیسائی کے بھائی بن گئے پگڑی بدل

خوب ہوگی بہتر دل میں قدر دانی آپ کی
 ہے پسند خاکروباں شعر خوانی آپ کی
 کھینچتے تصویر گر بہزاد و مانی آپ کی
 ہر طرف ہوتی ہو سعدی گلشنانی آپ کی
 گوش عالم تک یہ پہنچے ہیں بانی آپ کی
 جان سے تنگ آ گئی ہو بہترانی آپ کی
 بھاگی اہل سخن کو درفشانی آپ کی
 واہ صاحب شعر خوانی شعر دانی آپ کی
 تلخ کامی ہوگی یہ شیریں دانی آپ کی
 آپ پر کھل جائے گی رنگیں بھائی آپ کی
 پھر نکل جائیگی سر سے شعر خوانی آپ کی
 سارے عالم کی زبان پر ہو کہانی آپ کی
 حضرت شیطان کرینگے سائبانی آپ کی
 سر بسرچن سو عیلا ہو خوش بیانی آپ کی
 ہو گیا ہم کو یقین شامت ہے آئی آپ کی
 ہے مگر قوم نصاریٰ یار جانی آپ کی
 اہل عالم نے سبھی کہا اس جانی آپ کی
 جب خبر لیوگا قہر آسمانی آپ کی
 آپ کو نام کرے گی بد زبانی آپ کی
 واہ کیا اسلام پر ہے مہربانی آپ کی

- حوالے و حواشی

- (1) مرزا غلام احمد، ستارہ قیصریہ 24 اگست 1899ء، قادیان ص 6
- (2) A.R. Dard, Life of Ahmed, Lahore, 1948 p.13
- (3) مرزا غلام احمد، کشف الغطاء، قادیان، دسمبر 1898 ص 8
- (4) مرزا محمود احمد، سیرت مسیح موعود، ربوہ ص 15
- (5) مولوی نور الدین کے فرزند مولوی عبدالمتان عمر کا سالانہ جلسہ 1977 لاہور سے خطاب، احمدیہ انجمن لاہور
فروری 1978ء، ص: 12
- (6) ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان، 1977ء ص: 186
- (7) تبلیغ رسالت جلد اول، مولفہ میر قاسم علی، قادیان، ص: 58
- (8) عبد اللہ چغتائی، روایات اقبال، ص: 45
- (9) الفضل قادیان، 30 مئی 1935ء
- (10) سیرت المہدی، جلد سوم قادیان 1939ء، ص: 249-250
- (11) ایضاً، ص: 9
- (12) شیخ عبد الماجد، اقبال اور احمدیت، زندہ رود پریس، لاہور 1991ء، ص: 36
- (13) شیخ عبد الماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ، لاہور 1996ء، ص: 178
- (14) ایضاً
- (15) شیخ عبد الماجد، اقبال اور احمدیت، ص: 36
- (16) مرزا محمود احمد، حقیقت الامر، قادیان 1918ء، ص: 17-18
- (17) ڈاکٹر بشارت احمد، مراۃ الاختلاف، لاہور 1936ء، ص: 85
- (18) زندہ رود، حصہ سوم، ص: 57
- (19) ایضاً
- (20) ایضاً
- (21) وہ جمال الدین افغانی کو مجدد قرار دیتے تھے ان کے نزدیک یہ اگر کوئی دینی منصب تھا۔

- (22) جاوید اقبال، زندہ رود جلد سوم، ص: 570
- (23) ایضاً، پاکستان ٹائمز لاہور، 15 نومبر 1953ء
- (24) دعوت نامہ جلسہ سالانہ 1980 انجمن احمدیہ لاہور، ص: 7
- (25) شیخ عبد الماجد، اقبال اور احمدیت، ص: 39
- (26) سوڈنیر کراچی مجلس خدام الاحمدیہ، کراچی 1987ء، ص: 21
- (27) زندہ رود حصہ سوم، ص: 570
- (28) اعجاز احمد، مظلوم اقبال، ص: 191
- (29) ماہنامہ انصار اللہ ربوہ نومبر دسمبر 1985ء، ص: 102 سر ظفر اللہ نمبر
- (30) پندرہ روزہ آتش فشاں لاہور، مئی 1981ء، ص: 34
- (31) ڈاکٹر بشارت احمد، مجدد اعظم جلد اول انجمن احمدیہ لاہور دسمبر 1939ء، ص: 333
- (32) سید سلطان محمود، حوالہ سابق، ص: 188
- (33) ممتاز احمد فاروقی، مجاہد کبیر، لاہور، 1962ء ص 249
- (34) پوری نظم اس باب میں درج ہے۔
- (35) عبد الماجد فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 446
- (36) مرزا نیل انجمن طلباء اسلام چنیوٹ 1968ء ص 124

بانی قادیانیت کے متعلق علامہ اقبال کی ابتدائی تحریر

مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں علامہ اقبال کا ایک مضمون بمبئی کے ایک علمی رسالے میں چھپا جس میں انہوں نے مرزا صاحب کو ہندی مسلمانوں کا عظیم دینی مفکر کہا۔ ہم اس کے پس منظر پر گفتگو کرتے ہیں۔

1890ء سے 1900ء تک مرزا غلام احمد قادیانی مجدد، مسیح موعود اور جزوی نبی (محدث) ہونے کے مدعی تھے۔ محدثیت کو وہ جزوی نبوت کہتے تھے اور حقیقی نبوت کے دعویدار کو ختم نبوت کا منکر اور کافر قرار دیتے تھے۔ وہ خدا سے کلام کرنے کے دعویدار تھے اور تصوف کی اصطلاحات فنا فی اللہ، فنا فی الرسول اور ظل و بروز کی آڑ میں اپنی نبوت اور مکالمہ و مخاطبہ الہیہ کا دعویٰ پیش کرتے تھے۔ (1) وہ محی الدین ابن عربی کے نظریہ نبوت کے قائل تھے اور دیگر صوفیاء کی تحریرات کو اپنے دعوے کا جواز بناتے تھے۔ ابن عربی کی فصوص الحکم اور مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی آڑ میں وہ خدا سے ہمکلامی اور ولایت کے اعلیٰ ترین مقام محدثیت (جزوی نبوت) کے حصول کا ذکر کرتے تھے۔ (2)

علامہ اقبال نے 1895ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے 1897ء میں بی اے کیا۔ پروفیسر آرنلڈ کی رہنمائی میں ایم۔ اے فلسفہ کیا۔ 13 مئی 1899ء کو انہوں نے اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر کا عہدہ قبول کیا۔ 1898ء یا 1899ء میں انہوں نے مشہور صوفی عبدالکریم جیلی کے نظریہ انسان کامل اور توحید مطلق کے موضوع پر ایک تحقیقی مضمون لکھا۔ یہ تحقیقی مضمون یا تو ایم اے فلسفہ پنجاب یونیورسٹی کے آخری پرچے کے لئے تیار کیا یا 1898ء میں قاہرہ سے عبدالکریم جیلی کی تصنیف انسان کامل آرنلڈ کے پاس لندن پہنچی تو انہوں نے اقبال کو روانہ کر دی تاکہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں۔ یہ مضمون اپنے مزاج اور اسلوب کے اعتبار سے اسی قسم کا تبصرہ معلوم ہوتا ہے۔ (3)

بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں کہ اقبال زندگی کے اس دور میں وحدت الوجودی فلسفے سے متاثر تھے اور روایتی تصوف کے دلدادہ تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی بھی اپنے افکار کی تائید میں ابن عربی اور فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ سے استفادہ کرتا تھا اس لئے اگر اقبال نے اس مضمون میں جیلی کے فلسفے سے بحث کرتے ہوئے مرزا غلام احمد کی تعریف کی تو کوئی اچنبھا نہیں۔ دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ جس مسئلے کا اقبال یہاں ذکر کر رہے تھے وہ مسئلہ نور محمدی ہے۔ یہ نظریہ تنزلات ستہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اقبال اس نظریہ کے حامی تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ ایسا نظریہ ہے جس کی تائید بہترین حکمائے اسلام نے کی ہے اور موجودہ دور میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اس کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ (4)

علامہ اقبال کا یہ مضمون بمبئی کے مشہور جریدے انڈین انٹی کیوری Indian Anti quarry کے ستمبر 1900ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس تحقیقی مضمون کے بعض حصوں میں ترمیم و ترمیم کے بعد 1907ء میں علامہ اقبال نے اسے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے (فلسفہ عجم) Development of Metaphysics in Persia میں شامل کیا۔ مقالہ کا عنوان تھا

The Doctrine of the Unity as Expounded by Al-Jili - by Sheikh Muhammad Iqbal (McLeod Arabic Reader Oriental College Lahore)

اس زمانے میں علامہ اقبال روایتی تصوف اور نظریہ وحدت الوجود کے قائل ہونے کی وجہ سے ابن عربی اور الجیلی کو بلند پایہ صوفی قرار دیتے تھے لیکن مثنوی اسراخودی لکھتے کرتے وقت 1915ء میں ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور وہ مروجہ تصوف اور حافظ شیرازی کے خلاف ہو گئے۔ الجیلی نے ابن عربی سے انسان کامل کا تصور لیا تھا۔ علامہ اقبال نے الجیلی کے نظریات کا جرمن فلسفیوں کے نظریات سے تقابل پیش کیا اور ان میں یک گونہ مماثلت اور مشابہت بتائی۔ (5)

قاضی جاوید لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی ذہنی زندگی کا آغاز فلسفہ وحدت الوجود اور اس کے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور مذہبی نتائج کو قبول کرنے سے ہوا۔ اس دور میں علامہ نے ہندی عوام کے

مختلف ثانوی گردہوں کے درمیان یک جہتی اور یگانگت پیدا کرنے کا پیغام دیا اس پیغام کی اساس وحدت الوجود کی مابعد الطبیعیات پر رکھی گئی۔ علامہ اقبال کی اس دور کی شاعری میں نوافلاطونی اور صوفیانہ مابعد الطبیعیات کے اثرات واضح طور پر ملتے ہیں۔ انہوں نے اس کا خود اعتراف کیا ہے کہ وہ ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کے قائل رہے جو صوفیا کے ساتھ خاص ہیں جو بعد میں قرآن پر تدبر کرنے سے غلط ثابت ہوئے مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدم ارواح کاملہ، مسئلہ وحدت الوجود، یا مسئلہ تنزلات ستہ یا دیگر مسائل جن میں بعض کا ذکر عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب انسان کامل میں کیا ہے۔ (6)

علامہ اقبال نے اپنے تحقیقی مضمون (7) میں بتایا ہے کہ ہستی مطلق باوجود خالص ہونے کے اپنی مطلقیت کو چھوڑنے کے بعد تین منازل سے گزرتی ہے (1) احدیت (2) غیریت (3) ذاتیت۔ پہلی منزل میں تمام اغراض و علاق کا فقدان ہوتا ہے پھر بھی اس کو واحد ہی کہتے ہیں۔ اس لئے احدیت مطلقیت سے ایک قدم ہٹ جاتی ہے۔ دوسری منزل میں ہستی خالص تمام مظہر سے آزاد رہتی ہے اور تیسری منزل یعنی ذاتیت خود غیریت ہی کا ایک خارجی مظہر ہے جیسا کہ ہیگل اس کی تعبیر کرتا ہے۔ یہ انفعال ذات باری ہے یہ تیسری منزل اسم اللہ کا دائرہ ہے یہاں ہستی خالص کی ظلمت کو منور کیا جاتا ہے۔ فطرت اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ ہستی مطلق ذی شعور ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد الجلی کہتا ہے کہ اسم اللہ ایک چیز ہے جس سے الوہیت کے مختلف پہلو کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ہستی خالص کی ترقی کی دوسری منزل میں انفعال ذات ربانی کا جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ اسی اسم ذات کی گرفت میں بالقوہ موجود تھا جس نے ارتقاء کی تیسری منزل میں آ کر خارجیت اختیار کر لی اور ایسا آئینہ بن گیا جس میں خدا نے اپنے آپ کو منعکس کیا اس طرح اسم اللہ نے اپنے آپ کو شفاف کر کے ہستی مطلق کی تاریکی کو دور کر دیا (8)

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس وضاحت سے الجلی نے جدلیات ہیگل (9) (یعنی ہستی مطلق ہی حقیقت اولیٰ ہے۔ مصنف) کے مرکزی خیال کی پیش بینی کی ہے اس

طرح سے اس نے لوگوس یعنی کلام (الہی) کے نظریے (10) پر زبردست طریق سے زور دیا ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ یہ نظریہ (لوگوس) ہمیشہ ہی اسلام کے بڑے دینی مفکرین کی نظر میں پسندیدہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ (11) اس کے معا بعد فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں اس نظریہ لوگوس یا کلام (الہی) کا قادیان کے مرزا غلام احمد نے دوبارہ پرچار کیا ہے جو غالباً جدید ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم دینی مفکر ہیں۔

یہ پیرا گراف جس میں مرزا صاحب کو ہندوستانی مسلمانوں کا غالباً عظیم دینی مفکر کہا گیا ہے، پورے مضمون کے حوالے سے ان کے خیال پر رائے زنی کئے بغیر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرزا صاحب غالباً اس لحاظ سے عظیم دینی مفکر کہے جاسکتے ہیں کہ انہوں نے قدیم صوفیاء کے بعد نظریہ لوگوس کلام یا کلمہ الہی کا ازسرنو پرچار کیا۔ انہوں نے خدا سے کلام اور مکالمہ و مخاطبہ الہیہ کا دعویٰ کیا اور فانی اللہ اور نبی کریم کے ظل و بروز ہونے کی آڑ میں انسان کامل کے منصب پر فائز ہونے کی سعی کی۔ (12) مرزا قادیانی کا دعویٰ تھا کہ خدا پہلے بھی کلام کرتا تھا اب بھی کرتا ہے اور کرتا رہے گا اس کی صفت تکلم معطل نہیں ہوئی اور الہام خداوندی کے نزول کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو اسلام ایک مردہ مذہب قرار پاتا ہے۔ خدا کی ہستی کا ثبوت اس کا اپنے بندوں سے ہم کلام ہونے سے ملتا ہے۔ (13)۔ 1900ء تک مرزا صاحب نے اپنی کتابوں میں مکالمہ و مخاطبہ الہیہ کے موضوع پر جو مباحث کیے ہیں اور جس طرح اپنی ذات کو متصوفانہ رنگ میں مہبط وحی والہام بتایا ہے اس کی بنیاد پر علامہ اقبال کی یہ عمومی رائے تھی۔ علامہ اقبال نے نہ تو کوئی قطعی اور حتمی رائے دی ہے نہ ہی وہ مرزا صاحب کو دعویٰ میں سچا سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں چونکہ مرزا صاحب ہندوستان میں اس نظریے کا پرچار کر رہے تھے اور جزوی نبوت (محدثیت) اور خدا کے ساتھ ہم کلام ہونے کے مدعی تھے اس لئے غالباً وہ اس زمانہ (1899-1900) میں ہند کے جدید مسلمانوں کے عظیم ماہر دینیات قرار دیئے جاسکتے تھے۔ انہوں نے ابھی نبوت کا ملہ تامہ کا دعویٰ نہیں کیا تھا، یہ دعویٰ 1901 میں کیا۔

علامہ اقبال نے جب میونخ یونیورسٹی میں 1905ء میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ پیش کیا تو اس حصے کو

جس میں مرزا صاحب کو غالباً عظیم دینی مفکر کہا گیا تھا حذف کر دیا اور مضمون میں کئی تراجم کیے جو ان کے فکری ارتقاء کی مظہر ہیں۔ اب علامہ اقبال روایتی تصوف، وحدت الوجود اور جیلی اور ابن عربی کے نظریات کے خلاف ہو چکے تھے۔

آغا شورش کاشمیری مرحوم رقم طراز ہیں علامہ اقبال کا یہ کہنا کہ مرزا غلام احمد جدید ہندی مسلمانوں کے اغلباً سب سے بڑے دینی مفکر ہیں تو اس سے بھی یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا کہ وہ مرزا غلام احمد کو مسیح موعود ظلی و بروزی نبی مانتے ہیں۔ یہ تو ایک عمومی تاثر تھا جو اس وقت کے مباحث سے پیدا ہو گیا تھا۔ جب مرزا صاحب مار آستین نکلے یا اس وقت کی صورت حال سے ان کا دماغ خراب ہو گیا تو معترفین نے اپنی رائیں تبدیل کر لیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جس زمانے (1900) کی یہ تحریریں پیش کی جا رہی ہیں اولاً تو ان تحریروں کو علامہ اقبال نے اپنے فکری و نظری ارتقاء کے بعد لائق اعتناء نہ سمجھا، یہ ان کی ابتدائی تحریری مشقیں تھیں ثانیاً جب ان کا اسلامی شعور اور دینی تجربہ پختہ ہو گیا تو ان کے خیالات روشن ہو کر قوم کے لئے سنگ میل ہو گئے اور یہی افکار و نظریات ہیں جن کی صداقت پر انہیں حکیم الامت، شاعر مشرق اور ترجمان اسلام کہا جاتا ہے۔

1899ء میں حضرت علامہ نے ایم اے کیا، 1900ء میں ان کی عمر صرف 23 برس کی تھی۔ اس وقت تک وہ ایک شاعر تھے اور ان کی فکر کا آغاز نہ ہوا تھا۔ اس عہد کی تحریروں کے اقتباس تو قادیانی امت اپنی روایتی سچائی کے لئے بطور سند استعمال کرتی ہے لیکن جس عمر میں وہ پختہ ہو کر مسلمانوں کی محبوب فکری متاع بن چکے تھے اس عمر کی متاع فکر سے فرار غایت درجہ کی بوائی ہے، کوئی سا استدلال بھی اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ اقبال کبھی طالب علم بھی تھے تو کیا اس عمر کے اقوال کو حجت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس وقت تک انہوں نے مشقِ سخن کے ابتدائی دور میں بہت سے اشعار لکھے جنہیں خیالات کی تبدیلی اور نظریات کی صحت کے بعد حذف کر دیا تو کیا ہم اس کلام کو بھی ان کے مستقل کلام پر فوقیت دے سکتے ہیں۔ (14)

1902ء میں علامہ اقبال کا ختم نبوت کے متعلق عقیدہ:

فروری 1902ء میں علامہ اقبال کی ایک نظم شائع ہوئی جس میں ختم نبوت کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے اس زمانے میں مرزا صاحب قادیان میں مشن نبوت فرما رہے تھے۔

1901ء میں رسالہ ایک غلطی کا ازالہ شائع کرنے کے بعد مرزا صاحب محدثیت کے مقام سے گزر کر نبوت کاملہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا ”خدا کی وحی میں انہیں بار بار نبی و رسول کہا گیا ہے اس لئے وہ اس منصب کا انکار نہیں کر سکتے۔ ایسے الفاظ اس زمانے (1901ء) میں پہلے زمانہ کی نسبت سے بہت تصریح اور توضیح کے ساتھ موجود ہیں۔“ فنانی الرسول کی کھڑکی کھلی ہے اور جو اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے پاس آتا ہے اس پر ظلی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے جو نبوت محمدی کی چادر ہے اس طرح محمد ﷺ کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی گو بروزی طور پر اس طرح ان کی نبوت باعتبار محمد اور احمد ہونے کے ہے، ان کے نفس کی رو سے نہیں یہ نام انہیں فنانی الرسول کی حیثیت سے ملا وہ بروزی طور پر نبی و رسول ہیں۔ غیب کی خبریں پانے والا نبی کہلاتا ہے۔ اگر اسے محدث کہا جائے تو بتائیں کس لغت کی کتاب میں تحدیث کے معنی اظہار غیب ہیں مگر نبوت کے معنی اظہار امر غائب ہے۔“ (15)

اس رسالے کی اشاعت کے بعد وہ لوگ جو ان کو محدث یا جزوی نبی مانتے تھے اور زمرہ اولیا میں شمار کرتے تھے ظلی بروزی رنگ میں حقیقی نبی ماننے لگے۔ 23 فروری 1902ء کو علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں ایک نظم پڑھی۔ یہ نظم اجلاس کی روایتوں کے صفحہ 32 پر بعنوان ’اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو‘ شائع ہوئی جس کے دیگر اشعار (16) میں سے ایک شعر یہ ہے

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک

بزم راروشن ز نور شمع عرفاں کردہ ای

علامہ اقبال نے اس شعر میں ہر مفہوم۔ ظلی، بروزی، امتی، عکسی وغیرہ میں مطلق نبوت کو ختم مانا

ہے۔ اس ایک شعر سے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کے تمام متصوفانہ فلسفے کی نفی ہو جاتی ہے اور اجرائے نبوت کا نظریہ چاہے کسی رنگ حیثیت یا توجیہ کے ساتھ پیش کیا جائے اور اس کی آیت خاتم النبیین سے تطبیق کی کوشش کی جائے شرک فی النبوة قرار پاتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت مرزا غلام احمد کے دعویٰ بروزیت کی بنا پر ہوئی یعنی علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تیرے (نبی کریمؐ) کے بعد نبوت کا دعویٰ ہر لحاظ سے شرک فی النبوة ہے۔ خواہ اس کا مفہوم کوئی ہو یعنی، ظلی، بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں۔ (17)

یہ اشعار ان کے عقیدہ ختم نبوت پر کامل ایمان اور مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کی مکمل تردید کے لئے کافی ہیں اور اسی عقیدہ کا اظہار بعد میں انہوں نے اپنے کلام اور خطبات مدراس میں کیا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب نے دعویٰ نبوت (1901) سے پہلے اسی انداز کے شعر کہے، فرماتے ہیں۔

ہست	او	خیر	الرسل	خیر	الانام
ہر	نبوت	رابرو	شد	اختتام	
ختم	شد	بر نفس	پاکش	ہر	کمال
لا	جرم	شد	ختم	ہر	پیغمبرے

یعنی آنحضرت ﷺ ہی خیر الرسل اور خیر الانام ہیں ہر نبوت آپؐ پر ختم ہے۔ آنحضرت ﷺ کے پاک نفس پر ہر کمال ختم ہو گیا اس لئے ہر پیغمبر بھی ختم ہو گیا۔

علامہ اقبال کو بیعت کی دعوت (مئی 1902ء)

میر حامد سیالکوٹی علامہ اقبال کے استاد میر حسن کے چچا زاد بھائی سید حسام الدین کے بڑے لڑکے تھے۔ 1877ء میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر سیالکوٹ میں ملازم ہوئے۔ 1915ء میں سپرینٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انگریز ڈی سی ایٹ ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ (18) وہ سیالکوٹ میں مرزا صاحب کے دعاوی کا پرچار کرتے رہے۔ تبلیغ احمدیت اور مرزا صاحب کی سچائی

کے اظہار کے لئے انہوں نے سادہ زبان میں نظمیں کہیں گو کہ ان میں شعری خوبی اور حسن کلام کا فقدان ہے۔ مثلاً 1892ء میں انہوں نے ایک نظم صدائے عاجزانہ (19) کے عنوان سے کہی، فرماتے ہیں۔

نذیر آیا ہے دنیا میں وہ دیکھو۔ رہے آگاہ بیگانہ بیگانہ
جو تھا اک آنے والا وہ یہی ہے۔ ہے بد قسمت وہی جس نے نہ مانا
مسیحا کے مثل اترے وہ اترے۔ کیا دعویٰ انہوں نے ملبسانہ
دیا وعدہ رسول حق نے جس کا۔ امام اپنا وہ آیا ہم نے مانا

شاید اقبال کی انجمن حمایت اسلام کی روئیداد میں چھپنے والی نظم کو دیکھ کر میر حامد نے انہیں مرزا غلام احمد کی بیعت کی دعوت دی اس دعوت بیعت کا جواب 40 اشعار پر مشتمل اقبال کی نظم بعنوان 'خط منظوم پیغام بیعت کے جواب میں' شیخ عبدالقادر کے رسالے مخزن لاہور بابت مئی 1902ء اور نشی محمد دین فوق کے اخبار پنجہ فولاد مورخہ 11 جون 1902ء میں شائع ہوا۔ اس کے دو بند تھے پہلا 20 شعر اور دوسرے 21 شعر کا تھا۔ نظر ثانی میں پہلا بند حذف کر دیا گیا اور دوسرے کے 21 شعروں میں سے 13 باقی رہ گئے اور یہ نظم بانگ درا میں عقل و دل کے عنوان سے چھپی۔ اس نظم کے عنوان سے عیاں ہے کہ بقول محمد عبداللہ قریشی علامہ اقبال پر احمدیت قبول کرنے کے لئے ڈورے ڈالے گئے۔ یہ نظم اور میر حامد سیالکوٹی کا منظوم جواب قادیانی اخبار الحکم نے 10، 17 اور 24 جنوری 1903ء کے شماروں میں شائع کیا۔ اس نظم کی تمہید میں میر حامد نے لکھا کہ وہ شیخ صاحب (اقبال) سے تعلق خاطر کی بناء پر انہیں نیک نیتی سے سچی نیکی اور اصل خوشی اور حقیقی تسلی کی راہ پر لانا چاہتا ہے۔ یہ میرے آئینہ دل کا عکس ہے جو میں شیخ صاحب پر ڈالنا چاہتا ہوں میں ان کو جانتا ہوں وہ مجھے جانتے ہیں دل ہی دل کا معاملہ ہے۔ (20)

وہ مزید لکھتے ہیں ”مجھے امید ہے شیخ صاحب میرے اس جواب کو اس کے سچے محل پر رکھ کر حق سے توفیق مانگیں گے جس کی میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں بہتر ہوتا کہ وہ اس راہ میں اس

انداز سے قدم رکھتے ہوئے خدا کا خوف کرتے۔ طبع آزمائی کے لئے جہان میں اور میدان تھوڑے ہیں اپنی مشغلہ پسند طبیعت کو اسی طرف مصروف رکھتے۔ آگے کی خدا جانے مگر اب تک جو آسمانی مرد (مراد مرزا صاحب) کے مقابل میں آیا ہے اس کا نتیجہ آخر کار ایک افسوس ناک حالت پر مبنی ہوا ہے۔ ہر رنگ میں خدا نے غلبہ اپنے بندے کو بخشا ہے۔ بہتر ہے شیخ صاحب (اقبال) اپنے قلم کو روک لیں اور اپنے زور طبیعت کے لئے اور میدان پسند کریں۔ (21)

میر حامد نے اپنے زعم باطل میں یہ شعر بھی کہا:

کیوں نہ ہو خاک پامرا اقبال

حامد نائب خدا ہوں میں

اقبال کی جوابی نظم میں عشق رسول ﷺ، عقیدہ ختم نبوت، حق سے وابستگی، وحدت ملی اور امت کی یک جہتی نمایاں ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ میر حامد جانتے تھے کہ علامہ اقبال (1902) تک مرزا صاحب کے دعاوی پر یقین نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی زبانی یا تحریری بیعت کر کے جماعت احمدیہ میں شامل ہوئے تھے اس لئے انہوں نے ان کو احمدیہ جماعت میں شمولیت کی دعوت دی جو انہوں نے ٹھکرا دی۔ میر حامد نے اس کا بہت برا منایا۔ اس دعوت کے بعد وہ تمام قادیانی روایات جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اقبال فلاں سن میں احمدی تھے یا انہوں نے مرزا صاحب کی بیعت کر لی تھی غلط قرار پاتی ہیں کیونکہ سیالکوٹ ہی کے ایک با اثر احمدی اور مرزا صاحب کے مرید خاص کی طرف سے اس بات کی تحریری تردید ملتی ہے۔ (22)

شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اس سے پہلے بیعت نہیں کی ہوئی تھی اگر کی ہوتی تو یہ پیغام کیوں بھیجا جاتا؟ (23)

علامہ اقبال کی 1903ء کی نظم

مارچ 1903ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں فریاد امت کے نام سے اقبال نے ایک نظم پڑھی جس کا دوسرا عنوان ابرگوہر بار تھا۔ اس کا ایک شعر ہے

مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا
مرزا صاحب مہدویت کا دعویٰ بھی کرتے تھے اور مثلِ محمدؐ کے بھی مدعی تھے اقبال نے اس کو رد کیا۔

علامہ اقبال کی مرزا غلام احمد قادیانی سے ملاقات (1904ء)

مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور بیان کرتے ہیں کہ اکتوبر 1934ء میں وہ ڈاکٹر اقبال کی عیادت کو گئے ڈاکٹر صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ اور (سر) فضل حسین 1904ء میں مرزا غلام احمد قادیانی سے ملے تھے۔ فضل حسین نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہتے ہیں تو مرزا صاحب نے جواب دیا ہرگز نہیں۔ 1935ء میں مولوی محمد علی نے اس سلسلے میں ایک اشتہار بھی شائع کیا۔ (24)

ڈاکٹر بشارت احمد نے بھی یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ مجددِ اعظم حصہ دوم میں لکھتے ہیں
”2 نومبر 1904ء کو مرزا غلام احمد سیالکوٹ گئے اور سرانے مہاراجہ جموں میں لیکچر دیا۔ (یہ لیکچر سیالکوٹ کے نام سے طبع شدہ ہے اور اس میں انہوں نے سری کرشن ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ مصنف) سٹیج پر مرزا صاحب، مولوی عبدالکریم، بعض احمدی اکابر اور بعض عمائدین رونق افروز تھے جن میں میاں فضل حسین بیرسٹر بھی تھے جو بعد میں سر فضل حسین کے نام سے مشہور ہوئے۔ 1904ء میں وہ سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کا بیان ہے کہ ایک دن میاں فضل حسین صاحب مرحوم حضرت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ میاں صاحب نے مرزا صاحب سے دریافت کیا کہ آپ ان مسلمانوں کو جو آپ کی جماعت میں شامل نہیں کیا کافر سمجھتے ہیں۔ حضرت مرزا صاحب نے اس کا جواب انکار میں دیا۔ (25)

1905ء میں ڈاکٹر اقبال لندن چلے گئے۔ جولائی 1908ء میں جب واپس آئے تو مرزا

صاحب وفات پا چکے تھے۔ ان کے ذہن پر مرزا صاحب سے اس ملاقات کے نقوش تا دیر قائم رہے شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قادیانیوں کے ساتھ نہ تو بحث مباحثہ کیا اور نہ ہی ان کی کھل کر تکفیر کی۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ جب خود بانی سلسلہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہنے سے انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ حقیقی نبوت کے مدعی نہیں ہیں۔ حکیم نور الدین نے 1908ء سے 1914ء تک مسلمانوں سے تعاون بڑھانے کیلئے اسی اعتدال پسندانہ پالیسی کو اختیار کیا۔ علامہ اقبال کا لاہور جماعت کے جلسوں میں جانا اور 1911ء میں جماعت احمدیہ قادیان کو ٹھینٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ کہنا اس واقعے کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے جیسا کہ ہم آگے بتا رہے ہیں کہ مرزا صاحب نے دراصل مسلمانوں کی تکفیر کے مسئلہ پر اپنے اصل موقف کو عیارانہ رنگ میں چھپایا اس لئے اصل قصہ۔ زار مرزا صاحب ہیں اور یہ ان کا منافقانہ طرز عمل تھا جس کے باعث علامہ اقبال نے تحریک احمدیت کے خلاف کھل کر کچھ نہ کہا اور اس مغالطے میں مبتلا رہے کہ شاید احمدی مسلمانوں کے فرقوں کی طرح ایک فرقہ ہیں۔ علامہ اقبال نے جو کچھ خود مرزا صاحب سے سنا بعد میں ان کے فرزند یعنی خلیفہ قادیان مرزا محمود احمد نے اس کی تردید کر کے ان کے اصل موقف کو جس واضح انداز سے پیش کیا، اس سے تحریک قادیانیت کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ درحقیقت 1904ء میں بھی مرزا صاحب کا موقف ان عام مسلمانوں کی تکفیر تھا جو ان کے دعووں پر ایمان نہ لائیں۔

اپنے نہ ماننے والوں کو کافر قرار نہ دینے کے متعلق جو بات مرزا صاحب نے 1904ء میں کہی تھی وہ درست نہ تھی۔ 1915ء میں قادیانی جماعت نے بہت سائلرچر شائع کر کے اس مسئلہ کو واضح کر دیا۔ مولوی محمد علی، ڈاکٹر بشارت احمد وغیرہ نے مرزا محمود احمد اور ان کے بھائی مرزا بشیر احمد ایم اے کی تصانیف (26) ضرور دیکھی ہوں گی۔ ان کو جانے دیں اس کے چار سال بعد 1908ء میں مسلمانوں کی تکفیر کے بارے میں خود مرزا صاحب نے جو کہا وہ بھی اصل حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ اپریل 1908ء میں مرزا صاحب اپنی اہلیہ محترمہ کے علاج کے لئے لاہور میں موجود تھے۔ سر

فضل حسین اس وقت لاہور میں وکالت کرتے تھے انہوں نے ان سے یہی سوال پھر پوچھا کہ اگر تمام غیر احمدیوں کو کافر کہا جائے تو اسلام میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا تو مرزا صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ جب تک یہ لوگ ایک اشتہار نہ دیں کہ ہم سلسلہ احمدیہ کے لوگوں کو مومن کہتے ہیں بلکہ ان کو کافر کہنے والوں کو کافر سمجھتے ہیں تو اس وقت تک وہ انہیں کافر ہی کہیں گے۔ مرزا صاحب کا پورا جواب اخبار ”بدر“ 24 مئی 1908ء میں چھپا۔ اس کا عکس اس باب میں دیا جاتا ہے۔

فضل حسین کے ساتھ ایک اور بار ایٹ لاء بھی اسی ملاقات میں موجود تھے جن کا نام پرچے میں درج نہیں لیکن یہ علامہ اقبال نہ تھے وہ اس زمانہ میں یورپ میں تھے۔

کیا حضرت مرزا صاحب نے دعویٰ کا انکار کر لیا اور ان کو فرتے تھے؟ ڈاکٹر محمد اقبال کی شہادت

اس وقت جبکہ عام طور پر یہ پروپاگنڈا کیا جا رہا ہے کہ حضرت مرزا صاحب نے اپنے دعویٰ کا انکار کرنے والوں کو کافر کہا ہے اور اس کے بالمقابل آپ کی اپنی شائع شدہ تحریر کی بھی پروا نہیں کی جاتی جس میں آپ نے یہ لکھا ہے۔

”ابتداء میں میری مذہب ہی کہ میری دعویٰ کے انکار کی وجہ کوئی شخص کا قریباً خال نہیں ہو سکتا۔“ (تریاق العلوب صفحہ ۱۳۷)

میں اپنے مسلمان بھائیوں کے سامنے ڈاکٹر محمد اقبال کی شہادت پیش کرتا ہوں جو انہوں نے گذشتہ مہینہ میں جب میں ان کی عیادت کے لئے گیا تو میرے سامنے بیان کی اور فرمایا کہ۔

ایک دفعہ جناب میرزا صاحب ریالکوٹ گئے ان ایام میں میں ریالکوٹ میں تھیں اور ان کے ساتھ تھے تو اتفاق سے میں نے ان کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کدھر جا رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ میں مرزا صاحب کی طرف جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ جب ہم آپ کے پاس پہنچے تو انہوں نے گفتگو میں میرا قصہ سنا۔

نے جناب مرزا صاحب سے یہ سوال کیا کہ کیا آپ اپنے منکر کو کافر کہتے ہیں تو آپ نے صاف الفاظ میں جواب دیا کہ۔

”میں اپنے منکر کو کافر نہیں کہتا“

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جناب مرزا صاحب کے یہ الفاظ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ البتہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعہ کس سال کا ہے لیکن اتنے یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ میرا فضل حسین ان دنوں میں وہاں پر نہیں کرتے تھے سوا اس کے متعلق صرف اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے سبب انکوٹ تشریف لے جانے کا واقعہ ۱۳۰۷ھ کا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ خدا ترس مسلمان اس کے بعد کم سے کم اس بات کو حضرت مرزا صاحب کی طرف منسوب نہ کریں گے کہ آپ اپنے دعویٰ کے انکار کرنے والوں کو کافر کہتے تھے۔

خاکسار۔ محمد علی امجد جماعت احمدیہ لاہور

(۱۰۔۱۔۱۳۰۷ھ)

کچھ ایسے بڑے بڑے علماء ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم محمدی مہم پر عمل کرتے ہیں

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک

علامہ اقبال نور اللہ مدظلہ کے متروک کلام کو بعض دانشوروں نے کوہ کنی دکاہ برآمدوں کے مصداق اکٹھا کر کے منظرِ نفع کیا، انھیں شیدایانِ نرنے ان مجہولوں میں وہ اشعار بہ التزامِ شریک کے جو پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء میں انگریزی فتوحات سے متعلق علامہ اقبال کے قلم سے استعمار کے خاندانی جگر گوشوں نے کہہوائے تھے۔ استبداد کا زمانہ تھا اور وہ اشعار محض ابیات کا چربہ تھے علامہ نے اگلا اور ٹھکرا دیا۔ لیکن کسی مرتب کے نظر سے علامہ اقبال کی نظم ذیل نگذری کہ مجہول میں شریک کرتا یا پھر یہ نظم قادیانی مصلحتوں کی بیسیٹھ لکھی۔ بہر حال مندرجہ تحت اشارہ نمونہ حمایتِ اسلام کی روئیدار است ۱۹۱۹ء کے مغرور سے منقول ہیں۔ ————— شرارت کا ٹبرِ بے



اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک	اے کہ برد بہارِ منور عشق آساں کردہ ای
اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علم تو	اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو
اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علم تو	اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
فیض تو دشتِ عربِ مطلعِ انظارِ خست	اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علم تو
خاکِ ایں ویرانہ را گلشنِ بد اماں کردہ ای	اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک

دل نہ نالہ در سداقِ ماسوائے نور تو

خشک چو بے راز ہجرِ خویش گریاں کردہ ای

حوالے و حواشی

- (1) مرزا غلام احمد از آلہ ادہام 1891ء ص 532، آئینہ کمالات اسلام 1893
- (2) ایضاً نیز مجموعہ اشتہارات جلد چہارم ص 333 اور جلد سوم ص 223 لاہور جماعت کے احمدی میر مدثر گیلانی نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ کتاب تطہیر الاولیاء شائع کی۔
- (3) ڈاکٹر صدیق جاوید، اقبال نئی تفہیم ص 755-772
- (4) بشیر احمد ڈار اقبال اور احمدیت ص 14
- (5) ڈاکٹر صدیق جاوید نے اقبال نئی تفہیم ص 755 تا 772 میں اس مضمون کی تاریخ اشاعت پر بحث کی ہے اور بتایا کہ کس طرح کئی سال تک یہ مضمون ماہرین اقبالیات کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔ 1900ء کے بعد پہلی بار پاکستان میں اسے اخبار رسول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے 21 اپریل 1960ء کو علامہ اقبال کے یوم وفات پر شائع کیا۔ راقم کی تحقیق کے مطابق یہ مضمون اس سے قبل یکم جون 1959ء کو لاہور جماعت کے چند روزہ جریدے لائٹ لاہور نے شائع کیا۔ اس میں ایک نوٹ دیا گیا ہے کہ اقبال کا یہ علمی مضمون برٹش میوزیم لائبریری کے آرکائیو سے حاصل کیا گیا ہے۔ لائٹ کے فارن ایڈیٹر محمد یعقوب خان تھے جو بعد میں قادیانی جماعت سے جا ملے اور اس کے لوکل ایڈیٹر مرزا معصوم بیگ تھے۔ اس سے قبل شاید یہ مضمون دو کنگ مشن کے رسالے اسلامک ریویو میں شائع ہوا جہاں سے لائٹ نے نقل کیا۔
- (6) قاضی جاوید، سرسید سے اقبال تک ص 240-267 ماخوذ محمد اقبال، اسرار خودی اور تصوف، اخبار وکیل امرتسر 15 جنوری 1916ء، عبد الواحد معینی، مقالات اقبال ص 161
- (7) مضمون کے مکمل متن کے لئے دیکھیں Hussain Razzaqi, Lahore, 1970 اس مضمون کے علامہ اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالے سے تقابل کے لئے دیکھیں مقالہ کا اردو ترجمہ فلسفہ عجم از میر حسن الدین بی۔ اے ایل ایل بی جو نفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کیا۔ نیز علامہ کے مقالے پر پاکستان ٹائمز لاہور کے 20 اکتوبر 1967ء کے شمارے میں رفعت حسین کا عمدہ مضمون شائع ہوا۔
- (8) ہیگل کے فلسفہ پر علامہ اقبال اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں ”لا محدود کا محدود بن جانا اور خود تشکیل کردہ اختلافات کی ترکیب سے گزر کر خود کو دوبارہ پالینا چنانچہ کائنات کی زندگی لازم متضاد قوتوں کے مسلسل تصادم

سے عبارت ہے۔ "لسان العصر اکبر الہ بادی کے کلام میں ہیگلی فلسفے کی چاشنی۔ اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات، مترجم اقبال احمد صدیقی، اقبال اکادمی پاکستان، 1999ء ص: 183

(9) عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق ابتدا میں کلام تھا کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں (انجیل یوحنا 1:2)

(10) عبدالکریم جیلی ابن عربی کی طرح وحدت الوجود کے قائل تھے وہ کائنات کو خدا سے الگ اور خدا کو کائنات سے الگ قرار نہیں دیتے تھے یہ یونانی فلسفی فلوطیوس Philontus کا پیش رو یہودی فلسفی Philo تھا جس نے لوگوس Logos کلمہ یا آفاقی ذہن کو خدا اور کائنات کے درمیان ضروری واسطہ قرار دیا جو کائنات کی تکوین اور نوع انسان کی تخلیق کا باعث ہوا یہی تصور بعد میں عیسائی الہیات میں کلمہ اور ابن عربی کے افکار میں حقیقت محمدیہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ ابن عربی نے حقیقت محمدیہ کی صورت میں لوگوس کا تصور پیش کیا جو انجیلی کے انسان کامل میں موجود ہے یہ حقیقت محمدیہ جناب رسالت مآب ﷺ کی شخصیت نہیں بلکہ یزدانی قوت ہے جو تکوین عالم اور تخلیق آدم کا باعث بنی نیز ملاحظہ ہو

The Hegelian key to understanding Iqbal by Israr Ahmad Iqbal Review

Lahore, 1980.

(11) انڈین انٹرنی کیوری، بمبئی، ستمبر 1900ء، مرزا غلام احمد قادیانی، ازالہ اوہام، ضرورۃ الامام 1896ء

(12) ایضاً قادیانی نقطہ نظر کے مطابق کئی صوفیائے ثنائی الرسول کا درجہ پایا بروز یا نبوت محمدی کا انعکاس صرف مرزا صاحب کی ذات میں ہوا۔

(13) نسیم دعوت 81-82

(14) مرزا نیکل، حوالہ سابق ص: 97

(15) مرزا غلام احمد۔ ایک غلطی کا ازالہ، ص 3، 4

(16) دیگر اشعار اس باب میں درج ہیں

(17) غلام رسول مہر، سرور رفتہ ص 30

(18) ظفر اللہ خان، تحدیت نعمت، لاہور، ص: 123

(19) میر حامد سیالکوٹی۔ القول الفصل، مولوی محمد حسین ہالوی کے ریویو پر ریویو، پنجاب پریس سیالکوٹ

1892ء ص 3

(20) الحکم قادیان 17 جنوری 1903ء بحوالہ عبدالماجد اقبال اور احمدیت ص 58

- (21) ایضاً، ڈاکٹر گیان چند، ابتدائی کلام اقبال، ص: 163
- (22) ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، اقبال کی ابتدائی زندگی اقبال اکادمی پاکستان ص 254
- (23) مظلوم اقبال، ص: 191
- Molvi Muhammad Ali, Sir Mohammad Iqbal's Statement regarding (24)
- Qadianis, Ahmadiyya Anjuman, Lahore, 1935 p.6,7
- (25) مجدد اعظم جلد دوم دسمبر 1940ء ص 990
- (26) مرزا بشیر احمد، مسئلہ کفر، اسلام، مسئلہ جنازہ، وغیرہ
- مرزا محمود احمد، القول الفصل 1915، حقیقۃ الدعوۃ 1915، حقیقۃ الامر 1918 وغیرہ

علامہ اقبال پر انگریز نوازی کا الزام

قادیانی علامہ اقبال پر انگریزی حکومت کی مدح و توصیف میں نظمیں لکھنے اور انگریز سے سیاسی تعاون کرنے کے الزامات لگاتے ہیں۔ یہ الزامات سرکاری سطح پر نہیں لگائے جاتے یعنی قادیان، ربوہ، یا لاہور جماعت نے علامہ اقبال کو اس حوالے سے مطعون نہیں کیا کیونکہ ان کو اپنے گھر کے حالات کا مکمل علم تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ الزامات اپنے کارندوں (1) یا سیکولر اور سوشلسٹ عناصر کے ذریعے لگائے۔ شیخ عبدالماجد نے علامہ اقبال کے خلاف جو دو کتابیں لکھی ہیں انہیں انہوں نے ذاتی حیثیت سے شائع کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ (2) اس طرح انہوں نے اپنی جماعت کو انگریز پرستی کی بحث سے بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ آئیے ان الزامات کا جائزہ لیں۔

1۔ علامہ اقبال نے ایسی نظمیں اس عہد کے حالات، سیاسی تقاضوں اور بعض انگریز نواز احباب کے ایماء پر لکھیں۔ یہ ان کے سیاسی فکر کے ارتقاء کا ایک حصہ تھیں۔ بعد میں انہوں نے ان کو مسترد کرتے ہوئے اپنے مجموعہ کلام میں جگہ نہ دی۔ شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں۔

”علامہ اقبال نور اللہ مرقدہ کے متروکہ کلام کو بعض دانشوروں نے کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق اکٹھا کر کے شائع کیا۔ ان شیدایان اقبال نے ان مجموعوں میں وہ اشعار بہ التزام شریک کئے جو پہلی جنگ عظیم 18-1914ء میں انگریزی فتوحات سے متعلق علامہ اقبال کے قلم سے استعار کے خاندانی جگر گوشوں نے کہلوائے تھے۔ استبداد کا زمانہ تھا اور وہ اشعار محض ایات کا چرہ تھے۔ علامہ نے اگلا اور ٹھکرا دیا۔“ (3) ان کے اصل سیاسی افکار ان کے بعد کے کلام اور بیانات سے عیاں ہیں اور وہی ان کے حقیقی افکار ہیں اس لئے ان کی ابتدائی نظموں کو ان کے خلاف تنقید کے لئے جواز بنانا غیر ضروری ہے اور بددیانتی پر مبنی ہے۔ اگر وہ ہمیشہ ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے تو واقعی قابل اعتراض بات تھی۔

2۔ پنجاب کے اکثر سیاسی رہنما، جاگیردار اور زمیندار انگریز سے تعاون کر کے ان سے مالی مراعات حاصل کرتے تھے لیکن علامہ اقبال نے ایسا کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور فقیری میں نام پیدا کیا۔ اس عہد کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کو سامنے رکھ کر خلوص نیت سے انہوں نے ایک راہ متعین کی۔ اس میں انکے پیش نظر کسی کی خوشنودی یا مخالفت نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی معاشی و سیاسی فلاح تھی۔ وہ انگریز اور ہندوؤں کی سیاسی چالوں کا توڑ اسی میں سمجھتے تھے۔ آج ہم ان سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کی سوچ کو غیر دیاستدارانہ نہیں کہہ سکتے۔

ہم نے آئندہ صفحات میں علامہ اقبال کے سیاسی افکار اور ان کی نام نہاد انگریز نوازی کا قادیانیوں کی سیاسی پالیسی اور سامراج نوازی سے تقابل کر کے ان کے درمیان فرق بتایا ہے کیونکہ قادیانیوں کا انگریز سے ایک خصوصی تعلق رہا ہے جو ان کی مذہبی اور سیاسی روش کا ایک مستقل حصہ تھا۔

ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر علامہ اقبال کی نظم 1901ء

قادیانی علامہ اقبال کے ابتدائی دور کی بعض نظموں کو جنہیں انہوں نے بعد میں درخور اعتناء نہ سمجھا اور اپنے مجموعہ کلام میں جگہ نہ دی ان کی انگریز نوازی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ان میں سب سے پہلے 1901ء کی ایک نظم پیش کی جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے ایک نظم ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند کی وفات (22 جنوری، 1901ء) کے موقع پر لکھی یہ 110 اشعار پر مشتمل ایک ترکیب بند ہے جس کا عنوان اشک خون ہے۔ علامہ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں اسٹنٹ پروفیسر تھے۔ انہوں نے اس کا انگریزی ترجمہ Tears of Blood کے عنوان سے بھی کیا۔ حکومت نے اس کی کاپیاں طبع کر کے تقسیم کرائیں۔ (4) قادیانی علامہ اقبال کی اس نظم کو بنیاد بنا کر انہیں انگریز نواز ہونے کا الزام دیتے ہیں۔ مناسب تھا کہ وہ پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کی ان پچاس الماریوں پر نظر ڈالتے جو مرزا صاحب نے انگریز کی تعریف و توصیف اور برطانوی استعمار کی مدح و ستائش، جہاد کو حرام قرار دینے اور مسلمانوں کو برطانوی غلامی کا خوگر بنانے کے لئے تیار کیں۔ اس الماری سے دو کتب تحفہ قیصرہ اور ستارہ قیصرہ پیش کی جاتی ہیں۔

تحفہ قیصرہ 25 مئی 1897ء کو ملکہ وکٹوریہ کے دور اقتدار کی 60 سالہ جوبلی کے موقع پر تصنیف کی گئی اور اس کی کاپیاں پنجاب کے گورنر، وائسرائے ہند اور دیگر اعلیٰ حکام کو روانہ کی گئیں تاکہ برطانوی حکومت قادیان کے مغل خاندان اور مرزا صاحب کی مذہب کے پردے میں کی گئی سیاسی خدمات جلیلہ کو اچھی طرح جان سکے۔ اس کی ایک کاپی ملکہ وکٹوریہ کو بھیجوائی گئی۔ اس رسالے میں کہا گیا 'خدا کی جناب میں ہم دعا کرتے ہیں وہ ہماری ملکہ معظمہ قیصرہ کو جو اپنی رعایا کی مختلف اقوام کو کنار عافیت میں لئے ہوئے ہے جس کے ایک وجود سے کروڑہا انسانوں کو آرام پہنچ رہا ہے تادیر گاہ، سلامت رکھے اور ایسا ہو کہ یہ جلسہ جوبلی کی تقریب پر (جس کی خوشی سے کروڑ ہا دل برٹس انڈیا اور انگلستان کے جوش نشاط میں ان پھولوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں جو نسیم صبا کی ٹھنڈی ہوا سے شگفتہ ہو کر پرندوں کی طرح اپنے پروں کو ہلاتے ہیں) جس زور شور سے زمین مبارک بادی کے لئے اچھل رہی ہے ایسا ہی آسمان بھی اپنے آفتاب و ماہتاب اور تمام ستاروں کے ساتھ مبارک بادیاں دیوے۔' (5)

اس رسالے میں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

”اے قیصرہ و ملکہ معظمہ ہمارے دل تیرے لئے دعا کرتے ہوئے جناب الہی میں جھکتے ہیں اور ہماری رو میں تیرے اقبال اور سلامتی کے لئے حضرت احدیت میں سجدہ کرتی ہیں۔ اے اقبال مند اور قیصرہ ہند اس جوبلی کی تقریب پر ہم اپنے دل و جان سے تجھے مبارک باد دیتے ہیں اور خدا سے چاہتے ہیں کہ خدا تجھے ان نیکیوں کی بہت بہت جزا دے جو تجھ سے اور تیری بابرکت سلطنت سے اور تیرے امن پسند حکام سے ہمیں پہنچی ہیں۔ ہم تیرے وجود کو اس ملک کے لئے خدا کا ایک بڑا فضل سمجھتے ہیں اور ہم ان الفاظ کے نہ ملنے سے شرمندہ ہیں جن سے ہم اس شکر کو پورے طور پر ادا کر سکتے۔ ہر ایک دعا جو ایک سچا شکر گزار تیرے لئے کر سکتا ہے ہماری طرف سے تیرے حق میں قبول ہو۔ خدا تیری آنکھوں کو مرادوں کے ساتھ ٹھنڈی رکھے اور تیری عمر اور صحت اور سلامتی میں زیادہ سے زیادہ برکت دے اور تیرے اقبال کا سلسلہ ترقیات جاری رکھے اور تیری ذریت کو تیری

طرح اقبال کے دن دکھاوے اور فتح و ظفر عطا کرتا رہے۔ (6)

ملکہ وکٹوریہ کی شصت (ساٹھ) سالہ (ڈائمنڈ) جوبلی کے موقع پر قادیان میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ ایک الگ جلسہ احباب برتقریب جشن جوبلی بغرض دعا شکرگزاری جناب ملکہ معظمہ قیصرہ دام ظلہا ہوا جس میں چھ زبانوں۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی، پنجابی، پشتو میں دعا اور شکرگزاری کی تقریریں ہوئیں جس پر لوگوں نے بڑی خوشی سے آمین کے نعرے مارے۔ ان جلسوں میں اس بات پر خاص زور دیا گیا کہ اس گورنمنٹ کی پناہ اللہ کی پناہ ہے۔ (7)

اس رسالہ کے جواب میں ملکہ معظمہ کی طرف سے اظہار خوشنودی کا کوئی خط نہ پا کر 24 اگست 1899ء کو مرزا صاحب نے ستارہ قیصریہ کے نام سے ایک اور رسالہ تحریر کیا جس میں قیصرہ ہند کے عدل عام، رعایا پروری اور دادگستری کی تعریف کی اور کہا کہ انہیں تعجب ہے کہ ایک حکم شاہانہ سے بھی ممنون نہیں کیا گیا۔ اس بات پر افسوس کے بعد انہوں نے دوبارہ اپنے خاندان کی برطانوی حکومت کے لئے خدمات جلیلہ کا ذکر اور اپنی وفاداریوں کا تذکرہ کیا جو اس محسن گورنمنٹ کے لئے کی جا رہی تھیں جس کی نظیر برٹش انڈیا کا کوئی مسلمان نہیں دکھا سکا۔ وہ لکھتے ہیں:

”اے قیصرہ مبارکہ خدا تجھے سلامت رکھے اور تیری عمر اور اقبال اور کامرانی سے ہمارے دلوں کو خوشی پہنچا دے اس وقت تیرے عہد سلطنت میں جو نیک نیتی کے نور سے بھرا ہوا ہے مسیح موعود کا آنا خدا کی طرف سے یہ گواہی ہے کہ تمام سلاطین میں تیرا وجود امن پسندی اور حسن انتظام اور ہمدردی رعایا اور عدل اور دادگستری میں بڑھ کر ہے۔

سوائے ہماری پیاری قیصرہ ہند خدا تجھے دیرگاہ تک سلامت رکھے۔ تیری نیک نیتی اور رعایا کی گچی ہمدردی اس قیصرہ روم (جو مسیح کے وقت تھا) سے کم نہیں ہے۔

اے بابرکت قیصرہ ہند تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں جس پر تیری نگاہیں ہیں۔ خدائی رحمت کا ہاتھ اس رعایا پر ہے جس پر تیرا ہاتھ ہے۔“ (8)

یہ رسالہ ایسی دعاؤں، التجاؤں اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح و ستائش اور انگریزی راج کی تعریف و توصیف

سے پُر ہے جس کے سامنے اقبال کا مرثیہ بیچ دکھائی دیتا ہے۔ علامہ کا مرثیہ شاعری تھا یہ ایک نبی کے دل کی آواز اور اس کے ضمیر کا عکاس ہے۔ وہ محض لفظی اور شاعرانہ طرز کی مدح سرائی ہے لیکن یہ مرزا صاحب کے تاج برطانیہ کے لئے دل و جان سے نچھاور ہونے کا مرقع ہے۔ ان کے خلوص اور ان کی انگریز کے لئے شکرگزاری کا پرتو ہے جو اس وقت تک لوح عصر پر جگمگاتا رہے گا جب تک احمدیت باقی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس کلام کو خود مسترد کر دیا اور اپنے مجموعہ کلام میں اس کو کوئی جگہ نہ دی لیکن مرزا صاحب کی خدا کی وحی کی تائید سے لکھی گئی تحریریں آج تک چھپ رہی ہیں، ان کا نام روحانی خزائن رکھا گیا ہے۔ ان میں تبدیلی ممکن نہیں اور نہ ہی ان کو منسوخ سمجھا جاسکتا ہے۔ قادیانی ان کو اصل حالت میں برقرار رکھنے پر اتنے مصر ہیں کہ کسی کتاب میں درج غلط قرآنی آیات کی بھی تصحیح نہیں کرتے جن سے مرزا صاحب کی علیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے نیچے محض ایک فٹ نوٹ دے کر کاتب پر تمام الزام ڈال دیتے ہیں لیکن اس کا جواب نہیں دیتے کہ آیات نقل کرنے میں کاتب غلطی کر سکتا ہے لیکن ترجمہ کیوں کر غلط کیا گیا۔

ملکہ وکنوریہ کی وفات پر مرزا صاحب نے حکومت برطانیہ کو ایک تار دیا جس میں اپنی اور اپنے پیروکاروں کی طرف سے اس نقصان پر نہایت صدمہ اور دکھ کا اظہار کیا گیا جو ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کی وفات کے نتیجے میں حکومت برطانیہ کو ہوا۔ (9)

علامہ اقبال کی دیگر نظمیں اور تقاریر

قادیانی انگریزی حکومت سے علامہ اقبال کے تمام نہاد تعاون کے سلسلے میں ان کی 1902ء سے 1911ء تک کی مندرجہ ذیل نظمیں اور ایک تحریر پیش کرتے ہیں۔

- 1۔ 1902ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال نے ایک نظم میں انگریز حکمرانوں کو قصر عدل کا معمار کہا۔ انہوں نے یہ نظم بعنوان خیر مقدم انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ 23-21 فروری 1902ء لیفٹیننٹ گورنر پنجاب میکورٹھ یگ کی موجودگی میں پڑھی۔

2- 1910ء میں پنجاب کے ایک شاعر رحمت علی نے انگریز کی تعریف پر مشتمل اپنا مجموعہ کلام وفائے رحمت شائع کیا اس کے علمی و ادبی معاونین میں علامہ اقبال کا نام ٹائٹل پیج پر موجود ہے اور ان کی علمی و ادبی معاونت پر ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

3- برطانوی شہنشاہہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے سلسلے میں یکم اپریل 1911 کو یونیورسٹی ہال لاہور میں پنجاب پرائشل مسلم لیگ کی طرف سے 48 اراکین نے وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ کو ایک پاس نامہ پیش کیا۔ اقبال پنجاب مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے وہ اس وفد میں شامل تھے۔

4- جشن تاجپوشی کے سلسلے میں 22 جون 1911ء کو شاہی قلعہ لاہور میں ایک جلسہ ہوا جس میں علامہ اقبال نے ایک تقریر کی۔ انہوں نے کہا مسلمان ہندوستان میں باقی ممالک کے مقابلے میں امن و امان کی زندگی بسر کر رہے ہیں صرف مراعات حاصل کرنے کے لئے سرکار کے وفادار نہیں بلکہ وہ مذہباً بادشاہ وقت کے وفادار ہیں۔ مسلمانوں کا آئینہ سلطنت نہیں بلکہ اپنے دین کو زیادہ سے زیادہ پھیلاتا ہے اور حکومت انگریزی میں اس کی اجازت ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے افریقہ کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک انگریز افسر نے وہاں کے باشندوں کو مہذب بنانے کے لئے ان میں اسلامی واعظ بھیجنے کی ہدایت کی۔ (10)

قادیانی، سیکولرسٹ اور ایک زمانے میں کمیونسٹ ان نظموں کو اقبال کی انگریز نوازی پر محمول کرتے تھے۔ دراصل اقبال انگریز سے براہ راست تصادم کو مسلمانوں کے مجموعی مفاد اور ان کی سیاسی اور معاشی ترقی کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز سے تعاون کی پالیسی سے وہ ہندوؤں کی سیاسی چالوں اور ان کی اقتصادی برتری کا مقابلہ کر سکیں گے اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کر سکیں گے۔ شروع میں ہندوستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کانگریس اور مسلم لیگ کی پالیسی بھی انگریزی حکومت سے تعاون اور سیاسی حقوق و مراعات کے حصول پر مبنی تھی۔ علامہ اقبال ابھی تک باقاعدہ سیاست میں نہ آئے تھے انہوں نے اس عہد کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر مصلحتاً، مجبوراً اور اخلاقاً ایسے اشعار کہے جو ان کے سیاسی فکر کے ارتقاء کی نشاندہی کرتے تھے بعد

میں ان کے خیالات و نظریات بدل گئے۔ ہمارے نزدیک وہی ان کی سوچ کے اصل عکاس اور ان کا سرمایہ حیات ہیں اور ان ہی کو اہمیت حاصل ہے۔

ہم اب انگریز سے جماعت احمدیہ کے تعاون اور اس کی اطاعت کی سیاسی پالیسی اور علامہ اقبال کی ان اکادکات نظموں کا موازنہ پیش کرتے ہیں جن میں علامہ نے انگریز کے عدل و انصاف اور قیام امن کا ذکر کیا ہے۔

1- تحریک احمدیت ایک سیاسی تحریک تھی جس نے مذہبی ارتداد کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اس کا مقصد برطانیہ کے سیاسی عزائم کی ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر تکمیل و ترویج تھا خصوصاً مسلمانوں کی اس وقت کی عظیم سلطنت ترکی اس کا نشانہ تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے سامنے اسلامیان ہند کی کسی قسم کی آزادی کا کوئی تصور نہ تھا اور نہ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس کا ذکر یا مطالبہ کیا اور نہ اس کے لئے کوئی جدوجہد کی اور نہ ہی وہ ایسی جدوجہد کو پسند کرتے تھے۔ وہ برطانوی حکومت کو خدا کے حکم کے تحت نعمت خداوندی قرار دیتے تھے اور اس کے سایہ تلے ابدالاً باد تک رہنا چاہتے تھے۔ وہ مسلم لیگ اور کانگریس کے مخالف تھے۔ (11)

2- مسلمان اکابر جنہوں نے انگریز سے تعاون کا درس دیا یہ ان کی ذاتی سوچ اور اس وقت کے سیاسی حالات کا پرتو تھا جس کو غلط قرار دینے کا ہمیں حق حاصل ہے اور ان کی اس روش پر ہم تنقید کر سکتے ہیں، لیکن مرزا صاحب نے وحی خداوندی کی رو سے برطانوی سامراج کے ہندوستان میں غلبہ و تسلط کو جائز قرار دیا اور خدا کے حکم کے تحت برطانوی حکومت کی اطاعت کا درس دیا۔ اسی میں ان کی تحریک کی بقا مضمر تھی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انگریز کے تسلط کو الہی تقدیر اور مشیت ایزدی قرار دیتے تھے۔

3- مرزا صاحب کی جانب سے جہاد کی تبلیغ ایک ایسا امتیازی وصف ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی سیاسی رہنما یا جماعت میں نہیں مل سکتی اس کا خود مرزا صاحب نے اقرار کیا ہے۔ (12) انہوں نے جہاد کو جس کا ایک پہلو برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد تھا مکمل حرام

قرار دیا اور اپنی وحی کی رو سے اس کی تنبیخ کی۔ اگر یہ مانا جائے کہ ہندوستان میں کسی نوع کے دینی جواز کے تحت جہاد منع تھا تو دنیا کے اسلامی ممالک میں جہاں یورپی سامراج مسلمانوں کی آزادی پر ڈاکہ ڈال رہا تھا اور مسلمانوں کی واحد سلطنت عثمانیہ کو تاخت و تاراج کر رہا تھا وہاں جہاد کی ممانعت اور انگریز کی اطاعت اور وفاداری کے درس پر مبنی منوں لٹریچر تقسیم کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

4۔ مرزا صاحب نے ہندوستان کی غلامی اور اسلامی ممالک کی تباہی کو اپنی نبوت اور صداقت کی دلیل بتایا اور دنیا کے مختلف حصوں (جن میں دور دراز افریقہ شامل تھا) میں برطانوی حکمرانی اور تسلط کو اپنی ذاتِ بابرکات اور دعاؤں کا شرہ قرار دیا اور اپنے آپ کو سلطنتِ برطانیہ کی ترقی و سلامتی کا تعویذ قرار دیا اور کہا جس طرف ان کا منہ ہوتا ہے ادھر ہی برطانیہ کو فتوحات حاصل ہوتی ہیں۔ (13)

5۔ 1880ء سے 1908ء تک کے 28 سالوں میں مرزا صاحب نے 80 کے قریب کتابیں لکھیں اور اپنی وحی، الہامات، کشوف و رویاء کے انبار لگا دیئے۔ حیرت ہے کہ ان کو کوئی الہام انگریز کی حاکمیت اور ان کے سیاسی تسلط کے خلاف نہ ہوا۔ (14) اس سے مرزا صاحب کے دعاوی کی غرض و غایت اور تحریک احمدیت کا سیاسی مزاج عیاں ہو جاتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ انہوں نے انگریز کے سیاسی اقتدار کی بقا کے لئے وحی کی سند مہیا کی۔

قادیانی ایڈریس

جہاں تک قادیانیوں کے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ یکم اپریل 1911ء کو پنجاب پر دو انشل مسلم لیگ کے جن 148 اراکین نے وائسرائے لارڈ ہارنگ کی آمد پر ایک سپانامہ پیش کیا علامہ اقبال ان میں شامل تھے تو عرض ہے کہ وہ 1910ء سے صوبائی مسلم لیگ کے اسٹنٹ سکریٹری چلے آ رہے تھے۔ (15) اگر شیخ عبدالماجد پسند فرمائیں تو ہم پنجاب کے لیقنٹ گورنروں اور وائسیران ہند کے حضور مقتدر قادیانی حضرات کے ایڈریسوں کا متن پیش کر دیں جن میں جماعت

احمدیہ کے تعارف کے علاوہ برطانوی اقتدار کے استحکام میں قادیانیوں کی خدمات کا ذکر ہے۔ یہ ان عرصہ اشتوتوں کے علاوہ مواد ہے جو مرزا صاحب اپنے زمانے میں انگریز حکام کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔

علامہ اقبال کی نظم 'پنجاب کا جواب'

جنگ عظیم اول 1914ء تا 1918ء کے آخری سال میں علامہ اقبال نے یونیورسٹی ہال لاہور کے ایک سرکاری مشاعرہ میں 9 بند پر مشتمل ایک مسدس پڑھی جو "باقیات اقبال" میں 'پنجاب کا جواب' کے نام سے درج ہے۔ یہ مسدس نواب ذوالفقار علی خان کی وساطت سے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈائر کی فرمائش پر لکھی گئی۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ 1918ء میں اوڈائر نے اقبال سے یہ خاص نظم لکھنے اور مشاعرے میں آنے کی فرمائش کی تھی تو زمانہ (جنگ عظیم اول) ایسا نازک تھا اور اس فرمائش کو ٹالنے کی کوئی صورت نہ تھی لہذا اقبال نے یہ نظم لکھی اور خود مشاعرے میں جا کر پڑھی اور 11 مئی 1918ء کے اخبار وکیل امرتسر میں شائع ہوئی۔ (17)

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ انگریز کے پشتیبانی وفاداروں نے علامہ اقبال کے خلوص، ان کی دوستی اور مروت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر یہ نظمیں حاصل کیں۔ اس بات کو قادیانی اچھالتے ہیں جو جنگ عظیم اول کے دوران برطانوی حکومت کے زبردست حامی تھے، جنگی فنڈ میں رقومات جمع کر کے بھجواتے تھے، بھرتی دیتے تھے، جلسے کرتے تھے، دن رات اتحادی افواج کی فتح کے لئے دعائیں کرتے تھے اور یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ جن اسلامی و غیر اسلامی ممالک میں برطانوی راج قائم ہوگا وہاں احمدیت کی تبلیغ کے دروازے کھل جائیں گے۔ زمانہ جنگ میں انہوں نے ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر انگریز کی جاسوسی کا فریضہ انجام دیا اور سقوط بغداد، فلسطین وغیرہ پر جشن منائے۔ (18)

علامہ اقبال کو سر کا خطاب 1923ء

یکم جنوری 1923ء کو علامہ اقبال کو اردو اور فارسی کے عظیم شاعر ہونے اور ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت نے سر کا خطاب دیا۔ ان کی کتاب ”اسرار خودی“ پر امریکہ اور یورپ میں کئی ریویو شائع ہو چکے تھے اور ان کو عالمی سطح پر شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ علامہ کو ایسے خطابوں سے دلچسپی نہ تھی۔ ایسے خطابات انگریز حکومت کی تابعداری کے سلسلے میں کئی مسلمانوں نے حاصل کئے لیکن کسی نے کوئی تنقید نہ کی۔ اقبال کو علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے جب سر کا خطاب ملا تو مولانا ظفر علی خان اور عبد المجید سالک جیسے صحافیوں نے مخالفانہ نظمیں لکھیں۔ (19) میر سید غلام بھیک نیرنگ نے علامہ اقبال کو ایک خط لکھا کہ اس خطاب کے بعد شاید اب آپ آزادی اظہار سے کام نہ لے سکیں۔ جس کے جواب میں علامہ اقبال نے 4 جنوری 1923ء کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

”میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے ”فروت“ ہیں سینکڑوں خطوط اور تار آئے اور آرہے ہیں مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا سو قسم خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان بالغیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی انشاء اللہ..... اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔“ (20)

شیخ عبد الماجد علامہ اقبال کو سر کا خطاب ملنے کو انگریز کی خدمات کا صلہ بتاتے ہیں حالانکہ یہ بات غلط ہے لیکن سر ظفر اللہ جو سر کا خطاب ملا اور جوان کی زبردست برطانیہ نوازی، سرکار کے لئے خدمات اور سر فضل حسین کے سیاسی گماشتے کے طور پر ہندوستان اور لندن میں دوڑ دھوپ کا نتیجہ تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ برطانوی سامراج کے نفس ناطقہ سر ظفر اللہ کو سر کا خطاب مئی 1935ء میں ملا تو قادیان میں فتح کے شادیانے بجائے گئے اور اسے حکومت برطانیہ کی طرف

سے جماعت احمدیہ کی قدر افزائی اور ان کی خدمات جلیلہ کا ثمرہ قرار دیا گیا۔ ”الفضل“ جماعت احمدیہ کا پہلا سر“ کے عنوان سے لکھتا ہے کہ حکومت نے چوہدری ظفر اللہ خان کو نائٹ ہڈ کا خطاب دیا ہے۔ ملک معظم کے یوم ولادت اور سلور جوبلی کی تقریب پر جو خطابات دیئے گئے ان میں نائٹ ہڈ کا خطاب پنجاب سے تعلق رکھنے والے دو معززین کو دیا گیا ایک چوہدری ظفر اللہ خان صاحب ہیں اور دوسرے مسٹر جسٹس ایڈوکیٹ جج ہائی کورٹ لاہور۔ آپ (ظفر اللہ خان) پہلے احمدی ہیں جنہیں خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ (21)

کیا ظفر اللہ کو سر کا خطاب برطانیہ سے بھرپور تعاون اور ان کی پالیسیوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی انتھک جدوجہد کے نتیجے میں نہیں ملا؟ کیا وہ کوئی علمی ادبی شخصیت کے مالک تھے جو اس کے حقدار قرار پائے؟ کیا 1935ء میں ان کی کوئی لافانی تصنیف موجود تھی جسے بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہو؟ کیا انہوں نے کوئی گیتا انجلی تصنیف کی؟ آخر وہ کیا خدمات جلیلہ ہیں جن کا انہیں یہ صلہ انگریز کی طرف سے دیا گیا۔ ان کو سر کا خطاب ملنے پر قادیان میں شکر گزاری کے گیت گائے گئے اور مرزا محمود نے گورنر پنجاب، وائسرائے ہند اور سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہند کو شکریہ کے تار دیئے اور اسے جماعت احمدیہ کی عزت افزائی قرار دیا۔

شہنشاہ برطانیہ کی سلور جوبلی 1935ء فنڈ میں چندہ

6 مئی 1935ء کو ہندوستان میں جاری پنجم ملک معظم برطانیہ کی تخت نشینی کی سلور جوبلی منائی گئی۔ گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن نے ایک سلور جوبلی فنڈ قائم کیا اور اہل پنجاب سے اپیل کی کہ وہ اس میں چندہ دیں۔ علامہ اقبال نے اس فنڈ میں سو روپیہ چندہ دیا۔ شیخ عبدالماجد نے اس بات کو بھی علامہ اقبال کی انگریز نوازی کی دلیل کے طور پر پیش کر کے الزام تراشی کی ہے۔ (22) لیکن وہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ اسی سلور جوبلی کی تقریبات پر سرکار پرستوں کو ان کی خدمات جلیلہ کے صلے میں خطابات دیئے گئے جن میں ظفر اللہ کو سر کا خطاب ملا اور پھر ملک معظم کی سلور جوبلی منانے والی ہندوستانی جماعتوں میں قادیانی پیش پیش تھے اور انہوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہم

الفضل قادیان کے ایک ادارے کا عکس شائع کر رہے ہیں جس میں قادیانیوں سے کہا گیا ہے کہ جیسے مرزا غلام احمد نے ایسے موقعوں پر حکومت برطانیہ کی شکر گزاری، اس کے استحکام و ترقی کے لئے دعائیں کیں اور چندہ جمع کیا تھا ایسے ہی اب کیا جائے۔ الفضل نے اپیل کی کہ ہر احمدی اپنی آمدنی سے جو بلی فنڈ میں چندہ دے اور نظارت بیت المال حتی المقدور اس میں شریک ہو۔ یہ ملک معظم سے اظہار وفاداری کا ایک عمدہ موقع ہے اور یہی حضرت مرزا صاحب کا اسوۂ حسنہ اور طریقہ ہے۔ (23)

ہائی کورٹ کی ججی (1925ء) اور علامہ اقبال

علامہ اقبال کے قادیانی نقاد ان کے ہائی کورٹ کا جج نہ بننے کے واقعے کو ان کے خلاف پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ (24) 1925ء میں سرشادی لال ہائی کورٹ کا چیف جج تھا۔ اس زمانے میں ایک مسلمان جج کے ہائی کورٹ میں تقرر کا مسئلہ اٹھا ہندوستان کی اسلامی انجمنوں، نامور وکلاء، اخبارات اور تعلیم یافتہ طبقے نے ڈاکٹر اقبال کی بے نظیر علمی قابلیت اور قانونی معاملات میں ان کی بہترین لیاقت کے باعث ان کا نام تجویز کیا۔ سرشادی لال نے اپنے مذہبی تعصب کی بناء پر کہا کہ وہ اقبال کو محض ایک فلسفی اور شاعر کے طور پر جانتے ہیں، چنانچہ اس نے ان کی جگہ اپنی مرضی کے آدمی یعنی یو پی کے سید آغا حیدر کو جج مقرر کر دیا۔

خالد لطیف گابا (کے ایل گابا) جو ہندو سے مسلمان ہوئے اور خود ایک اعلیٰ درجے کے وکیل تھے، اپنی سوانح عمری میں شادی لال کے تعصب اور کینہ پروری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جج بننا علامہ اقبال کا حق تھا۔ (25)

در اصل سرمیاں شفیق شادی لال کے مربی تھے لیکن جب وہ لاہور ہائی کورٹ کا جج بن گیا تو ان کے خلاف ہو گیا۔ وہ سر شفیق کے داماد شاہ نواز سے دشمنی نکالنے کے لئے علامہ اقبال کو استعمال کرنا چاہتا تھا جس سے انہوں نے انکار کر دیا اور دل برداشتہ ہو کر انڈین کونسل آف سٹیفنس کے ممبر سر جے پی تھاپسن کو 17 کتوبر 1925ء کو خط لکھا کہ کشمیر سٹیٹ کونسل کی رکنیت دلانے میں ان کی مدد

کی جائے کیونکہ لاہور ہائی کورٹ میں جج کی تقرری کے مسئلہ پر مسلم پریس نے جو احتجاج کیا اور کرے گی اس سے انہیں نقصان کا اندیشہ ہے اور ایک وکیل کی حیثیت سے ان کا کام مشکل ہو جائے گا۔ تھامسن نے 22 اکتوبر 1925ء کو جواب دیا کہ حکومت کی یہ پالیسی نہیں کہ ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کرے، پالن پور کے نواب مہاراجہ کشمیر کے دوست ہیں اگر وہ ان کو کہیں اور پھر حکومت ہند کا مشورہ مانگا گیا تو وہ ان کی درخواست کا خیال رکھے گا۔

ہندوستان کے نابینا مصنف وید مہتہ شادی لال کے دوست تھے انہوں نے اپنی یادداشتوں میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح شادی لال نے علامہ اقبال اور شاہ نواز کو ایک دوسرے کے خلاف اکسا کر ان کو ججی کے عہدے سے محروم کیا اور اپنی مرضی کا جج مقرر کر دیا۔ (26)

علامہ اقبال تمام تر اہلیت کے باوجود ایسے منصب کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کے حق میں نہ تھے وہ قناعت پسند تھے۔ انہوں نے عام سیاسی رہنماؤں کی طرح نہ گورنروں اور وائسرائے سے ملاقاتیں کیں نہ ان کی دی گئی ضیافتوں میں شرکت کی اور نہ ہی ان کی کاسہ لیلی کی۔ جج کا عہدہ ان کا حق تھا جس سے انہیں ایک سازش کے تحت محروم کر دیا گیا۔

قادیانی اس واقعہ کا موازنہ سر ظفر اللہ کے جج مقرر کئے جانے کی سرکاری پیش کشوں سے کرتے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو سر ظفر اللہ کا رویہ کہ وہ ہائی کورٹ کی ججی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے جب کہ علامہ اقبال اس میں دلچسپی رکھتے تھے۔ سر ظفر اللہ لکھتے ہیں کہ 1934ء میں سر شادی لال نے چوہدری شہاب الدین سے کہا کہ وہ اس معاملے میں ظفر اللہ کی رائے لیں کیونکہ ہائی کورٹ میں ایک جج کی اسامی خالی ہو رہی ہے لیکن سر ظفر اللہ نے انکار کر دیا۔ اس زمانے میں وائسرائے نے ان کو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بننے کی پیش کش کی لیکن وہ نہ مانے۔ ”تحدیثِ نعمت“ میں انہوں نے ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ (27) قادیانی اخبارات و رسائل علامہ اقبال کے جج نہ بننے کے واقعہ (1925ء) سے اس کا مقابل کرتے ہیں (28) جو حقائق کے خلاف ہے۔

شاید قادیانی ناقدین کو معلوم نہیں کہ اس زمانے میں سر ظفر اللہ کی نظر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر یعنی وزیر بننے پر لگی ہوئی تھی اس کے لئے وہ اندرون خانہ لندن اور دہلی میں لاٹنگ کر رہے تھے۔ ان حالات میں وہ ان عہدوں کو کیسے قبول کر لیتے؟

قادیانی معترضین کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ راجپال کے مقدمے 1927ء میں سر ظفر اللہ نے آؤٹ لک کے قادیانی ایڈیٹر دلاور بخاری کی وکالت کی۔ ہائی کورٹ کے جج جسٹس دلیپ سنگھ (عیسائی) کے استعفیٰ کے لئے قادیانیوں نے ایک مہم شروع کر رکھی تھی۔ مرزا محمود احمد نے ایک تجویز پیش کی کہ ایک وفد گورنر پنجاب سے ملے جس میں قادیانی زعمائیت تمام فرقوں کے رہنما شامل ہوں اور بخاری کی رہائی کا مطالبہ کرے دوسرے پنجاب، سرحد وغیرہ کے پانچ لاکھ افراد کے دستخطوں سے ایک میمورنڈم انہیں پیش کیا جائے جس میں کہا جائے کہ جسٹس دلیپ سنگھ کی جگہ پنجاب سے ایک بیرسٹر کو جج بنایا جائے جو مستقل جج ہو اور سر شادی لال کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس کو out of turn seniority دے کر چیف جسٹس ہائی کورٹ مقرر کیا جائے۔ (29) یہ تمام تنگ و دو سر ظفر اللہ کو لاہور ہائی کورٹ کا جج یا چیف جسٹس بنوانے کے لئے کی گئی۔ لاہور جماعت کے ایک سرکردہ رکن مرزا سلطان احمد نے اسے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ (30)

جماعتِ محمدیہ کا پہلا نمبر

جناب دہری ظفر اللہ صاحب کو تائید و تحکک خط

ملک مسلم کے یوم ولادت اور میلہ جو ملی کی قریب ہر دو خطابات لیئے گئے ہیں۔ ان میں سے
ایک بڑے کا خطاب بہاب سے تعلق رکھنے والے دو مسخرین کو دیا گیا ہے جن میں سے ایک بہاب
جو دہریہ خضر افسانہ صاحب ہیں۔ اور دوسرے مسخر ہیں مبینہ جی ائی کورٹ لاہور۔
میں اس حرکت افزائی پر جناب جو دہریہ صاحب کو موت کی خدمت میں جہالت تھمک کر حرکت دینا بلکہ
چین کر اٹھنے دے گا کرتے ہیں کہ خدا انہیں پیش از پیش انعامات کا معبود بنائے۔ اعلان
کا ہر اعتراض نام مسلم قانون اور ملک کے لئے بابرکت کرے۔
آپ پیسے احمدی ہیں۔ جنہیں خدا انہیں کے فضل سے یہ احزاب حاصل ہوا۔ اور ہم کہہ سکتے
ہیں کہ جناب جو دہریہ صاحب کی ذمت میں طرح تر قیات کے دوسرے شعبوں میں ہمارا
جماعت کے نو جوانوں کے لئے قابل فخر نمونہ ہے۔ اسی طرح ان کا بیٹا انکی مناسبت کی پیش کردہ

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

آنریبل سرچودھری ظفر اللہ خاں صاحب کی کونسل میں منتقل تقرر

[illegible]

حوالے و حواشی

- 1 ہفت روزہ لاہور، لاہور جس کے ایڈیٹر ثاقب زیدی ہیں اس مہم میں پیش پیش رہا ہے۔
- 2 شیخ عبدالماجد فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 2
- 3 چٹان لاہور، 8 اپریل 1974ء
- (4) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ: ص 115، 116
- (5) مرزا غلام احمد، تحفہ قیصرہ، ٹائٹل
- (6) تحفہ قیصرہ، ص 9
- (7) جلسہ جوہلی شصت سالہ حضرت قیصرہ، دام ظلہا مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ششم مؤلفہ میر قاسم علی قادیانی
- قادیان، صفحات 128، 129
- (8) مرزا غلام احمد قادیانی ستارہ قیصریہ ص 8
- (9) بشیر احمد، تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ لاہور ص 72
- (10) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ، صفحات 113 تا 144 اور اقبال اور احمدیت باب نمبر 4،
- صفحات 109 تا 123
- (11) مرزا محمود احمد، سیرت مسیح موعود، ربوہ ص 74
- (12) تبلیغ رسالت جلد ششم، مؤلف میر قاسم علی، قادیان حاشیہ ص 69 مرزا صاحب کا ایڈریس بنام ملکہ
- و کٹوریہ، وائسرائے ہند، لیفٹیننٹ گورنر پنجاب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد سوم ص 196
- (13) مرزا غلام احمد، نور الحق، ص 33
- (14) بعض قادیانی کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کا ایک الہام ہے سلطنت برطانیہ تا ہشت سال یعنی آٹھ سال
- بعد سلطنت برطانیہ میں ضعف و اختلال آجائے گا لیکن مرزا صاحب نے ایسے الہام کی موجودگی کی
- نہایت سختی کے ساتھ اپنے رسالے کشف الغطاء 1898ء میں تردید کی ہے، بلکہ یہ رسالہ اسی غرض
- کے لئے لکھا گیا تھا۔

- (15) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 113-114
- (16) تبلیغ رسالت، جلد اول تا دہم، مؤلفہ قاسم علی قادیان
- (17) غلام رسول مہر، سرور رفتہ، 1959ء ص: 55-57
- (18) الفضل قادیان، 7 دسمبر 1918ء، اور 9 مارچ 1918ء۔ بشیر احمد، تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ باب پنجم
- (19) سالک نے ذکر اقبال میں اس پر اظہار مذامت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے چند دن بعد جب وہ اقبال سے ملے تو انہوں نے ویسا ہی محبت آمیز سلوک کیا۔ ص: 22
- (20) محمد حنیف شاہد، مفکر پاکستان، ص: 266
- (21) الفضل، قادیان 5 جون 1935ء
- (22) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ، ص: 120
- (23) الفضل قادیان، 7 اپریل 1935ء
- (24) ہفت روزہ لاہور، لاہور 13 اکتوبر، 1982ء
- (25) کے ایل گابا، فرینڈز اینڈ فوز، پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور، 164
- (26) زندہ رود حصہ دوم ص: 286، نیویارکر، 23 جولائی، 1979ء
- (27) سر ظفر اللہ، تحدیث نعمت، 345
- (28) ہفت روزہ لاہور، لاہور 13 اکتوبر، 1982ء
- (29) الفضل، قادیان، 5 جولائی اور 22 جولائی، 1927ء
- (30) مرزا سلطان احمد، انکشاف حقیقت، احمدیہ انجمن پشاور، 1929ء ص: 7

باب 4

علامہ اقبال کے حکیم نور الدین اور جماعت احمدیہ لاہور سے تعلقات

علامہ اقبال کے حکیم نور الدین بھیروی خلیفہ قادیان اور جماعت احمدیہ لاہور کے سرکردہ افراد خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر بشارت احمد، مولوی محمد علی، ڈاکٹر محمد حسین، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ وغیرہ سے دوستانہ تعلقات کا بہت چرچا کیا جاتا ہے۔ قادیانی ان تعلقات کی بناء پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ علامہ اقبال اگر مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوؤں کی صداقت پر یقین نہ رکھتے تھے تو ان کی تکذیب و تکفیر بھی نہیں کرتے تھے اور اپنے دل میں تحریک احمدیت کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے اور اس تحریک کے بعض پہلوؤں سے متاثر تھے جیسے تبلیغ اسلام۔ ہم ان امور کا جائزہ لیتے ہیں۔

جولائی 1908ء میں جب علامہ اقبال یورپ سے واپس وطن لوٹے تو اسی سال 26 مئی 1908ء کو مرزا صاحب وفات پا چکے تھے اور حکیم نور الدین قادیانی جماعت کے خلیفہ بن گئے تھے۔ حکیم صاحب علامہ اقبال کے استاد میر حسن کے قریبی دوست تھے اور میر صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ (1) اس لحاظ سے علامہ اقبال بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

حکیم نور الدین کا تعارف

حکیم نور الدین (1841-1914) کا تعلق بھیرہ سرگودھا سے تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ دینی تعلیم رامپور، دہلی اور لکھنؤ میں حاصل کی، 6-1865ء میں حج کیا اور بھیرہ میں مطب کھولا۔ طب یونانی اور تشخیص علاج میں وہ ماہر تھے ان کی بیاض آج بھی اطباء میں مقبول ہے۔ 1877ء میں دہلی دربار میں شرکت کی جس میں ملکہ وکٹوریہ کو قیصرہ ہند کا خطاب دیا گیا۔ نارٹل سکول (موجودہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول) باغ سرداراں راولپنڈی میں مدرس رہے پھر کشمیر میں شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ (2) 1885ء میں مرزا صاحب کا ایک اشتہار پڑھ کر قادیان گئے اور 23 مارچ 1889ء کو جب مرزا صاحب نے بیعت لینے کی ابتداء کی تو انہوں نے سب سے پہلے بیعت کی۔

انہوں نے عیسائیت کے رد میں ایک کتاب 'فصل الخطاب' لکھی اور 1890ء میں پنڈت لکھرام آریہ کی کتاب 'تکذیب براہین احمدیہ' کا رد تصدیق براہین احمدیہ لکھا۔ 1892ء میں ان پر سیاسی سازش کا الزام لگا کہ وہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو اقتدار سے ہٹا کر امر سنگھ کو برطانوی ریڈیڈنٹ مقیم کشمیر کے اشارے پر برسر اقتدار لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ (3) ان کو ریاست سے نکال دیا گیا۔ ریاست سے نکلنے وقت ان کے ذمہ دو لاکھ روپے کا قرضہ تھا۔ راجہ امر سنگھ نے ان کو ایک بڑا سرکاری کنڑیکٹ دلوا کر اس قرضے کو ادا کر دیا۔ 1892ء میں حکیم صاحب قادیان آ گئے ان کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں بہت نادر اور نایاب کتب تھیں وہ تحریک احمدیت سے وابستہ ہو گئے۔ مرزا صاحب نے ان کی اطاعت شعاری اور شخصی خلوص مندی کی بہت تعریف کی ہے اور کہا کہ وہ دو فرشتے جن کے کندھوں پر مسیح موعود کے نزول کا احادیث میں ذکر ہے ان میں ایک حکیم نور الدین اور دوسرے مولوی احسن امر وہوی ہیں۔ امر وہوی صاحب 1917ء میں لاہوری جماعت کے ساتھ مل گئے تھے۔ مرزا صاحب حکیم صاحب کو صدیقیت کے درجے پر فائز قرار دیتے تھے اور ان کو خدا کی آیات میں سے ایک آیت کہتے تھے (4)

انہوں نے مرزا صاحب کی زندگی میں نہایت خلوص سے ان کا ساتھ دیا اور ان کے ہر حکم پر لبیک کہا اس لئے مرزا صاحب نے ان کے متعلق ایک فارسی شعر کہا ہے جس کا مطلب ہے اگر میری جماعت کا ہر فرد نور دین بن جائے تو کیا ہی اچھا ہو یہ تبھی ہو سکتا ہے جبکہ ہر ایک دل نور دین کی طرح یقین کے نور سے بھر جائے۔ حکیم صاحب مرزا صاحب کی کتب کے پروف پڑھنے اور انکے لیے حوالے تلاش کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی اس کاوش کا مرزا صاحب کی کتب کے عمومی معیار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حکیم صاحب کی ہدایت پر انگریزی میں قرآن کے ترجمے اور تفسیر کا کام مولوی محمد علی مدیر ریویو آف ریلی جنز کو سونپا گیا وہ ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ انگریزی وہ جانتے نہیں تھے اس لئے جہاں کہیں ضرورت پڑتی وہ اردو میں تفسیری نوٹ لکھا دیتے یا زبانی ہدایات دے دیتے۔ ترجمہ کا زیادہ اور اصل کام مولوی محمد علی نے خود کیا جو 1917ء میں لاہور

سے شائع ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی طرف سے غلام سرور، عبداللہ یوسف علی اور پکٹھال کے انگریزی تراجم قرآن شائع ہوئے۔ مولوی محمد علی کا ترجمہ قرآن اور تفسیر (اردو) 1923ء میں بیان القرآن کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔ اس پر اور لوگوں کے علاوہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب قادیانیت میں بہت سے اعتراضات کئے ہیں ویسے بھی اس میں نیچری خیالات کا غلبہ ہے جیسا کہ سرسید کی روش تھی۔ حکیم صاحب کے چھ سالہ دور خلافت میں ان کی جماعت کو دی گئی مختصر ہدایات، سوالات کے جوابات اور تقاریر اس وقت کے اخبارات، الحکم، بدر، نور، الحق اور رسالہ احمدی میں شائع ہوئیں۔ الفضل ان کی وفات سے تقریباً ایک سال قبل مرزا محمود نے 1913ء میں قادیان سے جاری کیا تھا۔ مولوی محمد علی نے اختلاف سلسلہ (1914ء) کے بعد لاہور سے قرآن مجید کے اردو اور انگریزی تراجم شائع کئے جو قادیان میں تیار کئے گئے تھے۔

ہم حکیم صاحب کے خطبات، تقاریر، ملفوظات وغیرہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان میں احمدیہ مسلک سے متعلق عام معلومات، نبوت، کفر، وفات مسیح، آمد مہدی، ضرورت وحی والہام وغیرہ کے علاوہ کوئی خاص بات نظر نہیں آتی انہوں نے کوئی ایسی عظیم تصنیف اہل ہند کے سامنے پیش نہیں کی جس سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ لگایا جاسکے نہ کوئی ایسی نمایاں اور اچھوتی کتاب سامنے آئی جس کی غیر جانبدار اہل علم نے تعریف کی ہو یا اس کو علمی دنیا میں مقبولیت حاصل ہوئی ہو اور اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہوں۔ اسی طرح روایتی موضوعات سے ہٹ کر ان کی کوئی ایسی تقریر بھی نہیں جسے غیر جانبدار اہل علم یا غیر مسلم دانشوروں نے سراہا ہو۔ اگر یہی حقیقت ہے تو پھر نور الدین کا کیا علمی و دینی مقام تھا۔ محض مرزا غلام احمد کی تابعداری اور قادیانی خلافت کی گدی پر آمر مطلق کے طور پر براجمان ہونا انہیں علم و فضل اور دینی مسائل سے آگاہی کے اعلیٰ مقام پر فائز نہیں کر دیتا۔ نہ جانے ڈاکٹر اقبال کی یہ انکساری تھی یا ان کے استاد میر حسن سے حکیم صاحب کی گہری دوستی تھی یا ان کا حکیم صاحب کے بارے میں حسن ظن تھا یا قادیانی پروپیگنڈے کے زور پر ان کا ایک ایسا امیج بنا دیا گیا تھا کہ وہ ان کے علم و فضل کے قائل ہو گئے تھے۔ حکیم صاحب کا اتنا بڑا

علمی مقام ہو یا نہ ہو علامہ اقبال نے ایک دو سوال پوچھ کر ان کو صاحب علم و حکمت اور ایک ممتاز فقیہ کی صف میں کھڑا کر دیا جیسا کہ قادیانیوں کا دعویٰ ہے۔ البتہ ان کی مسلمانوں سے صلح کی پالیسی اور مرزا صاحب کے دعاوی کی تلخی اور ان کا زہر نکالنا قابل تحسین امر قرار دیا جاسکتا ہے اور یہی ان کی شخصیت کا طرہ امتیاز ہے۔ اگر ان کی وضع کردہ پالیسی قائم رہتی تو احمدیہ جماعت آئندہ چند سالوں میں مسلمانوں کا ایک فرقہ بن جاتی جیسا کہ علامہ اقبال کا خیال تھا۔ حکیم صاحب کے بیانات اور تقاریر میں ایک بات عام قاری کو کھٹکتی ہے کہ وہ کئی جگہوں پر مرزا صاحب کو حضرت امام زماں سیدنا مسیح موعود علیہ السلام وغیرہ کے القابات سے نہیں پکارتے جیسا کہ قادیانی عقیدت مند مصنفین کا شعار ہے بلکہ وہ انہیں محض مرزا کہتے ہیں اور اس کے ساتھ لفظ صاحب بھی نہیں کہتے۔ اسے ہم ان کی بے تکلفی کہیں یا حسن عقیدت کا نمونہ یہ فیصلہ کرنا قادیانیوں کا کام ہے۔

علامہ اقبال نے برصغیر کے ممتاز علماء اور صوفیاء سے علمی استفادہ کیا۔ انہوں نے علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا الیاس برنیؒ، پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ وغیرہ سے علمی اور دینی مسائل پوچھے۔ انگریز اساتذہ سے بھی انہوں نے کسب فیض کیا اور ان کی تعریف میں اشعار کہے۔ یہ ان کی وسیع الشرب، عالی ظرفی اور بلند نظری کی دلیل ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ احمدی تھے یا حکیم نور الدین کو خلیفہ مانتے تھے یا ان کی رائے کو حتمی سمجھتے تھے۔ وہ کسی شخص کے عقیدے، مذہب اور فرقہ سے بالاتر ہو کر اس کے علم و فضل سے استفادہ کرتے تھے۔ واضح رہے کہ اس دور میں کئی مسلم مشاہیر کے قادیانیوں سے علمی روابط تھے جو رفتہ رفتہ کم ہوتے چلے گئے۔

علامہ اقبال کے حکیم نور الدین سے فقہی سوالات

علامہ اقبال نے 1909ء میں درج ذیل چار سوالات حکیم نور الدین کو جواب کے لئے

بجھوائے۔

- (1) کیا کوئی غیر مسلم فرمانروا اپنی مسلمان رعایا کے لئے وضع قانون کر سکتا ہے؟
- (2) کیا کوئی غیر مسلم حج از روئے قانون اسلامی، مسلمانوں کے مقدمات فیصل کر سکتا ہے؟ کیا

تاریخ اسلامی میں کسی ایسے غیر مسلم جج کی نظیر موجود ہے جو بحیثیت عہدہ مسلمانوں کے مقدمات فیصل کرتا ہو؟

(3) کیا مسلمان ہونے کے لئے شرع محمدی کی پابندی لازمی ہے؟ اگر ہے تو ان مسلمان قوموں کی نسبت کیا حکم ہے جن کے معاملات زیادہ تر رواج سے فیصل پاتے ہیں اور جو خود اپنے آپ کو رواج کا پابند ظاہر کرتی ہیں؟

(4) مسلمانوں کا ضابطہ تعزیری قریباً قریباً بالکل معطل ہے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اسلامی ممالک میں بھی۔ کیا اس ضابطہ کی پابندی ضروری ہے؟ اگر ہے تو جو مسلمان اس کے پابند نہیں خواہ اس وجہ سے کہ وہ کسی غیر مسلم بادشاہ کے محکوم ہیں جو اس ضابطہ کا پابند نہیں ہے یا کسی اور وجہ سے، ان کے اسلام کی نسبت کیا حکم ہے۔

حکیم نور الدین کے جوابات

”میں اختصار پسند ہوں اس لئے آپ کے سوالات کے جوابات اختصار سے تحریر کر کے بھجوا رہا ہوں۔

(1) قرآن مجید کو مکمل ضابطہ حیات ہے مگر وہ مذاہب مختلفہ کو باہم اختلاف، تباہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ قانون اسلامی کے اصل الاصول قرآن مجید میں موجود ہیں مگر ان کی تفصیل کو اطاعت اولی الامر کے نیچے رکھا ہے اور اسی پر صحابہؓ سے لے کر آج تک اسلامیوں کا عمل ہے۔ ہر مسلمان کے لئے اطاعت اللہ، اطاعت رسول اور اطاعت اولی الامر ضروری ہے۔ اگر اولی الامر صریح مخالفت فرمان الہی اور فرمان نبویؐ کی کرے تو بقدر برداشت مسلمان اپنے شخصی معاملات میں اولی الامر کا حکم نہ مانے یا اس کا ملک چھوڑ دے۔ اولی الامر حکام و سلطان اول ہیں اور علماء و حکام دوم درجہ پر ہیں۔

تعزیری احکام کے ہم ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ قرآن شریف میں حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال موجود ہے کہ آپ سلطنت فرعون (A-4) کے ماتحت تھے اور ملکی قانون کی خلاف ورزی

نہ کر سکتے تھے۔

(2) غیر مسلم حج جب فرمانروا کی طرف سے ہے تو حقیقتاً فرمانروا ہی حج ہے اور اگر فرمانروا کی طرف سے نہیں بلکہ پنچائتی طور پر ہے تو بھی جائز ہے۔ چنانچہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک موقع پر خود فرعون مصر کو اپنے معاملہ میں منصف مقرر فرمایا۔

(3) شرع محمدی نام ہے قرآن، احکام نبویؐ، خلفائے راشدین، صحابہ، ائمہ دین (امام ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ، محمدؒ، زفرؒ، حسنؒ) کے فیصلہ پر عمل درآمد کا، فتاویٰ عالمگیری بلکہ ہدایہ کے مقدمات دیوانی و فوجداری اور قوانین میں قرآن مجید و حدیث کے ہزاروں حصہ کا ذکر بھی نہیں آتا۔ میونسپلٹی اور سیاست مدن کے قواعد کی چھان بین کی جائے تو غالباً سارے کا سارا عرف پر مبنی ہے اور فوجی قوانین کی کوئی خاص کتاب میرے زیر مطالعہ آج تک نہیں آئی اور اگر کوئی کتاب ایسی ہو بھی تو اس میں قرآن و حدیث کا ذکر بطور تبرک ہی آتا ہے اور ائمہ دین کا بھی ذکر شاید ہی اس میں ملتا ہے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ ان امور کی آزادی میں وقتی ضرورت، عرف سے کام لیا گیا ہے۔

(4) قرآنی نظریہ کے مطابق ایمان بتدریج ترقی کرتا رہتا ہے۔ پس جو لوگ صرف لا الہ الا اللہ کہتے ہیں اور دل سے مانتے ہیں وہ ایک حد تک مسلمان ہیں اور جو لوگ اس کے ساتھ پابند نماز بھی ہیں وہ پہلوں سے بڑھ کر مسلمان ہیں اور جو زکوٰۃ، روزہ اور حج ادا کرتے ہیں وہ اور زیادہ پختہ مسلمان ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس سب مساوی الایمان نہیں اور ہرگز نہیں۔“

یہ سوالات بڑے اہم، جامع اور مشکل ہیں جن کے جواب کے لئے اسلامی تاریخ کے گہرے مطالعے اور چاروں ائمہ کے مدون کردہ فہموں پر دسترس رکھنا ضروری ہے لیکن حکیم صاحب نے بڑے سطحی انداز میں جواب دیئے ہیں جن میں قادیانی نقطہ نظر کی جھلک موجود ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور شاہ مصر فرعونؒ کے زمانے کے واقعات سے استدلال کیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن

مجید اور تاریخ کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر کے بادشاہ کا لقب فرعون نہیں تھا (مصنف) انہوں نے اسلامی عہد کے حالات اور مسلمان فقہاء کے نقطہ نظر کو پیش نہیں کیا، حالانکہ علامہ اقبال کے سوالات کا مدعا یہ تھا کہ حکیم صاحب ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے تناظر میں، غیر مسلم فرمانروا کے وضع کردہ قانون، رواج کی شرعی حیثیت، ضابطہ تعزیز وغیرہ کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کریں۔ وہ خود اسلامی فقہ Islamic jurisprudence پر گہری نظر رکھتے تھے اور اینگلو سیکسن لاء کے ماہر باریٹ لا وکیل تھے۔ وہ اس موضوع پر خود بھی لکھنا چاہتے تھے۔ (5) ہم آج کے زمانے میں کسی مقتدر عالم اور فقیہ سے ان سوالات کے جوابات حاصل کریں تو ہمارے نزدیک وہ ان کے بارے میں زیادہ مفصل اور بہتر روشنی ڈال سکے گا۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان جوابات سے علامہ اقبال کتنے مطمئن ہوئے یا بالکل مطمئن نہ ہوئے۔

عربی ادب عالیہ کے بارے میں حکیم نور الدین سے علامہ اقبال کا استصواب 1912ء میں علامہ اقبال نے حکیم نور الدین سے عربی ادب کی عمدہ کتب کی تفصیل چاہی۔ انہوں نے 2 دسمبر 1912ء کو ایک خط میں عربی لٹریچر کی فہرست ارسال کر دی۔ علامہ اقبال کا خط اور حکیم صاحب کا جواب ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ شیخ عبدالمجید اپنے والد شیخ عبدالقادر کی تاریخ احمدیت لاہور ص 485 کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اس مکتوب کی اصل کاپی آپ (حکیم صاحب) کے خاندان کے پاس محفوظ ہے۔ (6) حکیم صاحب کے دو صاحبزادے مولوی عبدالمنان عمر اور مولوی عبدالوہاب وفات پا چکے ہیں وہ 1956ء میں مرزا محمود سے اختلاف کر کے لاہوری جماعت سے جاملے تھے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کے خاندان کے افراد یا لاہوری جماعت اس خط و کتابت کو شائع کر دے گی۔ 1914ء میں وفات کے وقت حکیم صاحب کا تمام علمی سرمایہ اور کتب خانہ قادیان میں موجود تھا اور مرزا محمود احمد کے تصرف میں تھا۔ ان کی ایک صاحبزادی مرزا محمود کے نکاح میں تھیں۔ اگر حکیم صاحب کے خاندان سے مراد قادیان یا موجودہ زمانے میں ربوہ میں موجود ان کے وارثین ہیں، تو وہ یہ خطوط شائع فرمادیں، ہم ان کے ممنون ہوں گے۔

ذاتی شرعی مسئلے میں حکیم نور الدین سے علامہ اقبال کا رابطہ

1913ء میں علامہ اقبال نے محترمہ سردار بیگم صاحبہ کے ساتھ نکاح کے سلسلے میں مرزا جلال الدین باریٹ لاء کو حکیم نور الدین کی رائے لینے کے لئے قادیان بھیجا۔ (7) ممکن ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے اور علماء سے بھی رائے لی ہو جس کا ثبوت نہیں ملتا کیونکہ یہ ان کا نجی مسئلہ تھا۔ محترمہ سردار بیگم صاحبہ سے ان کا 1910ء میں نکاح ہو چکا تھا۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ایک کمینہ فطرت وکیل نے اپنے لڑکے کے ساتھ ان کی شادی کرنے کے لئے علامہ اقبال کو بعض گناہم خطوط لکھ کر بدظن کرنے کی کوشش کی (8) چنانچہ ان کے دل میں طلاق کا خیال پیدا ہوا اس لئے ان کا گمان تھا کہ طلاق واقع نہ ہوگئی ہو اس لئے انہوں نے حکیم نور الدین سے فقہی مسئلہ پوچھا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ طلاق نہیں ہوئی اگر شبہ ہے تو تجدید نکاح کر لیں اس پر علامہ اقبال دوبارہ نکاح پڑھوا کر اپنی زوجہ محترمہ کو 1913ء میں گھر لے آئے۔

اقبال کے دو دوست عبدالمجید سالک (9) اور مرزا جلال الدین اس روایت کو بیان کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کی رائے کہاں تک درست تھی اس کا بہتر جواب کوئی عالم ہی دے سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے نیاز مند اور ممتاز دانشور خواجہ عبدالوحید لکھتے ہیں:

”بزم اقبال کی سب سے بڑی خصوصیت اسلام اور بانی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکرِ خیر تھا۔ کوئی مسئلہ ہو، کوئی بات ہو حضرت علامہ اے اسلام کے نقطہ نظر سے دیکھتے۔ اُن کا اسلام کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ہر معاملے میں اسلامی نقطہ نظر کی توضیح کرتے تھے۔ ہاں نازک فقہی مسائل کے بارے میں وہ رائے زنی نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ علمائے دین کی رائے کو ترجیح دیتے تھے، اور اس قسم کے معاملات میں علمائے کرام سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ فلاں مسئلہ مولوی احمد علی سے دریافت کیجئے یا فلاں فقہی نکتے کے بارے میں مولانا غلام مرشد صاحب کی رائے معلوم کیجئے۔ اس نوعیت کا ایک واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ [علامہ اقبال کے دوست] چوہدری محمد حسین مرحوم کوئی بہت بڑے زمیندار

نہیں تھے تاہم ان کے پاس اچھی خاصی موروثی زمین تھی۔ عام زمینداروں کی طرح وہ بھی اسلام کے قانون وراثت پر عمل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اسلامی قانون صرف منقولہ جائیداد پر نافذ ہو سکتا ہے، غیر منقولہ پر نہیں۔ چوہدری صاحب پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے، اس لئے وہ اپنے موقف کی تائید میں دلیلیں بھی پیش کرتے تھے۔ اس مسئلے پر وہ حضرت علامہ سے بھی گفتگو کرتے رہتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ حضرت علامہ سے اپنے موقف کی تائید کرانا چاہتے تھے۔ حضرت علامہ نے مجھ سے فرمایا کہ میں یہ مسئلہ مولانا احمد علی صاحبؒ کے سامنے پیش کر کے اُن کی رائے دریافت کروں۔ میں نے ارشاد کی تعمیل کی۔ مولانا احمد علی صاحبؒ کے جواب سے حضرت علامہ مطمئن ہو گئے اور چوہدری صاحب کو بھی آئندہ کے لئے خاموش ہو جانا پڑا۔

(ماہنامہ نقوش، اقبال نمبر (۲) ص ۳۸۷)

علامہ اقبال کے خط پر حکیم نور الدین کا غلط عربی میں القاء

حکیم نور الدین کے ساتھ خط و کتابت کے سلسلے میں علامہ اقبال کے ایک خط کا ذکر ملتا ہے جو انہوں نے حکیم صاحب کے خط کے جواب میں لکھا۔ یہ خطوط ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ علامہ اقبال کے خط کے ایک حصہ پر حکیم صاحب نے اخبار بدر قادیان میں مندرجہ ذیل رائے شائع کرائی:

”مجھے محمد اقبال ڈاکٹر نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا ڈرپیر (امریکی فلسفی جان ولیم ڈرپیر 1811-1882) مر گیا۔ اس کا فلسفہ بھی مر گیا یورپ ہر روز نئے فلسفہ کا دلدادہ ہے۔ میرے خیال میں آیا یہ کیا بات ہے ظہر کا وضو کرنے لگا القاء ہوا انسان، ہر انسان فنا ہے اور نیا بنتا ہے کیا یہ انسان لغو ہے؟ ہرگز نہیں پھر القاء ہوا۔ من حیث سنسندر جہم لا یعلمون (10) یہ تبدیلی (11) ہمارا اپنا فعل ہے۔ اور ایک حکمت پر مبنی ہے۔ حق کو آرہے ہیں۔ (اخبار بدر قادیان 6 مئی 1913ء)

دونگ مشنری خواجہ کمال الدین نے حکیم نور الدین کے نام ایک خط لکھا جو اخبار بدر قادیان میں 31 جولائی 1913ء کو شائع ہوا۔ لکھتے ہیں کہ بلجیم کی شہزادی کراجا عیسیا حیت سے بیزار ہے اسلام کی طرف آرہی ہے ”حضور والا آپ کا الہام سنسندر ج والا جو ڈاکٹر اقبال کے خط پر حضور کو ہوا وہ بالکل

علامہ اقبال اور حکیم صاحب کے خطوط شائع ہونے کے بعد تمام بحث کا پس منظر معلوم ہو سکے گا۔ اس خط سے حکیم صاحب اور علامہ اقبال کے درمیان خط و کتابت اور غیر مسلموں کے اسلام کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کو القاء ہوتا تھا جب کہ ان کے مسجح موعود پر بارش کی طرح دینی کا نزول ہوتا تھا، اس سے کوئی اور خاص بات ظاہر ہوتی ہو تو وہ قادیانی ہی جانتے ہوں گے۔

میرے رفیق کار جناب شکیل عثمانی کو حکیم صاحب کے اس القاء پر زبان کے نقطہ نظر سے شبہات تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں جب عربی زبان و ادب کے ایک ممتاز فاضل اور ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے مجلے الدرسات الاسلامیہ کے ایڈیٹر پروفیسر ڈاکٹر محمد الغزالی سے رجوع کیا تو ایک دلچسپ صورت حال سامنے آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ حکیم صاحب کا القاء مہمل اور گرامر کے لحاظ سے غلط ہے۔ اسی رائے کا اظہار عربی زبان و ادب کے چند اور ممتاز ماہرین نے بھی کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ عربی زبان میں عام طور پر ”من حیث“ بطور علت، معلول کے بعد استعمال ہوتا ہے، جب کہ اس القاء میں ترتیب معکوس ہے۔ (مصنف)

علامہ اقبال کے قادیانی لڑکی سے نکاح کی غلط خبر 1910ء

اقبال کی انگلستان سے واپسی کے دو سال بعد قادیانی اخبار الحکم قادیان نے 28 اگست 1910ء کے شمارے میں ایک خبر شائع کی کہ شیخ یعقوب علی تراب کی نو اسی کا نکاح پانچ سو روپیہ حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔ اقبال کے عزیزوں اور احباب کو اس پر تعجب ہوا کہ علامہ اقبال تو قادیانی نہیں بکے مسلمان ہیں انہوں نے کس طرح ایک قادیانی لڑکی سے نکاح کر لیا وہ تو قادیانی عقائد کے خلاف ہیں علامہ اقبال کو اس خبر کی تردید چھپوانی پڑی جو پیسہ اخبار لاہور میں 15 ستمبر 1910ء کو چھپی کہ یہ خبر غلط ہے اور یہ کوئی اور ڈاکٹر اقبال ہیں۔

زندہ رود کے مصنف ڈاکٹر جاوید اقبال نے منکوحہ امتہ الرحمن کو یعقوب علی تراب کی نو اسی لکھا

ہے لیکن یہ حکیم نور الدین کی نواسی اور مفتی فضل الرحمن کی بیٹی تھی۔ دولہا کا نام ڈاکٹر اقبال علی غنی تھا جو غلطی سے ڈاکٹر محمد اقبال چھپ گیا۔ شیخ عبد الماجد نے درج بالا تصحیح کا ذکر کیا ہے۔ (13) اس خبر کو قادیانوں کی کسی چال پر محمول نہیں کیا جاسکتا یہ محض کاتب کی بد احتیاطی تھی البتہ علامہ اقبال کو اس خبر سے ذہنی کوفت ہوئی ہوگی جب ان کے رشتہ داروں اور احباب نے ان سے اس بارے میں سوالات کئے ہوں گے۔

علامہ اقبال کی علمی خدمات کا اعتراف 1911ء

دسمبر 1911ء میں آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ علامہ اقبال کی شاندار علمی اور ملی خدمات کی بنیاد پر قوم انہیں کانفرنس کی صدارت پیش کرے اور مولانا شبلی نعمانی ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالیں۔ اس اجلاس میں خواجہ کمال الدین، مولانا شاہ سلیمان پھلواری اور مولانا شبلی نعمانی نے انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ یہ کانفرنس دلی میں منعقد ہوئی۔ خواجہ کمال الدین نے اس میں "اسلام اور علوم جدیدہ" کے موضوع پر ایک لیکچر میں علامہ اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ اپنی ذہنی قابلیت اور استعداد کو بروئے کار لا کر حقیقی تلمیذ الرحمن بننے کی کوشش کریں اور کہا کہ شاعری کے بجائے وہ ملک و ملت کے لئے عملی کام کریں، خدمت اسلام کریں اور غزالی کے بروز بنیں۔ اس تقریر کے جواب میں علامہ اقبال نے کہا اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ یورپ میں علم کا چرچا مسلمانوں کی یونیورسٹیوں سے ہوا۔ جدید علوم و فنون اور اسلام ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈی کارٹ اور مل کے فلسفوں کا اصول امام غزالی کی احیائے علوم میں موجود ہے، جان سٹوورٹ مل نے منطق پر جو اعتراض کیا ہے وہی امام فخر الدین رازی نے کیا ہے۔ غرضیکہ علوم جدیدہ کے ہر پہلو پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر ڈالا ہے۔ (14)

اس کانفرنس میں سر آغا خان، سید حسین بلگرامی اور پورے ہندوستان سے چیدہ چیدہ قومی رہنماؤں نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض مولانا شاہ سلیمان پھلواری نے ادا کئے۔ علامہ اقبال

کو ملک اشعراء کا خطاب دیا گیا اور علامہ شبلی نعمانی نے ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا۔ علامہ اقبال نے اس عزت افزائی پر قومی رہنماؤں کا شکریہ ادا کیا۔ (15)

خوجہ صاحب نے اگر انہیں اخلاص اور نیک نیتی سے تلمیذِ رحمن بننے کا مشورہ دیا تھا تو اسے ہم قابلِ قدر بات سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے خوجہ صاحب کی توقعات سے بڑھ کر اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا اور 1935ء میں قادیانیت کا ایسا شاندار سیاسی، دینی اور علمی محاسبہ کیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

آفتاب اقبال کا قادیان کے سکول میں داخلہ 1911ء

ڈاکٹر اقبال نے اپنے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کو 1911ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کرایا۔ وہ تقریباً پانچ سال 1911ء سے 1916ء تک وہاں زیر تعلیم رہے۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول کو اس وقت پنجاب میں کافی شہرت حاصل تھی اور اس کا معیار تعلیم کافی بلند تھا۔ عیسائی مشنری اداروں کی بجائے اس سکول میں داخلے کو غیر احمدی حضرات بلکہ ہندو بھی ترجیح دیتے تھے۔ اس مدرسے کی بنیاد مرزا صاحب کے زمانے میں رکھی جا چکی تھی۔ 21 مارچ 1908ء کو پنجاب کے فنانشل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر ضلع گورداسپور نے قادیان کا دورہ کیا تو اس مدرسے کے طلباء نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے اس مدرسے کا معائنہ کرنے کے بعد اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس کی نئی عمارت کا نقشہ دیکھا اور اسے تعلیم پھیلانے کا ذریعہ بتایا۔ (16) مدرسہ کے ساتھ ایک علیحدہ دینی شعبہ تھا۔ مارچ 1909ء میں حکیم صاحب نے اس کو مستقل حیثیت دے کر اس کا نام مدرسہ احمدیہ رکھا، اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر مولوی سرور شاہ تھے۔

آفتاب اقبال چار یا پانچ سال تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں زیر تعلیم رہے لیکن قادیانی مذہب اختیار نہ کیا۔ دورانِ قیام ان کی سرگرمیوں کے متعلق قادیانی لٹریچر میں صرف دو حوالے ملتے ہیں ایک تو بھائی عبدالرحمن قادیانی کی دکان کا روزنامہ ہے جو 10-01-1918 سے 28-09-1920 کا ہے اس میں ان کے ادھار اشیاء خریدنے کی تفصیل درج ہے۔ دوسرا حوالہ الفضل 31 دسمبر 1914ء

کا ہے جب قادیانی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور مولوی محمد علی پارٹی کو مرزا محمود کے غنڈوں نے قادیان سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ قادیانی کہتے ہیں ”آفتاب اقبال نے اپنی جماعت کے طلباء کے سامنے مرزا صاحب کی ایک نظم پڑھی اور اپنا مضمون سنایا جس میں احمدی جماعت ہی کو خدا تعالیٰ کی پاک جماعت مان کر پھر مرکز سے قطع تعلق کرنے والوں پر اظہار افسوس تھا۔“ (17)

مرزا محمود احمد نے قادیانیوں کو ساتھ ملانے کے لئے جو پروپیگنڈا مہم مارچ 1914ء سے زور شور سے شروع کر رکھی تھی اس کی تقویت کے لئے الفضل قادیان طلباء کی غیر نصابی سرگرمیوں کی رپورٹیں شائع کرتا رہتا تھا جس کا اہم پہلو لاہوریوں کے قادیان سے قطع تعلق کی مذمت اور قادیان کی وفادار جماعت اور اس کی پالیسی کی تائید ہوتی تھی۔ یہ رپورٹ اسی کا شاخسانہ ہے غیر احمدی طلباء کو تعلیمی مجبور یوں کے باعث ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑتا تھا اور قادیانی ٹیچر لاہوریوں کو بدنام کرنے کے لئے طلباء کو اپنے تحریر کردہ مضامین پڑھنے کے لئے دیتے اور پھر اس کی مبالغہ آمیز رپورٹیں الفضل کو بھجواتے تھے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بھائی عبدالرحمن قادیانی نے اپنے روزنامے میں جو 10 جنوری 1918ء سے 28 ستمبر 1920ء تک کا ہے آفتاب اقبال کے ادھار اشیا خریدنے کی تفصیل لکھی ہے تو عرض ہے کہ آفتاب اقبال 1911ء میں تعلیم الاسلام سکول قادیان میں داخل ہوئے اور 1916ء میں میٹرک کر کے سینٹ سٹیفن کالج دہلی چلے گئے۔ (18) 1918ء میں وہ دہلی میں تھے تو بھائی عبدالرحمن نے 18 جنوری 1918ء سے 28 ستمبر 1920ء کے روزنامے میں ان کے ذمے ادھار چیزیں خریدنے کی تفصیل کیسے لکھ دی۔ اگر انہوں نے ادھار لیا تھا تو وہ 1911ء سے 1916ء تک کا ہونا چاہئے تھا۔

آفتاب اقبال کی بیگم رشیدہ اقبال لکھتی ہیں ”آفتاب اقبال کنک منڈی سیالکوٹ میں سکاح مشن سکول میں پڑھتے تھے۔ علاقہ کے کسی دوست نے ایک نئے ادارے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے اعلیٰ معیار تعلیم اور تربیت کا ذکر چھیڑا، اپنے لخت جگر کی معیاری تعلیم اور اعلیٰ تربیت کی خاطر علامہ اقبال نے اسے اس نئے مدرسے میں بھجوادیا۔“

اس مدرسے کا انتظام و انصرام قادیانی جماعت کے اکابرین کے ہاتھ میں تھا اس دور میں قادیانی جماعت میں معتدل قیادت تھی اور عوام الناس میں کسی قسم کے شکوک و شبہات نہ تھے۔ ان کی بیگم مزید لکھتی ہیں۔

آفتاب اقبال نے اس بات کی پر زور تردید کی کہ وہ قادیانی ہیں، بلکہ قادیان کے قیام کے دوران وہ "اس جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کے اخلاق سیئہ سے باخبر ہوئے اور انہوں نے مرزا بشیر الدین محمود کے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سے آگاہ کیا تھا کہ میں ایک عورت کے ناطے اپنے قلم سے اس روداد کو بیان کرنے سے لرزہ محسوس کرتی ہوں"۔ (19)

حکیم نور الدین کے عقائد اور اعتدال پسندانہ روش

مرزا غلام احمد کی وفات کے بعد 1908ء میں قادیان کی گدی سنبھالنے کے بعد حکیم صاحب نے ایک تو مرزا صاحب کی وضع کردہ انگریز کی اطاعت اور ان سے بھرپور تعاون کی پالیسی برقرار رکھی دوسرے انہوں نے مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان پائے جانے والے فاصلوں کو کم سے کم کر دیا اس کے لئے انہوں نے احمدیت کی تبلیغ کا زاویہ بدل دیا۔ مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت، مسلمانوں کی تکفیر، اور مسلمان علماء سے مباہلے، مجادے اور مباہلے کم سے کم ترک کر دئے گئے اور اعتدال پسندانہ روش اختیار کی گئی۔ ان کو بطور خلیفہ کلی اختیارات حاصل تھے اور کوئی ان کے خلاف زبان نہ کھول سکتا تھا۔ بعض سرکردہ قادیانی جن میں خواجہ کمال الدین، مولوی محمد علی وغیرہ شامل تھے مرزا صاحب کے زمانے ہی سے ایسے عقائد اور غیر احمدیوں سے متعلق نرم رویہ کو پسند کرتے تھے اور نجی مجلسوں میں اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں اور احمدیوں میں سب سے بڑا اختلافی مسئلہ نبوت مرزا کا تھا۔ نبوت مرزا کے متعلق حکیم صاحب کا عقیدہ ان کے ایک مطبوعہ خط سے عیاں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ دل چیر کر دیکھنا یا دکھانا انسانی طاقت سے باہر ہے قسم پر کوئی اعتبار کرے تو واللہ العظیم کے برابر کوئی قسم مجھے نظر نہیں آتی نہ آپ میرے ساتھ میری موت کے بعد

ہونگے اور نہ کوئی اور میرے ساتھ سوائے ایمان و اعمال کے ہوگا پس یہ معاملہ خدا تعالیٰ کے حضور پیش ہونے والا ہے واللہ العظیم۔ واللہ الذی باذنہم تقوم السما والارض میں مرزا صاحب کو مجدد اس صدی کا یقین کرتا ہوں، میں ان کو راستباز مانتا ہوں۔ حضرت محمد الرسول اللہ النبی عربی المکی المدنی خاتم النبیین کا غلام اور اس کی شریعت کا بدل خادم مانتا ہوں اور مرزا خود اپنے آپ کو جانثار غلام نبی عربی محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن مناف مانتے تھے۔

نبی کے لغوی معنی پیش از وقت اللہ تعالیٰ سے اطلاع پا کر خبر دینے والا ہم لوگ یقین کرتے ہیں نہ شریعت لانے والا۔ مرزا صاحب اور میں خود جو شخص ایک نقطہ بھی قرآن شریف کا اور شریعت محمد رسول کا نہ مانے اسے کافر اور لعنتی اعتقاد کرتا ہوں یہی میرا اعتقاد ہے اور یہی میرے نزدیک مرزا غلام احمد کا تھا کوئی رد کرے یا نہ مانے یا منافق کہے۔ اسکا معاملہ حوالہ بخدا۔ نور الدین بقلم خود 22 اکتوبر 1910ء (20)

اگرچہ جماعت قادیان کے خلیفہ دوم اور مرزا غلام احمد کے فرزند مرزا محمود احمد نے حکیم نور الدین کی اعتدال پسندانہ حکمت عملی کو 1914ء میں خلافت کی گدی سنبھالنے کے بعد تاخت و تاراج کر دیا اور احمدیت کا اصل چہرہ مسلمانوں کو دکھا دیا لیکن 1908ء سے 1914ء تک حکیم صاحب کی مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی نرم پالیسی جاری رہی۔ عقائد میں وہ شدت جو تحریک احمدیت کی روح تھی اور جس کی ترجمانی 1914ء کے بعد مرزا محمود نے اختیار کی، سامنے آتی گئی۔ مرزا صاحب کی تحریرات کی روشنی میں انہیں حقیقی نبی ثابت کیا گیا جس کا منکر کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ مرزا محمود نے زور دے کر کہا کہ نبوت کا منصب جاری و ساری ہے۔ اسمہ احمد کے مصداق مرزا صاحب ہیں اور ان کے دعاوی پر ایمان لائے بغیر نجات اخروی ممکن نہیں۔ جماعت قادیان (موجودہ جماعت ربوہ) انہیں عقائد پر کاربند ہے اور اسی لئے مسلمان انہیں اسلام کے باغی اور دین کے غدار قرار دیتے ہیں اور اسی لئے انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا جو ان عقائد کا لازمی نتیجہ تھا۔ (21)

خواجه کمال الدین کے لیکچر

حکیم نور الدین کی ہدایت پر خواجه کمال الدین نے 1909ء میں ہندوستان کے طول و عرض میں صرف اسلام کے موضوع پر لیکچر دیئے اور مسلمانوں سے میل جول بڑھانے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ وہ نفرتوں کی اس خلیج کو جو مرزا صاحب کے الہامات، پیش گوئیوں اور اشتعال انگیز تحریرات نے پیدا کر دی تھی پائنے کی کوشش کرتے رہے۔ خواجه صاحب اس عہد کی جماعتی پالیسی اور تبلیغی روش پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

(1) ”حضرت حکیم صاحب مرحوم کی بالغ نگاہ نے فوراً دیکھ لیا کہ جو لوگ اہل کلمہ کو اس وقت کافر ٹھہراتے ہیں وہ اس عقیدہ پر قائم ہو کر ایک نہ ایک دن مرزا صاحب کی نبوت کے قائل ہو جائیں گے اور اس کا اعلان کریں گے چنانچہ قبلہ حکیم صاحب مرحوم اپنی بقیہ زندگی میں یہ دو باتیں شد و مد سے بیان کرتے رہے ایک یہ کہ کوئی اہل کلمہ کافر نہیں دوسرا یہ کہ مرزا صاحب نبی نہیں“ (22)

(2) 1909-10ء میں ہندوستان میں ایک مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ زور شور سے جاری تھا۔ 1910ء میں اس یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے خواجه کمال الدین نے لاہور میں جماعتی عقیدے کا اظہار ایک لیکچر میں کیا۔ فرماتے ہیں:

”اسلام میں کوئی فرقہ نہیں نہ کوئی اہل کلمہ کافر ہو سکتا ہے کوئی اہل کلمہ کسی فرقے سے تعلق رکھے وہ مسلمان ہے مسلم فرقوں میں جو اختلاف ہے وہ اصول کا نہیں بلکہ فروعی اختلاف ہے۔ (23) یہ لیکچر حکیم صاحب کی زندگی میں 1910ء میں پیسہ اخبار لاہور میں چھپا۔ اس زمانے میں جماعت احمدیہ کا الگ تشخص ابھر رہا تھا۔ تعلیم یافتہ طبقے نے جماعت کی اس روش کو پسند کیا۔ اسی بات کا ذکر علامہ اقبال نے 1935ء میں کیا اور کہا کہ چوتھائی صدی قبل (1910ء) ان کو اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی لیکن ایسا نہ ہوا۔

خواجه کمال الدین کہتے ہیں کہ حکیم صاحب کے زمانے میں قادیان میں مرزا غلام احمد کے

صاحبزادے میاں محمود احمد مسلمانوں کی تکفیر اور مرزا صاحب کی حقیقی نبوت کے قائل تھے اور وہ اور ان کے رفقاء کا ایک مختصر گروہ جو میرنا صرنواب (ان کے نانا) میراٹھ (ان کے ماموں) اور ان کی ساختہ پرداختہ انصار اللہ پارٹی پر مشتمل تھا تکفیری مہم چلانے میں پیش پیش تھے وہ حکیم صاحب سے مختلف اوقات میں ان مسائل پر ان کی رائے لے کر جماعت کے اخبارات میں شائع کراتے اور اپنے مقصد کی تاویلات پیش کرتے۔ اس زمانے میں مرزا محمود نے مرزا صاحب کی نبوت اور تکفیر مسلمین کے عقیدے پر مبنی ایک پمفلٹ لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمان وہی ہے جو مرزا صاحب کے دعوے کو قبول کرے۔ (24) اسے امرتسر سے 5 ہزار کی تعداد میں چھپوایا گیا۔ حکیم صاحب کو جب اس کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے اس کی تمام کاپیاں جلا دینے کا حکم دیا اس طرح اس کی تمام کاپیاں جمع کر کے جلا دی گئیں۔ (25)

مرزا محمود احمد نے 1914ء میں اور اس کے بعد جماعت احمدیہ میں اختلاف کے موضوع پر جو رسائل اردو میں لکھے اور جن کے انگریزی میں تراجم ہوئے ان میں وہ حکیم صاحب کی جگہ خولجہ کمال الدین، محمد علی وغیرہ کو اختلاف عقائد اور جماعت کی مذہبی پالیسی میں تبدیلی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ خولجہ کمال الدین کے متعلق کہتے ہیں کہ 1905ء (مرزا صاحب کے زمانے) میں اخبار وطن نے جب ایک تجویز پیش کی کہ قادیان سے شائع ہونے والے رسالے ریویو آف ریلی جنز کو صرف اسلام کی تبلیغ کے لئے وقف کیا جائے اور اس کے ساتھ ایک ضمیمہ لگا کر اس میں مرزا صاحب کا ذکر کیا جائے تو خولجہ صاحب اس پر راضی ہو گئے۔ یہی تجویز مرزا صاحب کے ایک اور پیروکار عبدالحکیم اسٹنٹ سرجن پٹیالہ نے بھی دی تھی، جو ابتداء میں ان کا وفادار مرید تھا۔ اس نے قرآن حکیم کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا لیکن مرزا صاحب سے اور باتوں کے علاوہ اس بات میں اختلاف کی بنیاد پر جماعت سے الگ کر دیا گیا۔ مرزا صاحب اسے عبدالحکیم مرتد کہتے تھے۔ اس نے مرزا صاحب سے خط و کتابت میں خولجہ صاحب اور محمد علی کی اس تجویز کو تسلیم کرنے پر زور دیا تھا۔ (26)

مرزا محمود احمد لکھتے ہیں کہ خواجہ کمال الدین نے غیر احمدیوں سے روابط بڑھائے، وہ شہرت پسند تھے، اپنے لیکچروں میں مسیح موعود کا ذکر نہ کرتے تھے اس طرح غیر احمدیوں میں مقبول ہونے لگے۔ ان کے سامعین کی تعداد ہزاروں میں ہو گئی جو ان کی بات سننا چاہتے تھے۔ وہ اپنے لیکچروں کا دائرہ وسیع کرنے لگے، غیر احمدیوں نے ان کی تعریف کی اور ہر طرف سے انہیں دعوت نامے آنے لگے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ مرزا محمود نے احمدیت اور مرزا صاحب کی نبوت اور مسلمانوں سے علیحدگی پر مبنی عقائد کی بنیاد پر ایک سلسلہ تقاریر جاری کیا۔ انہوں نے لکھنؤ، بنارس وغیرہ میں لیکچر دیئے جن کو پسند نہ کیا گیا اور جلد ہی انہیں یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا، اس کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ (27)

خواجہ کمال الدین کہتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان اور انگلستان میں جو تبلیغ کی وہ حکیم نور الدین کے کہنے کے عین مطابق تھی۔ حکیم صاحب نے ان کی لندن روانگی 1912ء اور قیام لندن کے دوران انہیں جو خطوط لکھے ان میں انہوں نے حکم دیا کہ ”بجز لا الہ الا اللہ کے وہاں کچھ تلقین نہ کرنا لا الہ الا اللہ کی تعلیم اور محمد رسول اور کلمات اذان اور ان کی تعلیم دیں۔“ (28)

اگرچہ بعض لوگوں نے شور مچایا کہ خواجہ کمال الدین مرزا صاحب کا نام اپنی تبلیغ میں نہیں لیتا اس کا کسی غیر مسلم کو مسلمان کرنا بے سود ہے لیکن حکیم صاحب غیر احمدیوں کی تکفیر کو برا جانتے تھے اور ہندوستان کے باہر غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت دیتے تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو ایک خط اور تار میں اس کی اجازت دی ان کے خط کی تاریخ دسمبر 1913ء ہے یعنی وفات (13 مارچ 1914ء) سے تین ماہ پہلے تک ان کا یہ حکم تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1913ء میں جب چوہدری ظفر اللہ لندن میں زیر تعلیم تھے تو انہوں نے ایک غیر احمدی مسلمان کے پیچھے نماز پڑھی۔ پیغام صلح لاہور نے 17 مئی 1941ء کو جب یہ واقعہ شائع کیا تو انہوں نے قادیانی انداز کے مطابق اس کی تاویلات پیش کرنی شروع کر دیں۔ (29)

26 دسمبر 1913ء کو جب آئر لینڈ کا ایک امیر لارڈ ہیڈلے مسلمان ہوا تو زمیندار لاہور نے

خواجہ کمال الدین کی ایک نظم شائع کی جس میں مسلمانوں کو اختلافات ختم کرنے کی تلقین تھی۔ لندن میں مقیم مسلم لیگ کے صدر سید امیر علی اور سکریٹری مرزا عباس بیگ نے دوکنگ مشن کے پروگرام کی تکمیل میں مدد دینے کا وعدہ کیا اور 150 پونڈ چندہ دیا۔ مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر دوکنگ مشن کی تبلیغی سرگرمیوں کو پسند کرتے تھے اور خواجہ کمال الدین کی قدر کرتے تھے۔ (30)

دوکنگ مشن

خواجہ کمال الدین حکیم صاحب کے زمانے میں 1912ء میں بمبئی کے ایک سرمایہ دار کے قانونی مسئلہ کے حل کے لئے انگلستان گئے۔ دوکنگ (سرے) میں جو لندن سے 24 میل کے فاصلے پر ہے بیگم بھوپال کی مالی امداد سے ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی، انہوں نے سید امیر علی سے مل کر اس کا چارج سنبھال لیا۔ خواجہ صاحب کو جلد شہرت حاصل ہو گئی کیونکہ مرزا محمود کے کہنے کے مطابق انہوں نے نو مسلموں کو اسلام کا جو نقشہ پیش کیا تھا وہ وہی تھا جو مسیح موعود کے سخت مخالفین مولوی محمد حسین بٹالوی اور مولوی ثناء اللہ امرتسری کا پیش کردہ تھا (31)

1913ء میں لاہور سے پیغام صلح نامی اخبار نکالا گیا جو بعد میں لاہور جماعت کا آرگن بنا اس کے جواب میں قادیان سے مرزا محمود نے الفضل کا اجراء کیا۔ پیغام صلح لاہور نے مرزا صاحب کی نبوت، مسلمانوں کی تکفیر جیسے مسائل پر مصالحانہ اور نرم رویہ اختیار کیا اور مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی حمایت کی جب کہ الفضل نے مسلمانوں کی تحریکات آزادی کی مخالفت کی اور انگریز کا بھرپور ساتھ دیا۔

اگست 1913ء میں کانپور میں سڑک نکالنے کے لئے انگریز حکام نے مسجد کے ایک حصے کو شہید کر دیا اس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا اور گرفتاریاں دیں۔ مولوی محمد علی نے پیغام صلح لاہور میں مسلمانوں کے موقف کی بھرپور حمایت میں تین مضامین لکھے۔ ایسے ہی جب حکومت نے 17 اکتوبر 1914ء کو مولانا ظفر علی خان کو ضلع بدلی کا نوٹس دیا تو پیغام صلح لاہور شاید ہندوستان کا پہلا اخبار تھا جس نے مولانا کی حمایت میں مضمون لکھا۔ (32)

مئی 1915ء میں اخبار پیغام صلح نے علی برادران کے حق میں مضامین شائع کئے اور مسئلہ خلافت پر مسلمانوں کے سیاسی موقف کی حمایت کی۔ لاہور جماعت کے افراد خواجہ کمال الدین، مولوی محمد علی، ڈاکٹر بشارت احمد، مرزا یعقوب بیگ مسلم انجمنوں کے اجلاس میں شامل ہوتے اور مسلمانوں سے روابط بڑھاتے تھے۔ وہ علامہ اقبال سے خاص طور پر ملاقاتیں کرتے تھے ایک تو ان میں سے بعض لوگوں کا تعلق سیالکوٹ سے تھا اور علامہ اقبال سے ان کی پرانی شناسائی تھی دوسرے ان کی مذہبی پالیسی اور مسلمانوں کے سیاسی مفادات کی حمایت کے باعث علامہ اقبال ان سے میل جول رکھنے کو برا نہ جانتے تھے۔ جماعت قادیان میں سے بہت کم لوگوں کے ساتھ ان کے شخصی تعلقات رہے۔

اس عہد کا ذکر عبد المجید سالک نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اس وقت سر محمد شفیع مسلمانوں کے لیڈر تھے اور عام جلسوں کی صدارت وہی کرتے تھے۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب، مولوی محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین علامہ اقبال کے دوست اور مداح تھے اور ان کو مسلمانوں کی قیادت کا حق دار سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے علامہ کا نام ایک جلسے کی صدارت کے لئے تجویز کیا۔“ (33)

ان حالات میں علامہ اقبال کا لاہور جماعت کے جلسوں میں جانا، تقریر کرنا اور تبلیغی سرگرمیوں میں حصہ لینا قابل اعتراض نہیں قرار دیا جاسکتا جب کہ وہ (لاہوری احمدی) مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی جدوجہد اور خالصتاً تبلیغ اسلام کی مساعی میں ان کے حامی اور ہمدرد تھے اور مرزا صاحب کے دعاوی کا کسی طرح سے کوئی پرچار نہ کیا جاتا تھا۔

قادیانی فرقہ: ”اسلامی سیرت کا ٹھیکہ نمونہ“ 1910ء

1910ء میں علامہ اقبال نے علی گڑھ یونیورسٹی کے سٹریچی ہال میں انگریزی زبان میں ایک

فکر انگیز مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا The Muslim Community-A Sociological Study۔ اس میں انہوں نے برصغیر میں اسلام کے مستقبل، تعلیمی ترقی اور بعض تہذیبی مسائل پر سیر

حاصل بحث کی اور ان مسائل وحالات کی نشاندہی کی جو قوم کے اتحاد و ترقی کی راہ میں حائل تھے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے ”ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر“ کے عنوان سے کیا۔ اس مقالے میں وہ فرماتے ہیں:

اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہم اپنی قومی زندگی میں تسلسل پیدا کریں تو ہمیں اس نوع کا کردار پیدا کرنا ہو گا جو ہر قیمت پر مستقل رہتا ہے اور جب کہ وہ آمادگی کے ساتھ دیگر انواع میں جو اچھی چیزیں ہیں انہیں قبول کر لے اور یہ اپنی زندگی سے احتیاط کے ساتھ ہر شے کو خارج کر دے جو اس کی محبوب روایات اور اس کے اداروں کے مخالف ہے ہند میں مسلم فرقے کے ایک مختلط مشاہدے سے یہ نکتہ ظاہر ہو جائے گا جس پر فرقے کے اخلاقی تجربے کے مختلف خطوط مرتکز ہونے والے ہیں۔ پنجاب میں مسلم نوع کے کردار نے نام نہاد قادیانی فرقے میں ایک طاقت ور اظہار پایا ہے جب کہ یوپی میں قدرے مختلف دانشورانہ ماحول کے باعث اس نوع کے کردار کی ضرورت کا ایک عظیم شاعرانہ آواز میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا جا رہا ہے۔ اپنے مزاحیہ انداز میں مولانا اکبر الہ بادی نے جنہیں لسان العصر کا نام دیا گیا ہے ان قوتوں کی نوعیت کا نہایت گہرا ادراک کیا ہے۔ (34)

اس کا اصل انگریزی متن اگلے صفحے پر درج ہے اس میں لفظ So-called کا مولانا ظفر علی خاں نے ترجمہ نہیں کیا۔ فرماتے ہیں کہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔ (35) ہم نے نام نہاد کی جگہ اس کا ترجمہ جس کو عام طور پر قادیانی فرقہ کہتے ہیں کیا ہے۔ علامہ اقبال کا ان سطور کے لکھنے سے یہ مطلب نہ تھا کہ ہے تو یہ مسلمان احمدی فرقہ لیکن لوگ اسے قادیانی فرقہ کہتے ہیں اس لئے انہوں نے نام نہاد قادیانی فرقہ کہا بلکہ اس پیرا گراف کے پورے متن اور آئندہ کی سطور پر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جسے عام طور پر قادیانی فرقہ کہا جاتا ہے۔

افکار اقبال میں ڈاکٹر محمد ریاض نے یہ ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

پنجاب میں بنیادی طور پر مسلم طرز کے کردار کا زور دار ظہور قادیانی نام کے فرقے میں

ہوا ہے۔ (36)

سید عبدالواحد معینی نے مقالات اقبال میں اس جملے کے ترجمے کو حذف کر دیا ہے اور بعض اور محققین و مترجمین اقبالیات نے بھی ایسا ہی کیا ہے جو ہمارے نزدیک درست نہیں۔ تو کیا 1910ء میں حکیم نور الدین کے زمانے میں قادیانی مسلم کردار کی نمائندگی کرتے تھے؟ اس کا جواب گذشتہ صفحات میں بیان کی گئی حکیم نور الدین کی مسلمانوں سے اتحاد و تعاون پر مبنی پالیسی کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عام تاثر یہی تھا اور یہی بات علامہ اقبال نے کہی۔

1935ء میں علامہ اقبال کے قادیانیت کے بارے میں مضامین کی اشاعت کے بعد قادیانی پر پے سن رائز نے علامہ اقبال کی علی گڑھ کی تقریر کے حوالے سے ان پر تناقض خود inconsistency کا الزام لگایا تو انہوں نے جواب میں کہا ”مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ ہی اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے 1911ء یا اس سے قبل یہ تقریر کی تھی۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی..... لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لئے اسے برسوں چاہیں۔“

اقبال نے کہا ”ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا جب ایک نئی نبوت، بانی اسلام ﷺ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا تھا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل لے۔ بقول ایمرن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔“ (حرف اقبال ص: 112)

یہ تو قادیانی اعتراض کا ایک جواب تھا۔ دوسرے علامہ اقبال اپنے پرانے کاغذات دیکھ رہے تھے تو ان کو علی گڑھ والی تقریر کا مسودہ مل گیا۔ اس پر انہوں نے ایک شذرہ لکھا جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ (37)

یہ خطبہ 1911ء میں علی گڑھ میں دیا گیا تھا۔ اس خطبے میں قادیانیوں کے متعلق تبصرہ 1911ء سے اس تحریک کے حقیقی عزائم کی پردہ درمی کی روشنی میں نظر ثانی کا محتاج ہے۔ قادیانی ابھی تک اپنے ظاہر میں تو مسلمانوں ہی کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل وہ ظاہر داری کے معاملات میں بڑے باریک بین ہیں اور جزئیات کا خیال رکھنے والے ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کی روح، جیسا کہ بارہا اس کا اظہار ہوا اسلام کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ قادیانی بظاہر تو مسلمان نظر آتے ہیں اور ایسا نظر آنے کے لیے بے چین بھی رہتے ہیں لیکن اندر سے ان کی ذہنیت کلی طور پر مجوسی ہے غالب امکان یہ ہے کہ انجام کار یہ تحریک بہائیت میں اختتام پذیر ہو جائے گی جہاں سے یہ اصلاً اثر پذیر ہوتے ہوئے نمودار ہوئی تھی۔ (محمد اقبال 21 اکتوبر 1935ء) (38)

اس سے ثابت ہوا کہ علامہ اقبال نے 24 سال بعد 1935ء میں اپنی رائے کی خود تصحیح کر دی اس لئے اس عبارت کو پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا دوسرے اس کی ذمہ داری حکیم نور الدین اور احمدیہ جماعت پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے مسلک اور عقائد کی شدت کو کم کر کے مسلمانوں سے صلح اور تعاون کی پالیسی پر عمل کیا۔ اگر اس وقت احمدیہ جماعت کا وہ مسلک ہوتا جو 1914ء کے بعد قادیان جماعت اور اس کے سربراہ مرزا محمود نے اختیار کیا اور ان کی مرزا صاحب کی نبوت، تکفیر مسلمین اور دیگر مسائل پر اختیار کی گئی پالیسی میں کوئی نرمی اور لچک نہ ہوتی تو پھر علامہ اقبال کی یہ رائے قابل اعتراض ہو سکتی تھی کہ وہ ایسی اسلام دشمن جماعت کے لئے ایسے الفاظ کیوں استعمال کر رہے ہیں؟

لاہوری جماعت کے مناظر اختر حسین گیلانی لکھتے ہیں 'علامہ اقبال کا علی گڑھ کو یہ مشورہ دینا کہ اسلامی سیرت کا ٹھیلہ نمونہ دیکھنا ہو تو قادیان میں ملے گا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال خود اس نمونے سے شدت سے متاثر تھے۔ علامہ کے اس بیان سے علی گڑھ میں کوئی اضطراب نمودار نہ ہوا بلکہ سب نے اس بیان کو اطمینان سے سنا جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں بالعموم تحریک احمدیت کو نہایت منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور حق تو یہ ہے

کہ اگر علامہ اقبال کو ذرا بھی خیال ہوتا کہ علی گڑھ کو ایسا مشورہ دینے سے اضطراب پیدا ہوگا تو وہ قطعاً ایسی بات زبان پر نہ لاتے۔ ان کا ایسا مشورہ دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خود بھی خوب جانتے تھے کہ عام طور پر تحریک احمدیت کے متعلق مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات ایسے ہی ہیں اس لئے انہوں نے ایسا بیان دے کر درحقیقت اصحاب علی گڑھ کے خیالات کی ترجمانی کر دی۔ آج کل (1944ء) اگر کوئی مسلمان رہنما اس قسم کی رائے کا اظہار کرے تو معلوم نہیں اس کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا جائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت مولانا نور الدین صاحب کے زمانہ میں جماعت احمدیہ کی مخالفت دب چکی تھی اور قبولیت عامہ کا شاندار دور روز افزوں ترقی پر تھا۔ (39)

علامہ اقبال کی لاہوری جماعت کے ایک جلسے میں شرکت نومبر 1913ء

23 نومبر 1913ء کو مسلمانان لاہور کا ایک جلسہ عام احمدیہ بلڈکنس لاہور میں منعقد ہوا چونکہ لاہور جماعت کا اخبار پیغام صلح مسلمانوں کی ملی تحریکات اور ان کے آزادی پسندانہ جذبات کی ترجمانی کرتا رہتا تھا اس لئے وہ ایسے جلسے منعقد کر کے ان میں مسلمانوں کو شرکت کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ ان میں کسی اختلافی امر پر گفتگو نہ ہوتی تھی۔ اس جلسے میں دوکنگ مشن کے سربراہ خواجہ کمال الدین کی ایک چھٹی پڑھ کر سنائی گئی۔

جلسے میں علامہ اقبال نے بھی تقریر کی۔ اسلام کی تبلیغ پر زور دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس کام کو سب سے پہلے خواجہ کمال الدین نے پہچانا اور ہر قسم کے دنیاوی مفاد قربان کر کے یہ عظیم الشان کام اپنے ذمہ لیا اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی داسے درے ہر قسم کی امداد میں پہلو تہی نہ کریں اور اس نیک کام میں احمدیت وغیر احمدیت کے سوال کو نہ آنے دیں کیونکہ ہمارا خدا ہمارا رسول اور ہماری کتاب ایک ہے۔ پیغام صلح نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ یہ تقریر ہر پہلو سے قابل داد تھی اور اول سے آخر تک ہمدردی اسلام میں رنگی ہوئی تھی۔

بعد ازاں دوکنگ مشن کے لئے تمام مسلمانان ہند سے چندہ حاصل کرنے کی ایک تحریک کے لئے ریزولوشن پاس کیا گیا اور ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کے ممبروں میں دو غیر احمدی (40) اور

پانچ لاہوری احمدی تھے۔ (41) دو لاہوری احمدی، شیخ رحمت اللہ اور مرزا یعقوب بیگ جائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔

خوارج کمال الدین جس انداز سے لندن میں احمدیت کو ایک طرف رکھ کر محض اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے اور عیسائیت اور دیگر مذاہب کے افراد کے اسلام کے خلاف اعتراضات کا جواب دے رہے تھے اس کی روشنی میں اور اس وقت کے حالات کے تحت علامہ اقبال کی تقریر حقیقت پسندانہ تھی۔ دو کنگ مشن کے رسالہ اسلامک ریویو کے فائل اس بات کے گواہ ہیں کہ ان میں صرف اسلام کی صداقت کے مضامین شائع ہوتے تھے اس لئے علامہ اقبال نے ان تبلیغی مساعی میں لاہوریوں کا ساتھ دیا۔ مرزا محمود احمد نے خوارج صاحب کی جاسوسی کرنے کے لئے اپنے خاص حواری فتح محمد سیال کو انگلستان روانہ کیا جو اپنے منفی طرز عمل اور سازشی کردار کے باعث وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ علامہ اقبال نے لاہور جماعت کی تبلیغ اسلام کی کاوشوں میں اعانت کی اور دو کنگ مشن کی مالی امداد کے لئے جماعت نے جو ٹرسٹ قائم کیا اس کے ایک ممبر کے طور پر مختصر عرصے کے لئے کام کیا۔ دو کنگ مشن کے ساتھ اختلاف عقائد سے قطع نظر مسلمانوں نے لاہوریوں کو مالی امداد مہیا کی جس کی ایک وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ یاس اور بے دلی کی اس فضا میں جو بہ سبب زوال و انحطاط عالم اسلام پر طاری تھی مسلمانوں کو اپنے تحفظ و استحکام کی کوششوں میں ایک راہ عمل یہ بھی نظر آئی اگر اہل یورپ نے اسلام قبول کر لیا تو ان کی شکست فتح مندی میں بدل جائے گی۔ (42)

جماعت احمدیہ کے اختلاف میں علامہ اقبال کو ملوث کرنے کی کوشش 1915ء مارچ 1914ء کے بعد قادیانی۔ لاہوری تنازع شدت اختیار کر گیا۔ قادیان جماعت مرزا محمود کو خلیفہ مانتی تھی لیکن لاہور جماعت ان کی سخت مخالف تھی۔ نبوت مرزا، تکفیر مسلمین وغیرہ پر ان کے باہمی اختلافات تھے 19 اکتوبر 1915ء کو افضل قادیان میں سید انعام اللہ شاہ سیالکوٹی کی ایک تحریر شائع ہوئی جس کا عنوان تھا ”جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے اختلاف جماعت احمدیہ کے بارے میں“ انعام اللہ سیالکوٹی سیالکوٹ چوگی میں ملازم تھے، پہلے جماعت لاہور کا ساتھ دیا پھر

الگ ہو گئے۔ وہ ظفر اللہ کے قریبی دوست تھے۔ انہوں نے ان کا ذکر اپنی خودنوشت سوانح تحدیثِ نعمت میں بھی کیا ہے۔ انعام اللہ نے اپنے اور علامہ اقبال کے ایک مشترکہ دوست سید بشیر احمد کے حوالے سے لکھا کہ علامہ اقبال جماعتِ قادیان کو حق پر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بات غلط تھی۔ لاہور جماعت کے بعض افراد اور ان کے کئی مسلم احباب نے ذاتی ملاقاتوں میں اور خطوط لکھ کر اس بات کی وضاحت چاہی۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے ایڈیٹر پیغام صلح لاہور کو ایک خط لکھا جس سے ان کا ختم نبوت پر پختہ ایمان ظاہر ہوتا ہے۔ (43) یہ خط سامنے صفحے پر درج ہے۔

علامہ اقبال کے اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی نبوت کو ختم سمجھتے تھے اور قادیان یا لاہور جماعت کے مذہبی اختلاف میں کسی جماعت کے طرفدار نہ تھے اور نہ ہی مرزا صاحب کی نبوت اور احمدیت کی سچائی پر کسی طرح کا یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے جس کتاب حقیقت النبوة کا ذکر کیا ہے اور بہ لحاظ ترتیب اس کی تعریف کی ہے وہ مرزا محمود احمد کی اختلافِ سلسلہ کے ایک سال بعد مارچ 1915ء میں اللہ بخش سنیم پریس قادیان سے شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے مختلف پیروؤں میں مرزا صاحب کو حقیقی نبی ثابت کیا ہے۔ انہوں نے قدیم نوشتوں، قرآنی آیات، مرزا صاحب کی وحی، ان کی تحریرات اور دیگر عقلی و نقلی دلائل سے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرزا صاحب ویسے ہی نبی تھے جیسے حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ ہیں۔ خدا کی وحی میں ان کے لئے مطلق نبی و رسول کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان کا منکر پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس کے جواب میں مولوی محمد علی نے النبوة فی الاسلام تالیف کی جو 1917ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں مسئلہ ختم نبوت پر عمدہ بحث ہے اور قادیانیوں کے موقف کی تردید ہے۔ ان کی اس مسئلہ پر ایک اور کتاب آخری نبی ہے۔

ختم نبوت پر کامل ایمان اور ختم نبوت کے متعلق علامہ اقبال کا عقیدہ ان کے ایک مضمون میں مذکور ہے جو رسالہ لمعات میں شائع ہوا۔ وہ لکھتے ہیں ”جو شخص نبی کریمؐ کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی

یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ (44)

ان تحریرات سے عیاں ہے کہ علامہ اقبال کا ختم نبوت پر غیر متزلزل ایمان تھا اور اس پر وہ ہمیشہ قائم رہے البتہ قادیانیوں یا لاہوریوں کے ساتھ کسی بحث مباحثے یا مناظرے میں نہ اچھے کیونکہ اس کو وہ طبعاً ناپسند کرتے تھے اور اسے تفسیح اوقات سمجھتے تھے۔

اختر حسین گیلانی لکھتے ہیں:

’علامہ اقبال کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ نہ تو حضرت مرزا صاحب نے دعویٰ نبوت کا کیا اور نہ ہی غیر از جماعت مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے اور یہی مسلک جماعت احمدیہ لاہور کا ہے۔

اگر سر محمد اقبال کو ذرا بھی خیال ہوتا کہ بانی تحریک احمدیت نے دعویٰ نبوت کیا ہے اور مخالف مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے تو ناممکن تھا کہ وہ خطبہ علی گڑھ میں تحریک احمدیت کو ’اسلامی سیرت کا ٹھیکہ نمونہ‘ قرار دے کر اس کی توصیف کرتے۔ آپ کی یہ تقریر یہی ظاہر کرتی ہے کہ آپ کو یقین تھا کہ حضرت مرزا صاحب نہ مدعی نبوت ہیں نہ اپنے منکر کو کافر کہتے ہیں اور نہ غیر اسلامی، مجوسی، اسرائیلی یا آریائی تصوف کے حامل ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ یقین اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ جب مرزا محمود احمد صاحب نے 1914ء میں اپنی خلافت کے ساتھ مسیح موعود کی منوت اور مسلمانوں کی تکفیر کا اعلان کیا تو علامہ اقبال نے بیان بھی نہایت محفوظ الفاظ میں دیا کہ:

’جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہے تو وہ

خارج از اسلام ہے اگر قادیانی جماعت کا بھی یہ عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔‘

گویا علامہ اقبال جانتے تھے کہ حضرت مرزا صاحب نے نبی کا لفظ اپنی تحریرات میں استعمال کیا ہے لیکن اس معنی میں نہیں کہ اس نبوت پر ایمان نہ لانے والے اسلام سے خارج ہیں اور علامہ کے نزدیک اگر کوئی شخص ایسے نبی کی آمد کا قائل ہو تو جس کا انکار مستلزم کفر نہیں تو وہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اسلام سے صرف اس وقت خارج ہوتا ہے جب کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہے۔‘

اس بیان میں علامہ اقبال بانی تحریک احمدیت اور جماعت احمدیہ لاہور کو کلیتاً مستثنیٰ کر دیتے ہیں۔ (45)

در اصل علامہ اقبال ان کو مستثنیٰ قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ تو ایک اصول اور عقیدہ بیان کر رہے تھے چونکہ لاہور جماعت نے اپنے عقیدہ میں تبدیلی کر لی تھی اور مرزا صاحب کو مجدد اور ولی کامل کہتے تھے اور ان کی نبوت کو ولایت کا ایک اعلیٰ درجہ قرار دیتے تھے اس لئے اپنے تبدیل شدہ عقیدے کی رو سے اس زد میں نہ آنے کے دعویدار تھے۔ اگر مولوی محمد علی، ڈاکٹر بشارت احمد وغیرہ کے سابقہ عقائد کو دیکھا جائے تو وہ بھی اس زمرے میں آتے تھے لیکن اب انہوں نے اپنا عقیدہ بدل لیا تھا اس لئے وہ از خود اس دائرے سے نکل گئے۔ اس کے باوجود وہ غیر مسلم اقلیت قرار پائے اور مسلمانوں نے انہیں منافق کہا۔ علامہ اقبال نے بھی 1935ء میں دیئے گئے اپنے بیان میں کہا کہ احمدیت کے اصل عقائد اور اس کی اسلام سے بغاوت کی روح ترجمان جماعت احمدیہ قادیان ہے۔ (موجودہ جماعت احمدیہ ربوہ جماعت احمدیہ قادیان ہی کا تسلسل ہے۔ مصنف)

رموز بے خودی

مثنوی اسرار خودی (1915ء) کا دوسرا حصہ رموز بے خودی (مطبوعہ 1918ء) میں علامہ اقبال عقیدہ ختم نبوت کو صراحت سے بیان کرتے ہیں:

پس خدا برما شریعت ختم کرد
بر رسول ﷺ ما رسالت ختم کرد
لانی بعدی ز احسان خدا است
پردہ ناموس دین مصطفیٰ ﷺ است
حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال رضا کی رائے

اختلاف جماعت احمدیہ کے بارے میں

(اس مضمون سے ۵۰ اکٹوبر ۱۹۵۷ء کے انجمن میں سیدنا شاہ سیالکوٹی کی ایک تحسیر شیخ مولیٰ علی پیر کے مابین ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب و ذیل یعنی لاسل فرماتے ہیں)

لاہور - ۱۳ دسمبر ۱۹۵۷ء

محذومی ڈاکٹر صاحب پیغام صلح - اسلام علیکم

۵۰ اکٹوبر ۱۹۵۷ء کے انجمن میں سیدنا شاہ سیالکوٹی نے ایک تحسیر بعنوان جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے اختلاف جماعت احمدیہ کے بارے میں پیش فرمائی ہے۔ اس تحریر کے معلق میرے اکٹوبر ۱۹۵۷ء کے خطوط و نیزہ مجھ سے دریافت کیا ہے۔ فردا فردا جواب دینے سے قاصر ہوں، لہذا آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مزاجہ ذیل مسطورہ لکھ کر اپنے اخبار میں شائع کر دے کہ کچھ مضمون فرمائیے۔

میرے دست سے اسباب سلسلہ احمدیہ کے ساتھ لکھا گیا ہے اور جب کہی مجھے یہ نکتہ جاننے کا اتفاق ہوتا ہے تو اکثر مومنین گفتگو کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تحریر کو غصہ میں ہی جب میں سیالکوٹی میں تھا تو ایک سے زیادہ موقع گفتگو کے پیدا ہوئے لیکن مجھے یہ یاد آتا تھا کہ سیدنا شاہ صاحب کو جسے موقع گفتگو کا ذکر اپنا تحسیر میں فرماتے ہیں۔ چونکہ ان کی تحریروں میں سیدنا شاہ صاحب کی طرف اشارہ ہے اور وہ کہتے ہیں کہ سیدنا صاحب کو صوف کے مسل پر ہیں لہذا کہنا کہ ان کی جماعت حق پر ہے اور مجھے جلد ہی وہ وہاں سے ہے اس واسطے اپنے حق پر اعتبار نہ کر کے میں شیخ و غیر احمد صاحب کو صوف کو خدا کا کلمہ کہ جس کا وہ جتنے بوس بخت کے متعلق ہے۔ ذیل میں درج کرتا ہوں۔ تاکہ میرے احباب کو اصل کیفیت سے آگاہ ہو سکیں۔

پیشینہ لاہور - ۲۵ اکتوبر

برادر محترم و مخلص اسلام علیکم ورحمۃ اللہ

ابھی آپ کا خط ملا۔ تحریر کا مضمون میرے جواب تھا۔ سیدنا کوئی تشویش فرماتے۔ لاہور میں وہیں تھا۔ آپ کے دوست کے پر انعام اندر میرے برادر گیا تھا۔ اور وہ کہہ اصرار و حرک باتیں سب عادت کرتا رہا تھا۔ مگر اس نے

سوال دہاں لکھ دیا کہ میں ہی۔ تادیان پادری اور دھرم پادری کا وہ ذکر کرتا رہا۔ گفتگو کا اہمیت مجھے یاد نہیں کر گیا تھی۔ بالائی یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کوئی سوال آپ سے نہیں کیا تھا۔ سیدنا شاہ صاحب سے آپ نے یہ بات فرمائی تھی۔ وہ عادتاً مبالغہ آمیز باتیں کرنے کا مادی ہے۔ چاروی گفتگو نہ کیوں اس کی کسی نے سمجھی ہے اور نہ ہی وہ خود بے جا وہ کہہ سکتا ہے۔ ایک فقرہ کے کوئی بھی نتائج اخذ کیا کرتے ہیں انہیں معذور نہ کہنا چاہیے۔

انہوں نے سیدنا شاہ صاحب نے میرے الفاظ کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ جن میں غلط فہمی ہوئی ہو۔ ایک شخص کو کسی خاص فرقے سے تعلق نہ تھا۔ وہ عقائد اور دھرم کی گفتگو سے وہی الفاظ مطلب یاد رکھتا ہے۔ جو اس کے عقیدہ مطلب ہوں، اور سباقی الفاظ فراموش کر جاتا ہے۔ اسی بات مزید ہے کہ میں نے کتاب حقیقت البتہ لکھی ہے مبالغہ آمیز کی ترتیب کے تعویذ کی تھی۔ مگر اس کے خلاف پڑنے دینے کا مجھے حق حاصل نہیں۔ چونکہ اختلاف سلسلہ احمدیہ کے معلق وہی شخص واسطے دے سکتا ہے۔ جو مرزا صاحب رحمہ کی تصانیف سے نفرت ہے۔ آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں ہے اس کے علاوہ یہ بات یہی ہے کہ ایک فیضان احمدی سلمان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو وہ کسی طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے تادیان والے بچے ہیں۔

محمد اقبال لاہور

(پیغام صلح ۲۵ دسمبر ۱۹۵۷ء)

ماہنامہ روح اسلام لاہور دسمبر ۱۹۶۸

حوالے و حواشی

(1) ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، روایات اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ص: 30

(2) اکبر شاہ نجیب آبادی، حیات نور الدین، لاہور، 1966ء، ص: 140

(3) شیخ یعقوب علی عرفانی، حیات احمد، جلد دوم ص: 423

(4) ینگ مین احمد یہ ایسوسی ایشن لاہور نور الدین اعظم ص 1

(A-4) حکیم نور الدین کے علاوہ بعض مفسرین نے بھی بائبل کی روایت کی بنیاد پر لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں فرعون مصر کا بادشاہ تھا۔ قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام کے ہم عصر بادشاہ کو ”فرعون“ کے نام سے یاد نہیں کرتا اور مصریات کے جدید محققین بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ہم عصر مصری بادشاہ فرعون نہیں تھا۔ اس کا تعلق ”عمالقہ“ سے تھا جب کہ فرعون قبلی النسل تھے۔

(5) ڈاکٹر سلیم اختر، علامہ اقبال حیات فکر و فن سنگ میل پہلی کیشنز لاہور 2003 مقالہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اقبال کی موعودہ تصانیف ص 224

(6) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 58

(7) زندہ رود ص 576

(8) بیگم رشیدہ اقبال، علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال، فیروز سنز کراچی 1999ء ص 82 پر لکھتی ہیں کہ یہ خطوط علامہ اقبال کی چھوٹی بہن کریمہ بی بی کی کارستانی تھی۔

(9) عبدالحجید سالک کے والد محترم اور بھائی قادیانی تھے شورش کاشمیری نے ان کی کتاب ذکر اقبال کی روایات اور ان کی قادیان نوازی پر تنقید کی ہے۔ (اقبالی مجرم مکتبہ چٹان، لاہور، 1974ء ص: 23 تا 37) سالک صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ وہ احمدی نہیں لیکن وہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے پیروؤں کو کافر نہیں سمجھتے۔ (نوازش نامے مرتبہ سید انیس شاہ جیلانی صفحہ 16)

(10) یہ حکیم نور الدین صاحب کا عجیب و غریب القاب ہے کہ سورہ قلم کی آیت نمبر 44 کے الفاظ کو آگے پیچھے کر کے لکھ دیا ہے جس کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔

(11) شیخ عبدالماجد تبدیلی کے بعد بریکٹ میں لکھتے ہیں (نقل مطابق اصل) فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 60

(12) ایضاً

(13) شیخ عبدالمجید اقبال اور احمدیت ص 55 نیز زندہ رود جلد سوم ص 572

(14) محمد حنیف شاہد، مفکر پاکستان، سنگ میل پہلی کیشنز لاہور ص 212-216 نیز زندہ رود حصہ دوم ص 152

(15) ایضاً

(16) اخبار الحکم، 26 مارچ 1908ء

(17) ملک صلاح الدین اصحاب احمد جلد 11 ص 276

(18) بیگم رشیدہ آفتاب اقبال، علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال، فیروز سنز کراچی اگست 1999ء ص

138

(19) بیگم رشیدہ آفتاب اقبال، حوالہ سابق۔ 1999ء ص 131 اور ص 133۔ نیز ایک قادیانی بزرگ نے مصنف

کو بتایا کہ آفتاب اقبال نے اپنے ایک دوست سے ایک بے تکلفانہ ملاقات میں کہا کہ قادیانی اساتذہ ان کو تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ کبھی کہتے کہ استخارہ کرو مرزا صاحب کی صداقت تم پر کھل جائے گی، کبھی لڑیچ پڑھنے کو دیتے اور کہتے کہ اس سے تمہیں شرح صدر حاصل ہوگا، کبھی کہتے تمہارا تایا شیخ عطا محمد بھی تو احمدی ہے تم کیوں نہیں بیعت کر لیتے، کبھی ان کے ہم جماعتوں کے ذریعے بیعت فارم پر کرنے کے لئے بھجواتے، لیکن اپنے تانا حافظ ڈاکٹر عطا محمد کی تصوف کے ایک سلسلے میں بیعت اور بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے انہوں نے احمدیت قبول نہ کی اور ہر قسم کا لالچ ٹھکرا دیا، مسلمان ان کو قادیانی کہتے رہے لیکن کسی قادیانی نے ان کو قادیانی نہیں کہا۔

خواجہ نور کاشمیری، سابق ڈپٹی کنٹرولر نیوز ریڈیو پاکستان اسلام آباد نے بھی مصنف کو بتایا کہ آفتاب اقبال نے ان سے ایک ملاقات میں کہا کہ انہوں نے کبھی بھی قادیانی مذہب اختیار نہ کیا اور وہ قادیانیوں کو گمراہ اور خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔

(20) اخبار بدر 27 اکتوبر 1910ء

(21) قادیانی عقائد کے سلسلے میں دیکھیں حوالہ نمبر 38

(22) خواجہ کمال الدین، مجدد کامل، مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل برائڈر تھ روڈ لاہور دسمبر 1930ء ص 40

(23) مجدد کامل ص 38

(24) اس کا عنوان تھا مسلمان وہ ہے جو سب ماموروں کو مانے۔ یہ مضمون ماہنامہ تشبیذ الاذہان، قادیان،

اپریل 1911ء میں شائع ہوا

(26) Mirza Mahmud Ahmed, The Truth About Split, Ahmadiyya Foreign Mission Rabwah, 1965, P. 239

(27) Ibid. P. 261

(28) خواجہ کمال الدین، اختلافات سلسلہ احمدیہ کے اسباب، لاہور دسمبر 1914ء، ص: 26

(29) پیغام صلح لاہور، 17 مئی 1941ء

(30) Lavan Spencer, Ahmadiyya Movement, Delhi, 1974, P. 126

(31) The Truth About Split, P. 267

(32) Spencer, op. cit. pp. 126-128

(33) ذکر اقبال، بزم اقبال 1955 ص 57

(34) علامہ اقبال کی تحریریں، تقریریں اور بیانات، مترجم اقبال احمد صدیقی، اقبال اکادمی پاکستان، ص 148

(35) ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، مرغوب انجمنی لاہور 1919ء

(36) ڈاکٹر محمد ریاض، افکار اقبال، ص: 64

(37) ملت اسلامیہ، ایک عمرانی مطالعہ از علامہ اقبال، مترجم شاہد اقبال کامران، ص: 15

(38) احمدیت کی بہائیت سے خوشہ چینی کرنے کے متعلق بہت سائلرچر شائع ہو چکا ہے۔ امرتسر کے مولانا محمد عالم

آسی نے اپنی کتاب الکاویہ علی الغاویہ میں اس کو ثابت کیا ہے۔

پنجاب کے ایک مسلمان محقق نے اپنے قلمی نام فوکس سے ایک کتاب ہزہولی نس (1935ء) میں

قادیانیت اور بہائیت کی باہمی مماثلت کا ذکر کیا ہے۔ ان کی کتاب میں یہ باب علامہ اقبال کے ایماء پر

شامل کیا گیا۔ علامہ اقبال نے 1932ء میں جاوید نامہ ص 235 میں کہا کہ بہاء اللہ نے حج منسوخ کر دیا اور

مرزا غلام احمد نے جہاد حرام قرار دیا۔

راقم کی کتاب بہائیت، اسرائیل کی خفیہ سیاسی تنظیم، اسلامک سنڈی فورم، راولپنڈی میں اس موضوع پر بحث

کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ احمدیت کے فکری سوتے بابت اور بہائیت سے پھوٹے اور احمدیت بہائیت

کا ہندی ایڈیشن ہے۔

اس سلسلے میں ایک نہایت عمدہ کتاب دین بہائی اور احمدیت سید محمد علی شاہ نے 2001ء میں شائع کی۔ یہ

بہائی پبلشنگ ٹرسٹ کراچی کی پیش کش ہے۔ اس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ قادیانیت نے بہائیت سے

ایک بڑا حصہ مستعار لیا ہے۔

مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور نے اپنی تصنیف تحریک احمدیت میں مرزا محمود کے معتقدات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ یا تو جماعت احمدیہ (قادیان) مرزا صاحب کو نبی ماننے اور تکفیر مسلمین کے عقائد سے رجوع کر لے گی یا اس کے تعلقات مسلمانوں سے ایسے رہ جائیں گے جیسے بایوں اور بہائیوں سے ہیں۔ اپنے نظر نظر کی وضاحت میں وہ کہتے ہیں:

’ہاں یہ سچ ہے کہ حضرت مسیح موعود کے پیروں میں سے ایک گروہ یعنی جماعت قادیان نے حضرت مرزا صاحب کو مدعی نبوت قرار دیا ہے لیکن ابھی تک وہ درمیانی حالت میں ہیں۔ اگرچہ اس نبوت کے نتیجے کے طور پر انہوں نے روئے زمین کے کل مسلمانوں کو کافر کہا ہے مگر ابھی تک کوئی نیا کلمہ اپنے لئے تجویز نہیں کیا یعنی عقیدہ تا وہ یوں تو مانتے ہیں کہ کوئی شخص جب تک حضرت مرزا صاحب پر ایمان لا کر آپ کی بیعت نہ کرے اس وقت تک دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتا مگر کوئی اپنا الگ کلمہ بنانے سے انکار کرتے ہیں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ہی اقرار کرتے ہیں۔ یہ ایک درمیانی اور تذبذب کی حالت ہے اور بالآخر وہ حضرت مسیح موعود کی نبوت کے عقیدہ سے رجوع کریں گے یا اپنا الگ کلمہ اور الگ مذہب بنالیں گے کیونکہ ان کے اس عقیدہ کا کہ جو شخص حضرت مرزا صاحب کو نبی قرار دیکر ان پر ایمان نہیں لاتا وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے یہ لازمی نتیجہ ہے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ منسوخ ہے۔ جب اس کلمہ کے اقرار سے کوئی شخص دائرہ اسلام میں ہی داخل نہیں ہوتا بلکہ چالیس کروڑ (اب ایک ارب) مسلمان جو اس وقت اس کلمہ کا اقرار کرتے ہیں وہ بھی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتے ہیں تو اس کلمہ کو لازماً منسوخ کہنا پڑے گا اور جس نبی پر ایمان لانے سے لوگ اب دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں اس کی رسالت اور نبوت کا اقرار تو حید کے ساتھ کلمہ کا لازمی جزو قرار پائے گا اور اگر حضرت مرزا صاحب کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنے سے رجوع نہ کیا گیا تو کل کو اس بنیاد پر یقیناً ان لوگوں کا الگ کلمہ اور الگ مذہب ہو جائیگا اور پھر ان کے تعلقات اسلام سے ایسے ہی رہ جائیں گے جیسے بایوں یا بہائیوں کے ہیں کہ وہ اسلام کو اپنے وقت کا سچا مذہب مانتے ہیں مگر اس زمانہ کے لئے وہ بالی یا بہائی مذہب کو ہی سچا قرار دیتے اور اسلام اور اس کے کلمہ کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ اس وقت جماعت قادیان کا پاؤں دو کشتیوں میں ہے ایک طرف وہ چالیس کروڑ کلمہ گو کو کافر قرار دیتے ہیں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اقرار سے کسی کا مسلمان ہو جانا نہیں مانتے بلکہ باوجود اقرار کلمہ اسے کافر کا کافر ہی سمجھتے ہیں اور دوسری طرف اپنے آپ کو مسلمانوں میں بھی داخل کرتے ہیں اور اپنا الگ مذہب اور الگ کلمہ بنانے سے انکار کرتے ہیں۔ مگر یہ حالت بہت دیر تک نہیں رہ سکتی۔ یا تو اس عقیدہ کا گھنونا

پن ان کے کثیر حصہ کو بالآخر اس سے متفر کر دیا اور وہ حضرت مرزا صاحب کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنا چھوڑ دیں گے اور یا جو اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ منسوخ قرار پائے اور ایک نیا کلمہ تجویز ہوا اسے قبول کر لیں گے۔“ مولوی محمد علی، تحریک احمدیت لاہور 1930ء، ص: 170-172

مختلف ادوار میں کئی قادیانی بہائی ہوئے جن میں محفوظ الحق علمی نائب مدیر الفضل، ماسٹر عبدالصمد، احمد علی یزدانی، مہر محمد شہاب مالیر کوٹلوی، عبداللہ وکیل کشمیری اور ربوہ کے بعض افراد شامل ہیں۔

مندرجہ بالا حوالے قادیانیت کے متعلق علامہ اقبال کے نقطہ نظر کی صحت کو ثابت کرتے ہیں۔

(39) اختر حسین گیلانی، تحریک احمدیت اور اقبال، احمدیہ انجمن لاہور 1944ء، ص 7

(40) علامہ اقبال، نواب محمد سلیم خان رئیس

(41) شیخ رحمت اللہ، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، ڈاکٹر سید محمد حسین، میاں چراغ دین اور مرزا سلطان احمد خان

(42) سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور ص 5-6

(43) لاہور جماعت کا ماہنامہ روح اسلام لاہور دسمبر 1968ء ص 21-22

(44) الفضل قادیان 11 اپریل 1916ء مضمون از ڈاکٹر محمد اقبال مندرجہ رسالہ لمعات۔ علامہ اقبال کے اس مضمون

یا بیان کی کاپی راقم کو دستیاب نہیں ہو سکی۔ ماہرین اقبالیات اس رسالے کا کھوج نکال کر پورا مضمون عوام کے سامنے لائیں۔ پروفیسر الیاس برنی نے اپنی کتاب قادیانی مذہب ص 46 پر بھی یہ حوالہ دیا ہے۔

(45) اختر حسین گیلانی، تحریک احمدیت اور اقبال، انجمن احمدیہ لاہور، 1944ء، ص 16-17

علامہ اقبال عملی سیاست میں

1926ء میں علامہ اقبال عملی سیاست میں آ گئے۔ وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے کونسل میں محاصل، خصوصاً لگان کی تخفیف اور مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے مسائل کے حل کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرائی۔

1927ء میں برطانوی حکومت نے آئینی اصلاحات پر رپورٹ تیار کرنے کے لئے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ کمیشن کی آمد سے قبل سرفضل حسین نے علامہ اقبال کو ایک مسلم وفد کے سربراہ کے طور پر لندن جا کر ان کے وضع کردہ مسلم مطالبات سے سکریٹری آف سٹیٹ کو روشناس کرانے کی تجویز پیش کی۔ اس کے لئے مناسب فنڈ جمع کرنے کی ضرورت تھی علامہ اقبال نے اس بات سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اس کا ذکر فضل حسین کے فرزند عظیم حسین نے ان کی سوانح حیات میں کیا ہے۔ اقبال کے انکار کے بعد سرفضل حسین نے چوہدری ظفر اللہ کو یہ کام سونپا اور وہ یہ وفد لے کر لندن گئے۔ اس سے قبل فضل حسین علامہ اقبال کو پنجاب کونسل میں پارٹی صدر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے یونیونسٹ پارٹی پر تنقید جاری رکھی اور ان کی جگہ سر شہاب الدین نے صدارت سنبھال لی۔ (1)

1927ء سے 1935ء کا زمانہ مسلمانوں کی تحریک آزادی میں اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک طرف ہندوؤں اور دوسری طرف برطانوی حکومت سے اپنے سیاسی مطالبات منوانے کے لیے کوشاں تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی اور آئینی مطالبات رفتہ رفتہ تشکیل پاتے رہے اور مختلف ادوار اور سیاسی پلیٹ فارموں سے ابھر کر سامنے آتے گئے تا وقتیکہ ان کو قبولیت عامہ کا درجہ حاصل ہوا۔ یہ ان کی مشترکہ کاوش اور جدوجہد پیہم کا نتیجہ تھا اور زعماء ملت کی سیاسی بصیرت اور اجتماعی تگ و دو کا ثمرہ تھا۔

فرقہ وارانہ مسئلہ

15 فروری 1927ء کو مرزا محمود نے وائسرائے ہند لارڈ ارون کو ایک خط لکھا جس میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ پر اپنی رائے دی۔ (2) انہوں نے کہا کہ برطانیہ کو اس وقت تک ہندوستانیوں کو اقتدار نہیں دینا چاہیے جب تک اقلیتوں کی پوزیشن محفوظ نہ ہو۔ انہوں نے جداگانہ طریق انتخاب کی حمایت کی اور طریق انتخاب میں تبدیلی کے لئے اسمبلی میں کسی کمیونٹی کے کل تعداد کے ۳/۴ نمائندوں کے اتفاق کو لازمی قرار دیا۔

مارچ 1927ء میں بعض مسلم زعماء نے مسلمانوں کے آئینی مطالبات ”تجاویز دہلی“ کی صورت میں پیش کئے جن میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی، مسلمانوں کی مرکزی اسمبلی میں 1/3 نشستیں اور مخلوط انتخاب کو بعض شرائط سے قبول کر لینا شامل تھا۔ سر شفیع، سر فضل حسین اور علامہ اقبال جداگانہ انتخابات کے زبردست حامی تھے۔ اس اہم سوال پر دو مسلم لیگیں شفیع لیگ اور جناح لیگ بن گئیں۔ شفیع لیگ کا اجلاس دسمبر 1927ء میں لاہور میں ہوا اور جناح لیگ نے اپنا اجلاس کلکتہ میں منعقد کیا۔ کانگریس نے پہلے ان تجاویز کو مان لیا لیکن بعد میں انکار کر دیا۔

سائمن کمیشن

واضح رہے کہ مسلمان جداگانہ طریق انتخاب چھوڑنے کے حق میں نہ تھے لیکن ہندوؤں سے اہم سیاسی مطالبات منوانے کے لئے مجبوراً اپنے رویہ میں لچک پیدا کر رہے تھے تاکہ ہندوؤں سے مفاہمت کی کوئی راہ نکل آئے اس کی مثال معاہدہ لکھنؤ 1916ء تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہوا اور جب حکومت ہند نے 8 نومبر 1927ء کو سر جان سائمن کی سربراہی میں ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا تا کہ ہندوستان کے آئینی مسائل اور نئی اصلاحات پر ایک رپورٹ مرتب کی جائے تو سیاسی صورت حال بدل گئی۔ یہ کمیشن 1928ء میں بمبئی پہنچا۔ کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کیا مسلم لیگ (جو پہلے ہی

دو حصوں میں بٹ گئی تھی) کے ایک دھڑے شفع لیگ نے تعاون کا اعلان کیا اور جناح لیگ نے اس کی مخالفت کی۔

سائمن کمیشن اور جماعت احمدیہ کے تجویز کردہ مطالبات

مرزا محمود نے افضل قادیان کے شمارے 6 دسمبر 1927ء میں ایک مضمون مسلمانان ہند کے امتحان کا وقت شائع کرایا جس میں مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ مندرجہ ذیل مطالبات کی تیاری کریں اور کمیشن کا بائیکاٹ نہ کریں۔

- 1 اقلیتوں کا تحفظ
- 2 ادنیٰ اقوام (اچھوتوں) کو ابھاریں اور ان کی تنظیم میں مدد دیں اور کمیشن کے سامنے ان کے معاملہ کو پیش کریں۔
- 3 جداگانہ طریق انتخاب کی ضرورت
- 4 پنجاب، بنگال اور جو آئندہ مسلم اکثریت کے صوبے بنیں ان میں ان کو اس قدر حقوق دئے جائیں کہ ان کی کثرت قلت میں نہ بدل جائے۔ بنگال کے 56% مسلمانوں کو 40% اور پنجاب کے 55% کو قریباً 45% حق ملا ہے اس لئے مسلمان کسی صوبے کو اپنا نہیں کہہ سکتے اور آزاد ترقی کے لئے کوئی راستہ کھلا نہیں ہے۔ صوبہ سرحد میں اصلاحی طریق حکومت کی کوشش ہونی چاہیے۔ (3)
- 5 سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ قرار دیا جائے۔
- 6 مذہبی آزادی کی ضمانت دی جائے
- 7 تبلیغ کی آزادی ہو
- 8 مسلمانوں کو اردو زبان کی تعلیم کی اجازت اور اس کو بعض صوبوں میں قانونی زبان کا درجہ دیا جائے۔

یہ مسلمانوں کے عام مطالبات تھے۔ جن کو وہ مختلف سیاسی پلیٹ فارموں سے پیش کرتے چلے

آئے تھے۔ تجاویز دہلی مارچ 1927ء میں (جداگانہ انتخاب کے علاوہ) یہ مطالبات موجود تھے ان میں سے بعض مطالبات مرزا محمود نے اپنے مضمون میں دہرائے بعد میں اس اردو مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے اس کی ہندوستان اور بیرون ملک تشہیر کی۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو سیاسی مدبر، مسلمانوں کے حقوق کے ہمدرد اور ان کے بعض آئینی مطالبات کے حامی کے طور پر پیش کیا۔ شیخ عبدالماجد نے مرزا محمود کی تجاویز کا شفیع لیگ کے سائنس کمیشن کو پیش کئے جانے والے میمورنڈم کے بعض حصوں سے تقابل کیا ہے (4) لیکن میمورنڈم کے تمام مطالبات کا ذکر نہیں کیا تا کہ ان کی جامعیت کے مقابلے میں مرزا محمود کی پیش کردہ تجاویز کی وقعت کم نہ ہو جائے۔

شفیع لیگ کے مطالبات اور علامہ اقبال

مرزا محمود کی اجمالی تجاویز کے مقابلے میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے جامع مطالبات مرتب کئے وہ شفیع لیگ کے سکریٹری تھے انہوں نے سائنس کمیشن کو پیش کئے جانے والے میمورنڈم میں مندرجہ ذیل اہم مطالبات شامل کرائے

1 مکمل صوبائی خود مختاری، صوبائی مقننہ کے لئے بالغ حق رائے دی۔

2 مرکزی مقننہ میں نشستوں کا اضافہ

3 بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ

4 جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو مذہبی حقوق اور سیاسی اداروں میں موثر نمائندگی دی جائے۔

5 مرکزی اور صوبائی کابینہ میں خاص تحفظات۔ سرکاری ملازمتوں میں مناسب حصہ، مسلم طلباء کے داخلوں پر پابندی کا خاتمہ وغیرہ

6 ہندوستان کے آئندہ دستور کی وفاقی نوعیت اور مابقی اختیارات صوبوں کو تفویض کرنا

7 وائسرائے کی آٹھ رکنی کابینہ میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی

8 صوبوں میں دو عملی (ڈیپارٹی) کا خاتمہ

9 محصول آمدنی وصولی اور خرچ کرنے کا صوبوں کا اختیار اور

10 صوبہ جاتی یا مرکزی مقننہ کسی ایسے مسودہ قانون کو جس کا تعلق کسی مذہب سے ہو منظور نہ کرے

اگر متعلقہ فرقہ کے 3/4 اراکین اس کے خلاف رائے دیں۔ (5)

یہ اہم آئینی امور شفیع لیگ کے میمورنڈم میں شامل کئے گئے۔ 5 نومبر 1928ء کو ایک وفد نے یہ میمورنڈم سائن کمیشن کو پیش کیا جس کے ایک رکن علامہ اقبال تھے۔ اس سے قبل انہوں نے صوبائی خود مختاری کے سوال پر شفیع لیگ کی سکریٹری شپ سے استغاثہ پیش کر دیا تھا جس کے باعث لیگ نے اس اہم مطالبہ کو مان لیا۔ علامہ اقبال نے نہ صرف یہ اہم امور میمورنڈم میں شامل کرائے بلکہ کمیشن کے سامنے شفیع لیگ کے میمورنڈم کی وکالت کی یہ مطالبات ہر لحاظ سے مرزا محمود کی مختصر تجاویز سے کہیں وسیع اور جامع تھے اور علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت کے غماز تھے۔ اس میں ایسے بنیادی مطالبات پیش کئے گئے ہیں جو ہندوستان کے آئینی مسئلے کے حوالے سے مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے ضامن تھے۔

1920ء کی دہائی کے آخری سالوں میں لاہور جماعت کے ترجمان اخبار پیغام صلح اور ہفت روزہ لائٹ لاہور مرزا محمود کے سیاسی تدبیر پر تنقید کرتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ پہلے تو وہ سیاست میں حصہ لینے کے ہی سخت خلاف تھے اور اسے شجر ممنوعہ قرار دیتے تھے پھر ہندوستان میں 1913ء سے 1927ء تک اٹھنے والی آزادی کی تحریکوں، سانحہ کانپور، خلافت، رولٹ ایکٹ، عدم تعاون کی تحریکات، وغیرہ کے اشد مخالف اور انگریز کے پرزور حامی تھے اور ان کو ناکام بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے اب انہوں نے یک دم ایک نیا روپ دھار لیا ہے اور مسلم مفادات کے ہمنوا بن گئے ہیں۔ شاید کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔

سردست ہم یہ مان لیتے ہیں کہ شیخ عبدالماجد کے بقول مرزا محمود نے یہ سب کچھ مسلمانوں کی ہمدردی میں کیا۔ (6) لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ گورداسپور اور لاہور میں احمدیہ جماعت کے وفود نے کمیشن کو ”احمدی نقطہ خیال سے سیاسی امور پر مبنی“ علیحدہ میمورنڈم کیوں پیش کئے۔ اگر انہیں مسلم

مطالبات سے اتفاق تھا تو ان کو پیش کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ وفد نے کمیشن کے ممبران کو سلسلہ احمدیہ کی کتابیں دیں اور سیاسی امور سے قبل سلسلہ احمدیہ کے حالات سنائے جس پر کمیشن کے صدر جان سائمن نے کہا کہ وہ سلسلہ احمدیہ کی اہمیت کے قائل ہیں اور رائے دہی اور تعاون کے شکر گزار ہیں۔ (7) لاہور میں جس 16 رکنی وفد نے اپنا میمورنڈم کمیشن کو پیش کیا اس پر بقول دوست محمد شاہد مولف تاریخ احمدیت اور ”حوالوں کے بادشاہ“ 5 لاکھ افراد کے دستخط تھے۔ مرزا محمود نے خطبہ جمعہ (10 فروری 1928ء) میں اعلان کیا ”دوسرے مسلمان بھی قربانیاں کرتے ہیں مگر اعلیٰ نتائج نہیں نکلتے اس کے مقابل میں جماعت احمدیہ میں نصرت اور تائید الہی کا عجیب نظارہ نظر آتا ہے جس کی صرف یہی وجہ ہے کہ صحیح راستہ اختیار کئے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ (8)

ان علیحدہ یادداشتوں کی تفصیل قادیانی لٹریچر میں موجود نہیں جو ان کے جماعتی مفادات کے تحفظ کے لئے تھے۔ اگر ان کو مسلمانوں کے بعض یا تمام سیاسی مطالبات سے اتفاق تھا تو یہ احمدی نقطہ نظر سے سیاسی امور پر مبنی میمورنڈم کیا تھے اور الگ۔ یہ کیوں پیش کئے گئے، کیا قادیانیوں کا جماعتی مفاد مسلمانوں کے عام سیاسی مفادات سے الگ اور ان سے متصادم تھا۔ الگ میمورنڈم پیش کرنے کی قادیانی دو عملی اس کے بیس سال بعد پنجاب ہاؤنڈری کمیشن (1947ء) کے ممبر جسٹس محمد منیر کو بھی سمجھ میں نہ آئی جب قادیانیوں کی طرف سے شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ نے قادیان کی منفرد حیثیت کے بارے میں ہاؤنڈری کمیشن کو ایک علیحدہ میمورنڈم پیش کیا۔ جسٹس منیر سوال کرتے ہیں کہ اگر قادیانیوں کو مسلم لیگ کے موقف سے اتفاق تھا اور مسلم لیگ کا کس ان کی جماعت کا ایک سرکردہ فرد سر ظفر اللہ پیش کر رہا تھا تو پھر علیحدہ میمورنڈم پیش کرنے کی کیا وجہ اور ضرورت تھی جس سے مسلم مفادات متاثر ہوئے اور مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ (9)

کیا شیخ عبدالمجید 5 لاکھ دستخطوں سے پیش کردہ جماعت احمدیہ کے میمورنڈم کے مکمل متن کو جسے جماعت کے سرکردہ افراد پر مشتمل 16 رکنی وفد نے (جس میں ظفر اللہ شامل تھے) مارچ 1928ء میں لاہور میں سائمن کمیشن کے روبرو پیش کیا تھا شائع کرنے کی تجویز خلیفہ مسرور احمد

صاحب کی خدمت میں لندن روانہ کریں گے تاکہ ان میں درج احمدیہ مطالبات کا پتہ چل سکے۔ یہ تاریخی دستاویز اور گورداسپور کے مقام پر پیش کردہ میمورنڈم احمدیہ جماعت کے سیاسی موقف کے ترجمان ہیں۔ اب 77 سال گزرنے کے بعد ان کو شائع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ان کا مطالعہ تاریخ احمدیت کے طالب علموں کی معلومات میں اضافے کا موجب ہوگا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ 1921ء کی مردم شماری کے مطابق 56 ہزار احمدیوں نے پانچ لاکھ دستخط کیسے حاصل کئے اور ساڑھے چار لاکھ دستخط کرنے والے کون لوگ تھے۔

قادیانیوں کی جانب سے مسلم مطالبات کی تائید کی وجوہات

قادیانی 1906ء سے 1927ء کے لگ بھگ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی سے زیادہ تر الگ تھلگ رہے اور ان کی تمام تر سرگرمیاں انگریز سے تعاون اور آزادی کی تحریکوں کو ناکام بنانے میں صرف ہوئیں لیکن 1927ء کے بعد ان کے رویے میں تبدیلی رونما ہونے لگی جس کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں۔

1 قادیانی جانتے تھے کہ انگریز بذات خود ہندوستانیوں کو سیاسی مراعات دے رہا ہے اور آئینی اور دستوری اصلاحات کا عمل ایکٹ آف 1909ء اور 1919ء کے بعد جاری ہے اس لئے ان بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں ان کی سابقہ پالیسی غیر موثر ہو چکی ہے اب نئے دستوری نظام اور آزادی کے ابھرتے ہوئے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر اپنے جماعتی مفادات کا تحفظ کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو ملنے والی مراعات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ان کی تنظیموں میں گھسنا چاہیے اور ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ اس سلسلے میں انہیں گورنر پنجاب ملیکم ہیلی اور سر فضل حسین کا تعاون حاصل تھا۔

2 مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں اور مذہبی سطح پر نہیں تو کم از کم سیاسی سطح پر ان کے قریب آنے کی کوشش کی جائے تاکہ جماعت کی Isolation ختم ہو سکے۔

3 جماعت کے اہم افراد کو سیاسی معاملات کی تربیت دی جائے تاکہ وہ مسلمانوں کے سیاسی

اداروں مسلم لیگ وغیرہ میں شامل ہو سکیں۔ دوسرے ان کے بنیادی نقطہ نظر کی حمایت کرنی چاہیے تاکہ مستقبل میں اپنی جماعت کے لیے سیاسی تحفظ حاصل کیا جاسکے۔ جماعت کے سرکردہ افراد محض وفات و حیات مسیح اور اجرائے نبوت کے دلائل دینے کے ماہر نہ ہوں وہ سیاسی شعور حاصل کر کے مستقبل میں سیاسی کردار ادا کرنے کے قابل بھی ہو سکیں۔

مرزا محمود کا ایک دینی رہنما کے علاوہ ایک سیاسی مدبر کے طور پر امیج اجاگر کیا جائے جو مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد میں ان کا ساتھی اور ہمدرد ہے۔ پنجاب میں قادیانیوں نے اپنی قسمت یونی نٹ پارٹی سے وابستہ کر رکھی تھی۔ کل ہند سیاست میں ان کا کردار صفر تھا اس لئے وہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا لبادہ اوڑھ کر آگے بڑھے سرفضل حسین کی سرپرستی میں سرفطر اللہ قادیان اور ان کے درمیان اہم رابطہ تھا وہ ان کا انتہائی وفادار آلہ کار تھا جس سے وہ کوئی سی خدمت لے سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ فطر اللہ نے اپنی تحریروں میں اپنے محسن اعظم سرفضل حسین کی پالیسیوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ ایک مورخ، زاہد چوہدری لکھتے ہیں ”پنجاب میں جاگیرداروں کی یونی نٹ پارٹی کا قیام فضل حسین کی ’بے مثال‘ سیاسی تدبیر و بصیرت کا شاہکار نہیں تھا بلکہ یہ اس کی سیاسی زندگی کا ایک المیہ تھا۔ ایسے شخص کو کن عوامل نے مجبور کیا تھا کہ وہ پنجاب کے ایسے دقیانوسی جاگیرداروں کا لیڈر بن جائے جن کا ماضی شرمناک تھا، جن کا حال افسوس ناک تھا اور جن کا مستقبل عبرت ناک تھا۔ سرفطر اللہ اپنے محسن اعظم سرفضل حسین کے نقادوں کو ”خود ساختہ“ مورخ کہتا ہے اور طنز کرتا ہے کہ اگر فضل حسین نہ ہوتا تو ان نقادوں اور مورخوں میں سے اکثر کو کالج میں داخلہ بھی نہ ملتا۔ چونکہ فطر اللہ اپنے مذہبی عقیدے کے اعتبار سے خود بھی مضحکہ خیز، پست ذہن اور کوتاہ اندیش تھا اس لئے اس کی سیاسی فکر کی پرواز بھی ایک مرغی کی پرواز سے زیادہ نہ تھی۔ یہ فضل حسین کو بھی ”سیاسی پیغمبر“ کا درجہ دیتا ہے جس نے پنجابی مسلمانوں کی تقدیر سنوارنے کا معجزہ سرانجام دیا تھا۔ (10) 1920ء کی آخری دہائی میں قادیانی پالیسی سرفضل حسین اور

ظفر اللہ کے ایماء پر وضع کی جاتی رہی جس کے خدو خال مرزا محمود کے خطبات اور ان کی تحریروں میں نمایاں ہیں۔

نہرو رپورٹ پر تبصرہ 1928ء

صدر کانگریس موتی لال نہرو نے 28 دسمبر 1928ء کو کلکتہ میں ایک آل پارٹیز کانفرنس بلائی تاکہ نہرو رپورٹ کی توثیق کی جائے اس میں متحدہ قومیت اور مخلوط انتخابات کے حامی عناصر نے حصہ لیا۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے مفتی محمد صادق ناظر امور خارجہ اور دولت احمد خان جوائنٹ ایڈیٹر اخبار سلطان کلکتہ نے اس میں شرکت کی اور نہرو رپورٹ کے متعلق بعض تجاویز پیش کیں۔ ہندوؤں نے مسلم مطالبات کو نہ مانا، قائد اعظم اس سے بہت مایوس ہوئے اس کے جواب میں شفیع لیگ نے 31 دسمبر 1928ء کو آل پارٹیز کانفرنس دلی میں سر آغا خان کی صدارت میں مسلم مطالبات مرتب کئے اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اس کی تشہیر کی۔ اس کانفرنس میں سرفضل حسین کے ایماء پر قادیانیوں کے بیس نمائندوں نے شرکت کی۔ قادیانی وفد میں بنگال سے حکیم ابوطاہر محمود، حکیم خلیل احمد مونگھیری، پنجاب سے ظفر اللہ دہلی سے بابو اعجاز حسین اور مرکز قادیان سے مفتی محمد صادق شامل ہوئے۔ (11) اس کانفرنس کے مطالبات کی روشنی میں قائد اعظم نے مارچ 1929ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کئے۔

مرزا محمود احمد کی نام نہاد ”خود مختار مسلم ریاست“ کی تجویز

شیخ عبدالماجد نے جہاں اور کئی تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے وہاں یہ گل فشانی بھی کی ہے کہ مرزا محمود نے 1928ء میں بنگال سمیت پانچ اسلامی صوبوں کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں ”ہو سکتا ہے اس رائے پر مزید غور کے نتیجے میں کسی نکتہ پر بحث کی گنجائش نکل آئے۔ ہم علیحدہ مسلم وطن کے تصور کے خالق ہونے کا کریڈٹ حضرت امام جماعت احمدیہ کو نہیں دیتے لیکن نکتہ چینوں سے یہ گزارش کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ اگر اقبال، جنہوں نے 1930ء میں بنگال اور

آسام کو نظر انداز کر کے آدھے وطن کی تجویز پیش کی وہ بھی جو انڈین فیڈریشن کا حصہ ہو، تحریک آزادی کے ہیرو اور تصور پاکستان کے بانی و خالق قرار دیئے جاسکتے ہیں تو حضرت امام جماعت احمدیہ پر جنہوں نے اس سے دو سال قبل خود مختار مسلم ریاست کی تجویز پیش کی اور جس میں بنگال آسام کو بھی شامل کیا، آپ یہ فتویٰ کیسے صادر کر سکتے ہیں کہ وہ الگ وطن کی سکیم کو سبوتاژ کرنے والے تھے۔ (12)

شیخ عبد الماجد نے اتنا تو کیا کہ علیحدہ مسلم وطن کے تصور کے خالق ہونے کا کریڈٹ مرزا محمود کو نہیں دیا لیکن یہ ضرور کہا کہ پانچ اسلامی صوبوں پر مشتمل خود مختار مسلم ریاست کی تجویز انہوں نے 1928ء میں پیش کی۔ آئیے ان کے اس دعوے کی حقیقت کا جائزہ لیں۔

مرزا محمود احمد سائنس کمیشن کی آمد ہند فردری 1928ء کے بعد سیاسی امور پر رائے زنی کر رہے تھے۔ نہرو رپورٹ اگست 1928ء میں منظر عام پر آئی اس میں ہندوستان کے لئے نیم خود مختاری کا درجہ ڈومنین، امور دفاع و خارجہ انگریز کے پاس رہنے، نشستوں کے تعین کے بغیر مخلوط انتخابات، وفاقی (فیڈرل) کی بجائے وحدانی (یونی ٹری) طرز حکومت، سندھ کو بمبئی میں شامل رکھنے، مرکز میں مسلمانوں کو $\frac{1}{3}$ کی بجائے $\frac{1}{4}$ نمائندگی دینے جیسی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ کانگریس اور مسلم رہنماؤں کے اختلافات ایک تو شفیع لیگ کے سائنس کمیشن سے تعاون دوسرے ایک قابل قبول آئینی فارمولے پر اتفاق نہ ہونے کے باعث وسیع ہو چکے تھے۔ نہرو رپورٹ پر قائد اعظم کے اپنے تحفظات تھے۔ مسلم رہنماؤں نے 1927ء میں آل پارٹیز کانفرنس دلی کے پلیٹ فارم سے ہندوستان کے لئے ایک ایسے وفاقی آئین کا مطالبہ کیا تھا جس میں ماقبل اختیارات صوبوں کے پاس رہیں یہ صوبے مکمل خود مختار ہوں اور مسلمانوں کو زائد نمائندگی weightage دینے کا حق قائم رہے۔ اس کے ساتھ علیحدہ حق نیابت بھی برقرار رہے۔

مرزا محمود احمد نے افضل قادیان میں نہرو رپورٹ پر اپنے خیالات کا اظہار سات قسطوں (12 اکتوبر۔ 2 نومبر 1928) میں کیا اور پھر اسے کتابی شکل میں مسلمانوں کے حقوق اور نہرو

رپورٹ کے عنوان سے شائع کر دیا۔ (13) اس میں انہوں نے مسلمانوں کے عمومی مطالبات پر رائے دی اور کہا کہ حکومت کا ڈھانچہ فیڈرل (وفاقی) ہو اور تمام صوبوں کو اندرونی طور پر کامل خود مختاری حاصل ہو، اقلیت کو زیادہ حق نیا بت دیا جائے، صوبہ سرحد اور بلوچستان کو نیا بتی حکومت دی جائے، سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے صوبہ بنایا جائے وغیرہ وغیرہ۔ مرزا محمود احمد نے اپنے تبصرے میں پہلے تو یہ کہا کہ نہرو کمیٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ نہ تھی نہ ہی آل پارٹیز کانفرنس نمائندہ تھی جس نے اسے قائم کیا کیونکہ

”شروع سے آخر تک کسی نے نہیں پوچھا کہ تمہاری (جماعت احمدیہ) کی کیا رائے ہے حالانکہ ہم تعداد میں کسی قدر بھی کم نہیں مگر پارسیوں سے زیادہ ہیں اور آل انڈیا حیثیت رکھتے ہیں۔

ہماری مضبوط جماعتیں تین صوبوں میں پائی جاتی ہیں یعنی پنجاب، بنگال اور صوبہ سرحد، اس کے علاوہ بہار، یوپی، مدراس اور سندھ میں بھی معقول جماعتیں پائی جاتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں تو ہر صوبہ میں ہیں۔ ہماری جماعت منظم ہے اور رجسٹر شدہ تعداد کے لحاظ سے اور نظام کے لحاظ سے تو شاید کوئی ہندو سوسائٹی بھی اس کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ (14)

اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات خصوصاً حکومت کے فیڈرل سسٹم اور تمام صوبہ جات کو کامل طور پر خود مختار قرار دینے کے مطالبہ پر گفتگو کی اور کہا کہ یہ کوئی غیر مجرب شے نہیں ہے اور امریکہ میں یہی طرز حکومت ہے۔ البتہ صوبوں کو مرکز سے علیحدہ ہونے کا اختیار نہ ہونا چاہئے۔ انہوں نے کہا:

”برٹش ایمپائر بھی ایک قسم کی فیڈریشن ہے جس کے آزاد حصوں کے کام میں مرکزی حکومت کوئی دخل نہیں دیتی لیکن سب سے بہتر تجربہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہوا ہے ان ریاستوں کی گورنمنٹ کی ابتداء ہی فیڈرل اصول پر ہوئی ہے، اور برابر یہ گورنمنٹ ترقی ہی کرتی جا رہی ہے۔“

امریکہ کے علاوہ جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اور سوئٹزر لینڈ میں بھی اسی قسم کی حکومتیں ہیں اور کامیاب طور پر چل رہی ہیں ان کے علاوہ ایک اور نئی حکومت ہے یعنی زیمبوسلویا جس میں نئی قسم کا تجربہ کیا گیا ہے

یعنی سارے ملک میں تو فیڈریشن نہیں ہے لیکن روتھیدیا کے علاقہ کو ان لوگوں کے خوف کی وجہ سے کامل خود اختیاری حکومت دے دی گئی ہے جس کو کبھی مٹانہ سکے کا عہد زیگوسلویکا نے کیا ہے۔ مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اگر اسی طریق پر ہندو راضی ہو جائیں یعنی پانچوں مسلم صوبے (پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، بنگال) فیڈریشن کے اصول پر ہندوستان سے ملحق رہیں اور ہندو صوبے مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت رہیں اور جس طرح روتھیدیا والوں نے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ ان معاملات میں مرکزی پارلیمنٹ میں دوسرے صوبوں کے متعلق رائے نہ دیں گے جن امور میں کہ ان کے صوبے میں مرکزی حکومت دخل نہیں دیتی (مگر زیگوسلویکا نے اس اقرار کے باوجود اپنے معاملات میں رائے دینے کا انہیں حق دے کر ایک بے نظیر وسعت کا ثبوت دیا ہے) اس طرح مسلمان بھی شوق سے عہد کر لیں گے کہ جو اختیارات مسلم صوبہ جات اپنے لئے محفوظ رکھیں گے ان میں صوبجات کے نمائندے دوسرے صوبوں کے کاموں میں دخل نہ دیں گے۔

ہندوستان کی فیڈریشن کیسی ہو؟

گو یہ موقع نہیں کہ میں اس امر کے متعلق کچھ بیان کروں کہ ہندوستان کی فیڈریشن کیسی ہو لیکن چونکہ ممکن ہے بحث میں بعض نقائص کو لوگ پیش کریں اس لئے میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں ریاست ہائے متحدہ (امریکہ) کا طریق زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ ملک بھی ہندوستان کی طرح وسیع ہے اور مختلف نسلیں اور مختلف مذہب پائے جاتے ہیں ہاں یہ شرط ہو جانی چاہئے کہ کوئی صوبہ فیڈریشن سے آزاد نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ضروری نہیں کہ صرف وہی اختیارات مرکزی حکومت کو دیئے جائیں جو امریکہ میں دیئے گئے ہیں بلکہ ان سے زائد اختیارات دیئے جاسکتے ہیں ہاں اس امر کا لحاظ رکھنا ہو گا کہ صوبہ جات کے اندرونی نظم و نسق میں خلل نہ آئے۔“ (15)

نہرو رپورٹ پر تبصرہ کے آخر میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کی حکومت کا منزل مقصود ڈومنین سٹیٹس رکھا گیا ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح راہ ہے بعض لوگ تو اسے درمیانی

راہ سمجھتے ہیں اور اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ضروری خیال کرتے ہیں میرا اپنا خیال ہے کہ اپنی ذات میں بھی یہ طریق حکومت بہترین ہے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے، اس وقت نہ تو انگریز اس امر کو سمجھ رہے ہیں اور نہ ہندوستان اس امر کو سمجھتا ہے کہ برطانیہ کا مستقبل ایشیاء اور خصوصاً اسلام سے وابستہ ہے لیکن زمانہ مستقبل انشا اللہ اس امر کو ثابت کر دے گا کہ حقیقت یہی ہے۔ (16)

اس اقتباس سے عیاں ہے کہ مرزا محمود نے نہرو رپورٹ پر تبصرہ میں ایک تو ہندوستان کے لئے نیم خود مختار درجہ ڈومینین سٹیٹس کو اس کی منزل قرار دیا ہے دوسرے ہندوستان کے لئے امریکی طرز حکومت کی طرح کے وفاقی ڈھانچے کی تجویز پیش کی ہے۔ امریکی آئین میں فیڈریشن کو کچھ اختیارات حاصل ہیں اور کچھ امور اس کے دائرہ اختیار میں نہیں جیسا کہ فیڈریشن کا تقاضا ہے ایسے ہی ریاستوں کو کچھ اختیارات دیئے گئے ہیں اور کچھ نہیں دیئے گئے جیسے معاہدات کرنا، افواج رکھنا، وغیرہ اختیارات کی ایک فہرست کنکرنٹ لسٹ ہے جس کا استعمال قومی حکومت اور ریاستیں دونوں کرتی ہیں اگر کوئی تنازعہ ہو تو سپریم کورٹ حل کرتی ہے۔ اس لئے امریکی ریاستوں کے باہمی قوانین میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔

مرزا محمود کے تبصرے میں پانچ آزاد مسلم صوبوں کے قیام کا سرے سے کوئی ذکر نہیں نہ ہی خود مختار مسلم ریاست کا کوئی اشارہ تک کیا گیا ہے، صرف فیڈریشن کے قیام کا ذکر ہے جہاں تک فیڈریشن کے سلسلے میں ان کی زیکوسلویکا کی مثال کا تعلق ہے کہ اس نے روٹھینیا کو کامل خود اختیاری حکومت دے رکھی ہے اور ان کے خیال میں مسلمانوں کو اعتراض نہیں ہو سکتا اگر اس طریق پر ہندو راضی ہو جائیں اور پانچوں مسلم صوبے، سرحد، پنجاب، بلوچستان، بنگال، سندھ فیڈریشن کے اصول پر ہندوستان سے ملحق رہیں اور ہندو صوبے مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت رہیں جس طرح اہل روٹھینیا نے یہ اقرار کیا ہے کہ وہ ان معاملات میں مرکزی پارلیمنٹ میں دوسروں صوبوں کے متعلق رائے نہ دیں گے جن امور میں کہ ان کے صوبے میں مرکزی حکومت دخل نہیں دیتی۔ اس تجویز میں انہوں نے کہاں مسلم صوبوں پر مشتمل ایک خود مختار مسلم ریاست کی سکیم پیش کی ہے وہ تو فیڈریشن یا

وفاق کی ایک ایسی صورت بیان کر رہے ہیں جیسی روٹھنیا کے حوالے سے پائی جاتی ہے اور ان کے خیال میں ہندوستان میں ایسی فیڈریشن کے قیام پر مسلمانوں کو شاید اعتراض نہیں ہوگا۔ اس کے معا بعد انہوں نے امریکی فیڈریشن کے طرز پر ہندوستان کے لئے ایک فیڈریشن کی تجویز پیش کر دی ہے۔

جہاں تک روٹھنیا Ruthenia کا تعلق ہے تو چیکو سلاویکیہ نے روٹھنیا کے ساتھ 10 ستمبر 1919ء کو دو معاہدے Minority Treaty اور St. Germain en-laye کے لئے تھے۔ جن کے تحت روٹھنیا کو صوبائی خود مختاری دے دی گئی اور چیکو سلاویکیہ کے آئین میں اس کی ضمانت دی گئی تھی۔ روٹھنیا کی ایک الگ پارلیمنٹ کے قیام کی تجویز بھی تھی لیکن یہ منتخب پارلیمنٹ جس کی پہلے سے ضمانت دی گئی تھی وہ کبھی بھی قائم نہ ہو سکی۔ یہ صرف کانفرنسوں میں موجود تھی۔ 1944ء میں روس نے اس علاقے پر قبضہ کر کے 1945ء میں اسے یوکرین کا حصہ بنا دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مرزا محمود کو خود ہی اس ڈھیلی ڈھالی مجوزہ فیڈریشن کی تجویز کی نامعقولیت کا احساس ہوا کہ وہ ہندوستان کے کسی وفاقی نظام سے ہم آہنگ نہ ہوگی اور ناقابل عمل قرار پائے گی اس لئے انہوں نے فوراً ہی امریکی طرز کی فیڈریشن کو ہندوستان کے لئے موزوں سمجھا جس میں کوئی صوبہ فیڈریشن سے آزاد نہ ہو سکے اور امریکہ نے ریاستوں کو جو اختیار دئے ہیں ان سے بڑھ کر بھی انہیں دئے جاسکتے ہیں۔

مرزا محمود کی غیر واضح، مبہم، ناقابل عمل وفاق کی تجویز جو مشرقی یورپ کے ایک علاقہ روٹھنیا کے مخصوص حالات کے تحت قائم ہونی تھی اور جو ردعمل نہ ہوئی یا امریکی فیڈریشن کے خطوط پر قائم کئے جانے والے وفاقی ڈھانچہ کا علامہ اقبال کی آزاد اسلامی ریاست کی تجویز سے کیا تعلق ہے۔ علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد (1930ء) مسلم ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کا واضح تصور پیش کرتا ہے۔ اس خطبے میں انہوں نے کہا:

”میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کے الحاق سے ایک واحد ریاست قائم کی جائے جو برٹش ایمپائر کے اندر یا اس سے باہر آزاد و خود مختار ہو میرے

خیال میں شمال مغرب میں متحدہ انڈین مسلم سٹیٹ کا قیام کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا مقدر ٹھہر چکا ہے۔“

شیخ عبدالماجد نے شاید پہلی بار 1996 میں مرزا محمود کی ہندوستان کے وفاق کی ایک مبہم تجویز کو پانچ اسلامی صوبوں کے قیام کی سکیم یا خود مختار مسلم ریاست کی تجویز قرار دیا ہے حالانکہ 1928ء سے لے کر 1996ء تک 68 سال کے عرصے میں کسی قادیانی مورخ و محقق بشمول ”حوالوں کے بادشاہ“ دوست محمد شاہد اور خود مرزا محمود احمد کو اپنے تبصرے کی بنیاد پر یہ عجیب و غریب خیال نہیں سوجھا۔ انہوں نے شاید مرزا محمود کی تحریر کو مرزا غلام احمد کا الہام سمجھا ہے کہ جہاں ضرورت پڑی کھینچ تان کر اسے مخصوص حالات پر منطبق کر دیا۔ شاید شیخ عبدالماجد کو معلوم ہو کہ مرزا محمود احمد نے سائنس کمیشن رپورٹ پر بھی ایک تبصرہ لکھا تھا۔ یہ رپورٹ مئی 1930ء میں شائع ہوئی جس میں ہندوستان کے لئے ایک آئینی منصوبہ کا خاکہ دیا گیا تھا اس میں بھی وفاق کی تجویز تھی اور مسلمانوں کے بعض مطالبات کسی حد تک مان لئے گئے تھے۔ مرزا محمود نے اپنے تبصرے میں ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس دینے تک کی بھی حمایت نہ کی، آزادی یا آزاد و خود مختار ریاست کا مطالبہ تو دور کی بات ہے۔ وہ فرماتے ہیں

’ہندوستان کے انگلستان سے علیحدہ ہونے کا خیال نہ صرف امکان کے خلاف ہے بلکہ قانون قدرت کے منشا کے بھی خلاف ہے پس اسے ہمیں بالکل نظر انداز کر دینا چاہیے اور اس سوال پر غور کرنا چاہئے کہ انگلستان سے تعلق رکھتے ہوئے ہندوستان کس حد تک آزادی کا مستحق ہے۔ اگر اس سوال کا تعلق موجودہ زمانہ سے نہ ہو بلکہ آئندہ زمانہ سے ہو تو میں جواب دوں گا کہ ہندوستان ویسی ہی آزادی کا مستحق ہے جیسی آزادی دوسری آزاد نوآبادیوں کو حاصل ہے اور جسے ڈومینین سٹیٹس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن اگر اس سوال کا تعلق موجودہ زمانہ سے ہو تو میں ملامت گر کی ملامت کی پرواہ کئے بغیر کہوں گا کہ ہندوستان ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اسے اس وقت کامل آزادی مل جائے فوراً ڈومینین سٹیٹس مل جانے کو میں برکت نہیں بلکہ عذاب قرار دوں گا۔‘ (17)

آپ نے دیکھا کہ نہرو رپورٹ پر تبصرہ کے دو سال بعد (1930) بھی مرزا محمود تو ہندوستان کو ڈومنین سٹیٹس نیم خود مختار نہ درجہ دینے کے حق میں نہ تھے آزاد مسلم ریاست کا تصور تو دور کی بات ہے البتہ سائنس کمیشن کی رپورٹ میں مذکور ہندوستان میں وفاق کی تجویز کی نہرو رپورٹ پر تبصرہ کی طرح انہوں نے بہت حد تک حمایت کی ہے۔ (18) اور فیڈرل سسٹم پر اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ انہوں نے وحدانی طرز حکومت کے مقابلے میں وفاق طرز کو ہندوستان کے لئے موزوں قرار دیا ہے اس کے علاوہ اس میں کوئی نئی بات نہیں کہی۔ انہوں نے شیخ عبدالماجد کی پانچ مسلم صوبوں پر مشتمل آزاد خود مختار ریاست کی تجویز کبھی بھی پیش نہیں کی نہ وہ انگریز سے تعاون، جماعتی مفاد اور اپنے عقیدے کی رو سے ایسے کسی مطالبے کو پیش کر سکتے تھے۔

سائنس کمیشن رپورٹ کی تجاویز کی حمایت میں تبصرے کو انہوں نے پہلی گول میز کانفرنس کے دوران ممبران پارلیمنٹ اور ہندوستان اور انگلستان کے بارسوخ افراد میں تقسیم کرایا۔ علامہ اقبال کو بھی لاہور میں اس کی ایک کاپی دی گئی انہوں اس پر اپنی عمومی رائے دی:

”تبصرہ کے چند مقامات کا میں نے مطالعہ کیا ہے نہایت عمدہ اور جامع ہے، (19)

اس تبصرہ کے برعکس علامہ اقبال نے بھی سائنس کمیشن رپورٹ مئی 1930ء پر تبصرہ کیا انہوں نے فیڈرل اسمبلی کے قیام سے اتفاق کیا لیکن کہا کہ صوبائی خود اختیاری کا تصور واضح نہیں، پنجاب اور بنگال کے معاملے میں نقطہ نظر غلط ہے، سندھ، سرحد، بلوچستان کے بارے میں مایوس کن رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ (20) اپریل 1932ء میں علامہ اقبال اور چار دیگر مسلم رہنماؤں نے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے حقوق کی اکثریت کی تائید میں بیان دیا۔ (21) ان کا تبصرہ نہایت جامع اور مسلم مطالبات کا صحیح ترجمان ہے۔ سائنس کمیشن کی رپورٹ پر مرزا محمود کے تبصرے میں بھی کوئی خاص مطالبہ یا نام نہاد پانچ اسلامی صوبوں کے قیام کی تجویز یا خود مختار مسلم ریاست کا کوئی تصور سرے سے موجود نہیں حالانکہ ان کے نہرو رپورٹ پر تبصرہ (1928ء) پر دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور مسلم زعماء کئی آئینی تجاویز اور مسلمانوں کے مطالبات پیش کر چکے تھے۔ اسی سال علامہ اقبال نے

خطبہ الہ باد دیا۔ برطانیہ کی ریمزے میکڈانلڈ حکومت نے اس رپورٹ کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور آئینی مسائل کے حل کے لئے گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔

قادیانی خلیفہ کو جدوجہد آزادی اور مسلمانوں کے آئینی مطالبات کی تدوین یا حمایت کا کریڈٹ دینے کے لئے شیخ عبدالماجد نے یہ بھی کہا ہے

”آل انڈیا مسلم کانفرنس، چودہ نکات اور خطبہ الہ آباد میں پیش کردہ مطالبات کی شمع کو قادیان کی سرزمین سے جو جلا بخشی گئی اس شجر کی جس رنگ میں وہاں آبیاری کی گئی، نہرو رپورٹ کے زہر کا تریاق جس کثیر مقدار میں قادیان نے مہیا کیا، مسلم حقوق کے تحفظ کے لئے مسلم قائدین کو جس انداز سے دلائل و براہین سے قادیان نے لیس کیا برصغیر کی کوئی مذہبی جماعت یا ادارہ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔“ (22)

1927ء سے 1931ء کی آئینی جدوجہد کے ریکارڈ کی روشنی میں ان کی تعلی اور خود ستائی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے زبردستی جماعت احمدیہ کو کریڈٹ دینے کی کوشش کی ہے جو حقیقت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ قادیان کی محبت میں انہوں نے تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے۔ چونکہ وہ ایک غالی قادیانی ہیں اور ہر اہم واقعے اور مسلم مطالبے کے پیچھے اپنے ”الوالعزم“ خلیفہ کی ’ذہانت، اور سیاسی بصیرت‘ کے قائل ہیں اس لئے انہوں نے ایسے نتائج اخذ کرنے کی غیر معقول روش اختیار کی جن کو ان کی سرکاری تاریخ احمدیت میں بھی پیش نہیں کیا گیا نہ ہی کبھی ایسا ذکر احمدیہ لٹریچر میں ہوا۔ درج بالا پیرا گراف کے معا بعد ان کو اپنی غیر معقول روش کا احساس ہوا اور انہوں نے تسلیم کیا:۔

”واضح رہے کہ تاریخی اجتماعات و واقعات میں پیش کئے جانے والے مسلم مطالبات کے خالق نہ تھا امام جماعت احمدیہ تھے اور نہ بانیان مسلم کانفرنس نہ قائد اعظم نہ علامہ اقبال بلکہ یہ مطالبات کسی نہ کسی شکل میں موجود تھے اور یہ سب حضرات یا اجتماعات ان کے ترجمان تھے“ (23)

اعلیٰ سیاسی بصیرت کے مالک اور مسلمانوں کے حقیقی ہمدرد مسلم رہنماؤں کے مقابلے میں مرزا

محمود کی کیا حیثیت تھی جو محض انگلی پر لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہتے تھے اور مسلمانوں کی جعلی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر انہیں دھوکہ دے رہے تھے۔ اگر انہوں نے علامہ اقبال کی طرح واقعی کوئی اہم تجویز یا مطالبہ پیش کیا ہوتا تو ہم ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر اس کا اعتراف کر لیتے لیکن تاریخی حقیقت کے خلاف خیال آرائی، خوش فہمی اور تاریخی حقائق کی مسخ کاری کو کچھ حیثیت نہیں دے سکتے۔

اس ضمن میں شیخ عبدالماجد پروفیسر ریاض صدیقی کی کتاب 'قرار داد پاکستان کا پس منظر' کا ایک حوالہ نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "اسی سال 1928ء میں نہرو رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے قادیانی فرقے کے رہنما مرزا بشیر الدین محمود احمد نے ایک تجویز پیش کی اور بنگال اور شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مسلمان علاقہ قائم کرنے کا مشورہ دیا..... اقبال کا خطبہ الہ آباد اسی تجویز کی تعبیر و تشریح ہے، ص: 36۔ معلوم نہیں کہ صدیقی صاحب نے بلا تحقیق یہ بات کیسے بیان کر دی۔ ان کو اس کی تردید کرنی چاہیے۔ اقبال شناسوں اور مورخین کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسے جعلی مواد کو تاریخ آزادی کا حصہ نہ بننے دیں۔

محترم ڈاکٹر وحید عشرت نے بھی علامہ اقبال کے خطوط میں دو جلسازیوں کی نشاندہی اپنے ایک مضمون مطبوعہ اقبالیات جنوری 2001ء میں کی ہے۔ ایک علامہ اقبال کانڈٹ نہرو کے نام خط ہے اور دوسرے شیخ اعجاز احمد قادیانی کی گارڈین شپ کا مسئلہ ہے۔

تاریخی حقائق مسخ کرنے کی ایک اور کوشش 1932ء

شیخ عبدالماجد نے تاریخی حقائق کو مسخ کرنے اور اپنے رہنماؤں مرزا محمود احمد اور سر ظفر اللہ کو فرضی کریڈٹ دینے کے لئے ایک اور دعویٰ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"ظفر اللہ نے مسلم لیگ دہلی کے سالانہ اجلاس دسمبر 1931ء میں جو خطبہ دیا اس میں مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کو ملا دینے اور ان کے الحاق پر غور کرنے کی عملی تجویز پیش کی۔ علامہ اقبال نے بھی آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور کے سالانہ اجلاس مارچ 1932ء میں یہی بات کی۔ راقم عرض کرتا

ہے بہت سے دیگر امور میں بھی علامہ کا خطبہ حضرت چوہدری صاحب کے خیالات کا عکس لئے ہوئے ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ اس خطبے کا ”سیاسی تدبر کے شاہکار“ ہونے کی ایک وجہ یہ پر تو قرار دیا جاسکتا ہے۔ (24)

علامہ اقبال کے اسی خطبے کے متعلق عبدالمجید سالک نے ذکر اقبال میں کہا ہے

”حقیقت یہ ہے کہ اس خطبہ صدارت سے ہندوستان اور انگلستان کے سیاسی حلقوں میں خاصی سنسنی پھیل گئی کیونکہ یہ خطبہ صاف گوئی، خلوص، رواداری اور صداقت کا مظہر تھا اور ضرورت وقت کے مطابق سیاسی تدبر کا بھی شاہکار تھا۔ اس میں علامہ نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی تائید بھی کی اور مسلمانوں کے جذبات و خیالات کی نمائندگی کا حق بھی ادا کر دیا۔ انہوں نے اس خطبہ میں کانگریس کی سول نافرمانی پر نکتہ چینی کی اور ہندوؤں کی غیر مفاہمانہ ضد پر اظہار افسوس کیا۔ اس خطبے میں علامہ نے نہایت بے باکانہ طور پر صاف کہہ دیا کہ حکومت برطانیہ کی حکمت عملی تذبذبانہ ہے اور فرقہ وارانہ فیصلے کے اعلان میں تاخیر کا الزام حکومت برطانیہ پر ہے۔ (25)

سرفظر اللہ اور مسلم لیگ کی صدارت

شیخ عبدالماجد نے علامہ اقبال کے مسلم کانفرنس کے صدارتی خطبے مارچ 1932 کی اہمیت کو کم کرنے اور سرفظر اللہ کو کریڈٹ دینے کے لئے تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے۔ سرفظر اللہ کو سرفضل حسین نے ایک سازش کے تحت مسلم لیگ کا صدر بنوایا۔ وہ جلد از جلد پہلی گول میز کانفرنس لندن سے فارغ ہو کر ہندوستان آئے۔ لندن میں قیام کے دوران انہوں نے مرزا محمود کو دس دسمبر 1931ء کو ایک خط لکھا کہ حضور اس کا نام مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دہلی 28-26 دسمبر 1931ء کی صدارت کے لئے طے پا گیا ہے غالباً ایسا سیاسی موقعہ پہلے نہ ہوا ہوگا اس لئے خاکسار (ظفر اللہ) نے حضور کی منظوری کی امید میں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کرتے ہوئے اسے منظور کر لیا ہے اور زیادہ تر اسی رنگ میں اپنے خیالات کے لحاظ سے قبول کیا ہے کہ اس موقعہ پر مسلمانان ہند کو حضور کی زبان بن کر سیاسی مشوروں اور کسی حد تک ان کی سیاسی راہنمائی کر سکیں۔ اس لئے معروض ہوں کہ حضور کمال ذرہ

نوازی اور شفقت سے اپنا قیمتی وقت نکال کر ایڈریس کا مسودہ لکھوا دیں اور خاکسار کو بھجوا دیں۔ خاکسار اسے ترجمہ کرے گا۔ ایڈریس دونوں زبانوں میں چھپے گا۔ اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی، گو پڑھا غالباً انگریزی میں جائے گا۔ حضور اندازہ فرما سکتے ہیں کہ وقت بہت ہی مختصر بلکہ ناکافی ہے۔ مجھے پورے دن کا کام عدالت میں بھی رہتا ہے لیکن زیادہ مشکل یہ ہے کہ نہ میرے اندر وہ وسعت نظر، نہ وہ قابلیت، نہ موجودہ حالات کا وہ صحیح اندازہ اور موازنہ اور نہ آئندہ آنے والے حالات کا اندازہ ہے جو اس فرض کے کما حقہ ادا کرنے کے لئے ضروری ہے اس لئے میری ناقابلیت کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے اور موقع کے لحاظ سے بھی حضور یہ تکلیف ضرور گوارا فرمائیں

لیگ والوں کی طرف سے ”درخواست ہے کہ بہر صورت ایسے خدام کو جو دہلی سے گزر کر جلسہ (سالانہ احمدیہ) پر جاسکتے ہیں ارشاد فرمایا جائے کہ وہ لیگ کے اجلاس میں چند وقت کے لئے زیادہ سے زیادہ شامل ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ میرے نام کا اعلان ہوتے ہی جمیعت العلماء وغیرہ شور مچانا اور مخالفت کرنا شروع کر دیں گے اور کوشش کریں گے کہ اجلاس کے دنوں میں بھی مخالفت ہو، اس لئے کوشش کرنی چاہئے کہ جماعت احمدیہ کے بہت سے ممبران شامل ہو سکیں تاکہ حاضری بھی اچھی ہو اور ریزدیشن وغیرہ بھی حسب منشا پاس ہو جائیں۔

یہ عریضہ جلدی میں لکھ رہا ہوں اور پورے طور پر اظہار مدعا نہیں کر سکا حضور اس عریضہ کے ملنے پر اگر بذریعہ تار خاکسار کو اطلاع کرادیں کہ یہ عریضہ شرف باریابی حاصل کر چکا ہے اور خاکسار کی گزارش قبول ہو چکی ہے تو خاکسار کی بہت سی تشویش رفع ہو جائے گی۔

ایڈریس جیسے جیسے حضور لکھواتے جائیں اگر خاکسار کو بھجوا دیں تو خاکسار ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جائے۔ ایڈریس میں سیاست حاضرہ میں مسلمانوں کی حالت، موجودہ سیاسی حالات پر تبصرہ اور آئندہ کے کام کے متعلق بھی ذکر ہوگا۔ آئندہ ایک باقاعدہ نظام اور اتحاد کے ساتھ کام کرنے پر اگر حضور پسند فرمائیں تو خصوصیت سے زور دے دیں“ (26)

سر نظر اللہ کا مسلم لیگ کے دلی اجلاس کا صدارتی خطبہ مرزا محمود کا تیار کردہ تھا۔ اجلاس 26 دسمبر

1931ء کو فتح پوری مسجد کے جیون ہال میں ہونا تھا لیکن مسلمانوں نے ظفر اللہ کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا اور ہال پر قبضہ کر لیا۔ جس پر یہ اجلاس نواب علی کی کوشی پر منعقد ہوا اس میں تقریباً سو افراد شامل تھے۔ صدارتی خطبہ میں ظفر اللہ نے فیڈریشن، وفاقی مجالس قانون، مالیات، حق رائے دہی، وفاقی عدالت، آل انڈیا سروس، دفاع، صوبوں کی خود مختاری، مسلمانوں کے اساسی حقوق وغیرہ پر روشنی ڈالی۔ (27)

یہ تمام امور پہلے ہی سے مسلم جماعتوں اور زعماء کی طرف سے پیش کئے جا رہے تھے۔ انہوں نے کشمیر میں مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کا ذکر کیا اور ہندوستان میں بڑھتی ہوئی انقلابی (کیونسٹوں کی) سرگرمیوں اور بدامنی (انارکی) کے واقعات پر تشویش کا اظہار کیا اور ان کے سدباب پر زور دیا۔ دوسرا اجلاس 27 دسمبر کو ہوا جس میں پہلے کے مقابلے یعنی سو افراد سے بھی کم حاضری تھی۔ اس میں لیگ کے آئین میں ترمیم کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی اور لیگ کے بنیادی مقصد میں تبدیلی کی گئی۔ اب تک لیگ کا مقصد، پرامن اور جائز ذرائع سے ہندوستان کے لئے سوراج (آزادی) تھا اس کو سب کمیٹی نے بدل کر ”ہندوستان کے لئے مکمل ذمہ دارانہ حکومت کر دیا جو پرامن اور جائز ذرائع سے حاصل کی جائے گی اور مسلمانوں کو مناسب تحفظات دیئے جائیں گے۔“ الہ باد یوپی کے مسلم رہنما ڈاکٹر ایم۔ یو۔ ایس جنگ نے سوراج کو برقرار رکھنے پر زور دیا اور مسٹر صابری نے مکمل آزادی کی تجویز پیش کی لیکن ان ترمیمات کو مسترد کر دیا گیا۔ ایک اہم قرارداد یہ تھی کہ مسلم لیگ ایک کمیٹی مقرر کرے جو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی سے گفت و شنید کے بعد ان دنوں کو آپس میں مدغم کر دے۔ یہ کمیٹی پہلی مارچ 1932ء تک لیگ کونسل کو رپورٹ پیش کرے جس کے بعد ان کو ملانے کے مناسب اقدامات کئے جائیں گے اور نئی تنظیم کا ایک نیا دستور مرتب کیا جائے گا۔ اس کمیٹی کے ممبران (1) سر ظفر اللہ صدر مسلم لیگ (2) سر محمد یعقوب سکریٹری لیگ (3) خان صاحب ایس ایم عبداللہ جانٹ سکریٹری لیگ (4) مرزا اعجاز حسین جانٹ سکریٹری لیگ تھے۔

ظفر اللہ کے صدارتی خطبہ کا علامہ اقبال کے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس لاہور

21 مارچ 1932ء سے موازنہ کیا جائے جس میں ایک ہزار سے زائد افراد نے شرکت کی تو معلوم ہو گا کہ ان کا خطبہ نہایت جامع، موثر اور حقائق پر مبنی دستاویز ہے اس میں وفاق، صوبائی خود مختاری، مسلمانوں کے سیاسی خدشات، جداگانہ انتخابات کی ضرورت، مسلم صوبوں کے مطالبات کی تائید، کانگریس کے رویہ پر تنقید، برطانوی حکومت کو جائز مسلم مطالبات تسلیم کرنے کی ترغیب، کشمیر کی حالت زار، ہندوستان کے معاشرتی اور معاشی مسائل وغیرہ پر گراں قدر تبصرے اور تجاویز موجود ہیں (28) اور آخر میں مسلمانوں کو پانچ تجاویز پیش کی گئی ہیں ان میں پہلی تجویز یہ ہے۔

مسلمانوں میں جو سیاسی انتشار ہے اس کو ختم کرنے کے اقدامات کئے جائیں اس کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کی واحد سیاسی تنظیم ہو جس کی تمام ملک میں صوبائی اور علاقائی شاخیں ہوں۔ دوسرے ایک قومی فنڈ قائم کیا جائے۔ تیسرے یوتھ لیگ اور والینٹر کورز بنائے جائیں چوتھے ہندوستان کے بڑے قصبوں میں مردوں اور عورتوں کے ثقافتی ادارے (کلچرل انسٹی ٹیوٹ) بنائے جائیں جو غیر سیاسی ہوں اور نوجوانوں کی روحانی قوتوں کو بیدار کریں اور آخر میں انہوں نے علماء کی ایک تنظیم بنانے کی ضرورت بیان کی جس میں وکلاء بھی شامل ہوں تاکہ اسلامی قوانین کی از سر نو تشریحات پیش کریں۔ (29)

ظفر اللہ سرفضل حسین کے اشارے پر مسلم لیگ کا وجود ختم کرنا چاہتے تھے۔ ظفر اللہ کی صدارت سے اختلاف کی بناء پر جب پشاور کے ایک بیرسٹر عبدالعزیز نے مسلم لیگ کا اپنا دھڑا قائم کر لیا تو فضل حسین نے اس کے اجلاس میں ملک فیروز خان نون کے ذریعے ایک قرارداد پیش کرنی چاہی جس کا مقصد لیگ کے وجود کو سرے سے ختم کر دینا تھا لیکن عبدالعزیز کو اس کا پہلے سے علم ہو گیا اور انہوں نے فضل حسین کی سازش ناکام بنادی (30)

سرفضل حسین کی ظفر اللہ کی وساطت سے لیگ کی حیثیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی باقاعدہ سازش جس میں ایک کمیٹی بنا کر آئینی طور پر اس کا خاتمہ کرنا تھا اور علامہ اقبال کی محض ایک تجویز کہ مسلمانوں کو ایک سیاسی جماعت کے جھنڈے تلے متحد ہونا چاہیے آپس میں کیا مطابقت رکھتی

ہیں۔ 1932ء میں سر فضل حسین بیمار پڑ گئے اور اسی سال سر ظفر اللہ دائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے عارضی ممبر بن گئے اس لئے یہ سازش پروان نہ چڑھ سکی۔

شیخ عبدالماجد کا دوسرا دعویٰ کہ علامہ اقبال کا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس لاہور 1932ء کا خطبہ صدارت، ظفر اللہ کے مسلم لیگ دلی دسمبر 1931ء کے خطبہ صدارت کا عکس لئے ہوئے ہے، تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی بدترین مثال ہے۔ ان فرضی باتوں سے قادیانی اقبال دشمنی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اور اپنی تہی دامن اور اپنے اکابر کے منہ کی کردار پر پردہ ڈالتے ہیں۔ یہ شگوفہ بھی پہلی دفعہ شیخ عبدالماجد نے چھوڑا ہے ورنہ قادیانی لٹریچر میں اس کا ذکر تک نہیں ہے۔ علامہ اقبال کا خطبہ اپنی علمیت، اپنے مطالب کی ہمہ گیری اور جذبہ انگیزی کے اعتبار سے الہ آباد والے خطبے سے بہتر تھا (31)۔ ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ ظفر اللہ کا خطبہ یکسر مسترد کرنے کے قابل ہے۔ اس میں انہوں نے مسلمانوں کے بعض مطالبات کو اپنے انداز میں پیش کیا ہے لیکن علامہ اقبال کے خطبے سے اس کا تقابل کیا جائے تو اسکی وقعت بہت کم رہ جاتی ہے۔ علامہ اقبال کے خطبہ میں مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کی نہایت موثر انداز میں وکالت اور ان کے حقیقی جذبات کی نمائندگی کی گئی ہے۔

قادیان کے سرکاری اخبار الفضل نے اس خطبے پر علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کیا اور خود شیخ عبدالماجد نے اس کا حوالہ دیا ہے:

”ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں بحیثیت صدر جو خطبہ پڑھا..... اس میں مسلمانوں کے جذبات کا حق ادا کیا ہے۔“

”اب جب کہ مسلمانوں نے بڑے محرکات کے باوجود کانگریس میں شمولیت اختیار نہیں کی اس وقت تک اپنے حقوق و مطالبات کے لئے پرامن اور آئینی جدوجہد کر رہے ہیں کس قدر رنج کی بات ہے کہ اگر حکومت برطانیہ منصفانہ رویہ اختیار نہ کرے غرض حکومت کے سامنے مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے امور کھول کر رکھ دئے گئے ہیں ان کے عواقب و نتائج سے بھی پوری طرح آگاہ کر دیا گیا ہے اب یہ حکومت کا کام ہے جلد سے جلد صحیح راستہ اختیار کر کے اپنی روایتی انصاف پسندی کا

ثبوت دے یا متزلزل اور غیر مستقل حکمت عملی پر کار بند رہ کر تشویش ناک صورت حال میں اضافہ کرتی رہے“ (32)

کشمیر کمیٹی اور علامہ اقبال

قادیانی ایک طویل عرصے سے کشمیر کے معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ مہاراجہ پر تاپ سنگھ کے عہد (1885-1925)ء میں حکیم نور الدین برطانوی ریڈیڈنٹ کے اشارے پر جاسوسی کے فرائض سرانجام دینے کی پاداش میں کشمیر سے نکالے گئے۔ (33) مرزا محمود نے کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے تین سفر 1909، 1921 اور 1929ء کئے۔ ”تاریخ احمدیت“ کے مطابق کشمیر میں ان کی دلچسپی کی چار وجوہات تھیں۔

- 1- انہوں نے کشمیر کے سفروں کے دوران کشمیریوں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔
- 2- کشمیر میں پچاس ہزار احمدی تھے۔ وہاں کی جماعت کو قریب سے دیکھا۔
- 3- سکھ حکومت کے عہد میں امام دین گورنران کے دادا مرزا غلام مرتضیٰ کو بطور مددگار کشمیر لے گئے تھے۔

4- حکیم نور الدین کشمیر میں شاہی طبیب تھے موجودہ مہاراجہ ہری سنگھ ڈوگرہ کے باپ امر سنگھ اور چچا رام سنگھ ان سے قرآن پڑھنا چاہتے تھے اس لئے ان کو کشمیر سے نکالا گیا۔ (34)

1930ء میں قادیانی پریس میں کشمیر کے سیاسی حالات کے متعلق خبریں اور تبصرے چھپنے لگے۔ مرزا محمود احمد نے اس سلسلہ میں ایک باقاعدہ مہم کا آغاز کیا اور مسلم زعماء کو خطوط لکھے۔ ایک خط علامہ اقبال کو لکھا جس میں ایک مسلم بورڈ اور کشمیریوں کی مدد کرنے کی ضرورت بیان کی گئی تھی۔ مبینہ بورڈ کے معاملے میں علامہ کے بعض تحفظات تھے البتہ کشمیری مسلمانوں کی امداد کے مسئلے پر انہوں نے 5 ستمبر 1930ء کو لکھے گئے اپنے خط میں کہا:

چونکہ آپ کی جماعت منظم ہے اور بہت سے مستعد آدمی جماعت میں موجود ہیں اس واسطے آپ بہت مفید کام انجام دے سکیں گے۔“ (35)

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ قادیانی ایک منظم جماعت ہیں وہ مرزا محمود کا ہر حکم مانتے ہیں۔ ان کے پاس مالی وسائل ہیں اور وہ حکومت برطانیہ کے بہت قریب ہیں بلکہ ان کے اعضاء و جوارح ہیں، اگر ان کے ذریعے کشمیریوں کی کوئی مدد ہو سکے تو اس میں حرج کی بات نہیں۔ انہوں نے قادیانیوں کی کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے جدوجہد کو اخلاص پر مبنی سمجھا لیکن قادیانیوں نے ان کے ہی نہیں تمام مسلمانوں کے اعتماد کو بھینس پہنچائی اور جلد ہی اپنے اصل مقاصد کو آشکار کر دیا۔ وہ اپنی جماعتی اغراض کی تکمیل کے ساتھ ساتھ برطانوی کھیل کھیل رہے تھے۔

علامہ اقبال کے لئے یہ ایک تلخ تجربہ ثابت ہوا۔ کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم کو قادیانیوں نے جس انداز سے اپنی سیاسی اغراض اور جماعتی مفاد کے لئے استعمال کیا اس نے علامہ اقبال کو جماعت احمدیہ قادیان کے سیاسی کردار، مرزا محمود کی منفرد مذہبی پوزیشن، ان کے پیروکاروں کی عقیدت اور اندھی اطاعت اور ان کی محض جماعتی کاموں میں دلچسپی جیسے امور پر غور کرنے میں مدد دی۔

اب ہم کشمیر کمیٹی کے قیام، علامہ اقبال کے مخلصانہ کردار اور قادیانی سازشوں کا ذکر کرتے ہیں۔

1930ء میں کشمیر میں داخلی حالات بہت خراب تھے۔ ڈوگرہ راج میں مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا، وہ نہایت کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کشمیر جغرافیائی لحاظ سے اہم خطہ تھا۔ روس کے توسیع پسندانہ مقاصد اور ہندوستان میں کمیونسٹوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے برطانوی حکومت اس پر اپنا مکمل سیاسی تسلط جمانا چاہتی تھی لیکن معاہدہ امرتسر 1846ء کی بعض دفعات اس کے عزائم میں حائل تھیں اس کے علاوہ ہندوستانی ریاستوں کے چیئرمین آف پرنسز Chamber of Princes کی موجودگی میں انگریز کشمیر میں براہ راست مداخلت نہ کر سکتے تھے۔

7 جون 31ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ

مہاراجہ ہری سنگھ کشمیر کونسل میں ایک مسلمان کو نشست دے اور صیغہ تعلیم کا ممبر بنائے۔ اس کے لئے علامہ اقبال کا نام پر زور طریقے سے پیش کیا گیا۔ (36)

برطانوی سامراج نے اپنے سیاسی عزائم اور خارجہ پالیسی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے قادیانیوں کی خدمات حاصل کیں۔ وہ ایک ایسی جماعت تھی جو ان کی انتہائی وفادار اور تابع فرمان تھی۔ وہ پہلے ہی سے ہندوستان میں اپنی طاقت کا مرکز قائم کرنے کی فکر میں تھے (37) اور ان کے مبلغ وسط ایشیاء اور روسی علاقوں میں تبلیغ کے نام پر برطانوی حکومت کی خدمت اور جاسوسی کرنے کے جرم میں قید و بند اور ملک بدری کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ انگریز کے اشارے پر کشمیر میں قدم جما کر قادیانی اس علاقے میں پہلے سے قائم 80 کے قریب احمدیہ مراکز کو فعال بنا سکتے تھے اور پچاس ہزار کشمیریوں کو متحرک کر سکتے تھے نیز نئے مراکز قائم کر سکتے تھے۔ وہ کشمیر میں موجود قادیانی جماعت کو منظم و مستحکم کر سکتے تھے۔ مزید کشمیریوں کو قادیانی بنا سکتے تھے اور کشمیر میں تحریک اٹھا کر مہاراجہ کشمیر کو انگریز کے آگے جھکنے پر مجبور کر سکتے تھے، جس کے لئے وہ تیار نہ تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ مستقبل میں پنجاب کی سیاست میں اپنا کردار متعین کر سکتے تھے۔ مرزا محمود 1927ء کے بعد مذہبی رہنما کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما بننے کے لئے بیتاب تھے۔ اس کے لئے انہوں نے سیاسی معاملات پر رائے زنی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

کشمیر کمیٹی

سرفضل حسین کے اشارے پر 25 جولائی 1931ء کو شملہ میں مسلم زعماء کے ایک اجلاس میں کشمیر کمیٹی قائم ہوئی۔ (38) علامہ اقبال نے مرزا محمود احمد خلیفہ قادیان کے صدر بننے کی تجویز پیش کی۔ قادیانی پہلے ہی سے کمیٹی پر قبضہ کے لئے سرگرم تھے اور موقع کی تلاش میں تھے کہ انہیں کمیٹی کی صدارت یا ڈکٹیٹر شپ مل جائے۔ علامہ اقبال نے کشمیر کا ز کے لئے اپنے دیرینہ خلوص اور نیک نیتی کی بناء پر مرزا محمود کو صدارت کی پیش کش کی۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ قادیانی ایک منظم جماعت ہیں، وہ ایک سربراہ کی مکمل اطاعت کرتے ہیں، ان کے پاس مالی وسائل ہیں اور سب سے بڑھ کر

انگریز سے ان کے گہرے روابط ہیں اگر ان کی وساطت سے کشمیری مسلمانوں کو بعض سیاسی حقوق مل جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کشمیری ہونے کے ناطے وہ کشمیریوں کی فلاح و بہبود کے لئے گذشتہ کئی سالوں سے سرگرم عمل تھے۔ علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی سے مکمل تعاون کیا۔ کشمیریوں کی امداد کے لئے جلسے کئے، چندوں کی اپیل کی اور دوسری گول میز کانفرنس کے دوران وزیر ہند سے ملاقات کی۔

کشمیر کمیٹی نے جولائی 1931ء میں اپنا باقاعدہ کام شروع کیا تو چند ماہ بعد اس کی کارکردگی دیکھ کر مسلم زعماء کو پتہ چلا کہ قادیانی اپنا اور برطانوی سرکار کا وضع کردہ سیاسی کھیل کھیلنے کے لئے کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم کو استعمال کر رہے ہیں اور انہوں نے کشمیر میں تبلیغی اڈے قائم کر کے غریب کشمیریوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ (39) وہ مرزا محمود کو کشمیر کے نجات دہندہ، اسیروں کی رستگاری کرنے والے رہنما (40) اور ایک عظیم سیاسی قائد کے طور پر پیش کر رہے ہیں جن کی قیادت اور خلافت کو مسلم زعماء خصوصاً علامہ اقبال جیسی ہستی تسلیم کر چکی ہے اور کشمیر میں جو مالی امداد آرہی ہے اور کشمیری مسلمانوں کے حقوق کے لئے جو جنگ لڑی جا رہی ہے وہ ان ہی کے دم قدم سے ہے۔ کشمیر میں 'الفضل' قادیان کی خریداری کئی گنا بڑھ گئی اور اس کی سینکڑوں کاپیاں مفت تقسیم کی جانے لگیں۔ بعض مسلمان ایک وفد لے کر مرزا محمود کے پاس قادیان گئے۔ انہوں نے درخواست کی کہ الفضل چونکہ جماعت احمدیہ کا ترجمان ہے اس لئے کشمیر کمیٹی کی خبروں کی اشاعت بند کر دے، اس کے لئے کمیٹی اپنا الگ اخبار نکالے کیونکہ صدر کشمیر کمیٹی نے مسلمان رہنماؤں اور مخیر حضرات سے کافی رقومات حاصل کر لی ہیں لیکن وہ اس تجویز کو نہ مانے۔ (41)

مرزا محمود نے یکم اگست 1931ء کو وائسرائے لارڈ ولنگٹن سے ملاقات کی اور کشمیر کے معاملات میں برطانوی مداخلت کی تجویز پیش کی جو انہوں نے نہ مانی پھر ایک اور تجویز پیش کی کہ ایک مسلم وفد مہاراجہ کشمیر کے پاس جا کر گفت و شنید کرے اور مسلم مطالبات پیش کرے۔ اس بات کو وائسرائے نے پسند کیا۔ وفد کے ممبران کو منتخب کرتے وقت مرزا محمود نے پہلے علامہ اقبال کا نام اس

میں شامل نہ کیا لیکن بعد میں شامل کر لیا۔ علامہ اقبال مہاراجہ کشمیر کے پاس وفد لے جانے کے حق میں نہ تھے، انہوں نے اس تجویز کو نہ مانا اور ایک تین رکنی وفد لندن بھیجنے کی تجویز پیش کی جو گول میز کانفرنس میں کشمیر کے مسئلہ پر سیکرٹری آف سٹیٹ کو صورت حال سے آگاہ کرے۔ (42)

14 اگست 1931ء کو ہندوستان میں کشمیر ڈے منایا گیا اور کشمیری مسلمانوں سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔ علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی کو موثر بنانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ پنجاب کے مسلم رہنماؤں کو کشمیر کمیٹی کے حقیقی کردار کا جائزہ لینے کا بخوبی موقع مل گیا۔ علامہ اقبال بھی اس بات کا مشاہدہ کر رہے تھے کہ قادیانی بڑی عیاری سے کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم کو اپنے جماعتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ قادیانی ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی طرح کشمیریوں کو بھی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔ انہیں کشمیری مسلمانوں کی جگہ کشمیری بھائی کہتے تھے۔ ان کی مسئلہ کشمیر سے ہمدردی کسی خلوص پر مبنی دکھائی نہیں دیتی تھی اس لئے اس کی روک تھام ضروری تھی۔

خوش قسمتی سے کشمیر کمیٹی کے اصل مقاصد اور قادیان کے سیاسی عزائم کو آشکار کرنے کے لئے مجلس احرار اسلام کی صورت میں ایک جماعت معرض وجود میں آئی۔ 1931ء میں یہ تنظیم منظر عام پر آگئی۔ اس کے شعلہ بیان مقررین سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حبیب الرحمن لدھیانوی، ماسٹر تاج الدین انصاری وغیرہ نے اعلان کیا کہ کشمیر کمیٹی پر قادیانیوں نے تسلط جما رکھا ہے اور وہی اس کے کرتا دھرتا بنے بیٹھے ہیں۔ وہ کشمیری مسلمانوں کی امداد کے نام پر اپنے اور برطانوی سامراج کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔ (43) برطانیہ کا مقصد ایک تو مہاراجہ پر دباؤ بڑھا کر گلگت اور ملحقہ علاقوں کا کنٹرول حاصل کرنا تھا تا کہ روسی خطرے کا مقابلہ کیا جاسکے دوسرے اس کا خیال تھا کہ جس طرح وسط ایشیاء اور ہندوستان کے شمالی علاقوں میں اسماعیلی اپنے سربراہ آغا خان کی ہدایت پر انگریزوں کے لئے کام کر رہے تھے۔ (44) اسی طرح قادیانی مرزا محمود کے اشارے پر کشمیر کے طول و عرض میں کام کر سکتے تھے۔ قادیانیوں نے کشمیر کی ابھرتی ہوئی قیادت خصوصاً شیخ عبداللہ کو اپنا

ہمنو اپنا رکھا تھا اور اس کے ذریعے کشمیر میں سیاسی تحریک اٹھا رہے تھے۔ شیخ عبداللہ قادیان سے مالی امداد اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مسلم زعماء کو یقین ہو گیا کہ مرزا محمود کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنانا سیاسی لحاظ سے غلط فیصلہ تھا، اس طرح قادیانیوں کو پہلی دفعہ کھل کر سیاست میں آنے کا موقع ملا ہے اور ان کی قدیم سے چلی آرہی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی ختم ہو رہی ہے۔ مرزا محمود کا ایک سیاست دان کے طور پر امیج ابھر رہا ہے اور انہیں احساس ہو چلا ہے کہ وہ سیاسی تحریکوں کی حمایت اور قیادت سے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔

مجلس احرار نے اپنی الگ کشمیر پالیسی وضع کی۔ انہوں نے مولانا مظہر علی اظہر کی قیادت میں کشمیر چلو تحریک اٹھا کر ستمبر 1931ء میں ہزاروں رضا کار جموں اور وادی کشمیر میں داخل کر دیئے، کئی گرفتار ہوئے، کئی کشمیر سے نکالے گئے اور 22 شہید ہوئے۔ یہ ایک عظیم تحریک تھی۔ (45)

وزیر اعظم کشمیر ہری کشن کول نے برطانوی ریڈیو سنٹر کشمیر سے مشورہ کے بعد پنجاب حکومت سے درخواست کی کہ ان جتھوں کے کشمیر میں داخلے کو روکے تاکہ کشمیر میں امن و امان تباہ نہ ہو۔ حکومت بھی اسی انتظار میں تھی۔ انہوں نے احرار جتھوں کو روکا لیکن احرار رضا کار جان پر کھیل کر کشمیر میں داخل ہوتے رہے۔ احرار کے کانگریسی قیادت سے روابط تھے۔ کانگریسی رہنماؤں اور خود مہاتما گاندھی نے لندن سے احرار کی تحریک کی مخالفت کی لیکن انہوں نے اس کو نظر انداز کر کے اپنی تحریک جاری رکھی۔ (46)

نومبر 1931ء میں جمعیت العلمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ نے احرار اور کشمیر انتظامیہ میں گفت و شنید کرانے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔ اس سلسلے میں جو خط و کتابت احرار اور وزیر اعظم کشمیر کول کے درمیان ہوئی اسے مجلس احرار نے شائع کر دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کول کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے میں مخلص نہ تھا۔ کشمیر میں انگریز کے سیاسی عزائم کا اس بات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ گول میز کانفرنسوں کے دوران ایک تجویز زیر غور آئی جس کے تحت مہاراجہ ہری سنگھ سے وادی کشمیر اور گلگت حاصل کر کے سر آغا خان کو اس کا حکمران بنانا تھا اور مہاراجہ کو پنجاب کا کانگریز کا علاقہ

دیا جاتا تھا۔ سکریٹری آف سٹیٹ سر سیمون ہور نے یہ تجویز وائسرائے ہند لارڈ ولینگٹن کو روانہ کی لیکن مہاراجہ کشمیر نے اس کی سخت مخالفت کی۔ وہ تقسیم کشمیر کے کسی بھی منصوبے کو اپنی حاکمیت اور معاہدہ امرتسر کی شرائط کے منافی سمجھتا تھا۔ (47)

احرار رہنما عوام کی زبان میں بات کرتے تھے ان کے حقیقی مسائل اور ان کے مطالبات کو بیان کرتے تھے وہ اشتراکی نوعیت کے نظریات کا پرچار کرتے تھے۔ تاشقند میں قائم روس کے تربیتی کیمپوں میں انقلاب کا درس حاصل کرنے والے اشتراکی عناصر سے ان کے رابطے تھے (48) شمال مغربی سرحدی علاقے میں مسٹر داس، مسٹر صفدر، کامریڈ غلام محمد جیسے لوگ روس کے اشارے پر کام کر رہے تھے۔ ان کی کشمیر میں اٹھنے والی تحریکوں پر نظر تھی۔ جس زمانے میں احرار نے کشمیر میں تحریک چلائی اور وزیر اعظم ہری کشن کول سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس وقت لندن میں گول میز کانفرنس جاری تھی۔ مہاراجہ کشمیر لندن میں موجود تھا، برطانوی رائے عامہ اس کے خلاف تھی کیونکہ اس نے برطانیہ کی مخالفت اور کانگریس کے حق میں تقریر کی تھی۔ وہ کشمیر میں مقیم برطانوی ریڈیڈنٹ کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ (49) لندن میں قیام کے دوران اس کے ایک جنسی سیکنڈل کی خبر برطانوی پریس میں شائع ہوئی لیکن اس کا نام مخفی رکھا گیا اور مسٹر اے (A) کے نام سے یہ باتیں منظر عام پر آئیں۔

کشمیری عوام کی طویل جدوجہد اور سیاسی دباؤ کے نتیجے میں مہاراجہ کشمیر سیاسی اصلاحات کے لئے سرگلائی کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کرنے پر راضی ہو گیا۔ 1932ء میں مہاراجہ کشمیر نے گلائی کمیشن کی بہت سی سفارشات مان لیں ایک اور اہم پیش رفت ایک متعصب اور مسلمانوں کے مخالف وزیر اعظم ہری کشن کول کی جگہ مارچ 1932ء میں کرنل کالون کا بطور وزیر اعظم تقرر تھا۔ کشمیری مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی جس کا پہلا اجلاس اکتوبر 1932ء کو ہوا۔

گلائی کمیشن کے تقرر میں علامہ اقبال کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے

بیان کے مطابق سرحد اللہ نواب بھوپال مہاراجہ کشمیر کے دوست تھے۔ علامہ اقبال کے نواب بھوپال سے قریبی تعلقات تھے ان کے ذریعے علامہ اقبال نے مہاراجہ کشمیر کو گوانسی کمیشن مقرر کرنے پر راضی کر لیا تھا۔ (50) جس کی سفارشات پر عمل درآمد کے بعد کشمیر میں مسلمانوں کو سیاسی حقوق ملے۔

1933ء میں پنجاب کے مسلم رہنماؤں نے کشمیر کمیٹی کی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد

مطالبہ کیا کہ ایک تو کمیٹی کا دستور تیار کیا جائے تاکہ وہ کسی ضابطے کے تحت کام کرے اور قادیانی اپنی

من مانی کاروائیاں نہ کر سکیں دوسرے اس کا غیر قادیانی صدر منتخب کیا جائے۔ 6 مئی 1933ء کو مسلم

اراکین کمیٹی نے ایک خصوصی اجلاس بلانے کا مطالبہ کیا۔ مرزا محمود اس تجویز سے سخت برہم ہوئے،

انہوں نے جان لیا کہ ان کی صدارت خطرے میں ہے اور وہ آئندہ کمیٹی کے نام کو اپنے جماعتی مفاد

کے لئے استعمال نہیں کر سکیں گے۔ 7 مئی کو سیسل ہوٹل لاہور میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس ہوا مرزا محمود

نے بدلتے حالات کے پیش نظر استعفیٰ دے دیا۔ ان کو معلوم تھا کہ ممبروں کی بھاری اکثریت ان کے

خلاف ہے۔ اس موقع پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ کمیٹی کے پاس کوئی فنڈ نہیں بلکہ وہ مقروض ہے۔

علامہ اقبال قائم مقام صدر اور ملک برکت علی کمیٹی کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ قادیان میں غم و غصے کی

لہر دوڑ گئی اور علامہ اقبال کی کردار کشی اور ان کو برا بھلا کہنے کی در پردہ مہم کا آغاز کر دیا گیا۔

قادیانیوں نے الزام لگایا کہ علامہ اقبال ہی نے دو سال قبل حضور (مرزا محمود) کو اصرار کر کے صدر

بنایا تھا اور اب خود صدر بن بیٹھا ہے۔ صدارت چھین جانے کے بعد مرزا محمود کی کشمیریوں سے

بہمدردیاں سرد پڑ گئیں۔ انہوں نے قادیانی وکلاء کو حکم دیا کہ وہ کشمیریوں کے مقدمات کی پیروی بند کر

دیں اور کمیٹی کی کسی قسم کی سرگرمی میں حصہ نہ لیں یہ ان کی مفاد پرستی کی تین دلیل تھی۔ کشمیر کے کئی

چھوٹے بڑے لیڈر جو قادیان سے باقاعدہ مالی امداد لے رہے تھے علامہ اقبال کی صدارت کے

خلاف شور مچانے لگے۔ شیخ عبداللہ بھی اس سے ناخوش تھے۔ کشمیر میں سرگرم قادیانی مبلغوں نے ہر

ایرے غیرے نام نہاد کشمیری لیڈر سے مرزا محمود کو خط لکھوائے جن میں درخواست کی گئی تھی کہ حضور

واپس آئیے اور کمیٹی کی صدارت سنبھالنے آپ کے بغیر گلشن کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ اقبال کے پاس

نہ تو در کریں نہ پیسہ ہے نہ جماعتی تنظیم ہے نہ آپ جیسے انگریز سے رابطے ہیں نہ آپ جیسا سیاسی تدبیر رکھتا ہے اسے کشمیری رہنماؤں خصوصاً شیخ عبداللہ کا تعاون بھی حاصل نہیں ہے وہ جلد ہی کشمیر کمیٹی کی صدارت کو چھوڑ جائے گا۔ (51) پنجاب کے بعض مسلم رہنماؤں نے سرفضل حسین کی خوشنودی کے لئے مرزا محمود کو خطوط لکھے کہ وہ کمیٹی میں واپس آ جائیں چونکہ قادیانیوں کو اپنی جماعتی اور سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ ابھی مرزا محمود کی صدارت والی اصلی تے وڈی کشمیر کمیٹی قائم ہے، اقبال والی نئی کشمیر کمیٹی ہے جس کے وہ صدر بن بیٹھے ہیں۔ علامہ اقبال کی صدارت کو ناکام بنانے کے لئے قادیانیوں نے کشمیر کے اندر قیادت کا بحران اور داخلی انتشار پیدا کیا۔ میر واعظ یوسف شاہ قادیانیوں کے خلاف تھے ان کے خلاف بیان بازی کے لئے انہوں نے میر واعظ ہمدانی گروپ کھڑا کر دیا جو شیخ عبداللہ کا ہمنوا تھا۔ علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران کشمیریوں کی ہر ممکن مدد کی، انہوں نے ان کے مقدمات کی پیروی کے لئے وکلاء بھجوائے، فنڈ جمع کئے اور وائسرائے ہند کو تار روانہ کئے۔ 4 جون 1933 کو برکت علی ہال لاہور میں علامہ اقبال کی زیر قیادت کشمیر کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا اس میں مرزا محمود اور لاہوری جماعت کے مرزا یعقوب بیگ نے شرکت کی، اس میں تجویز پیش کی گئی کہ کشمیر میں مختار طبقات (میر واعظ یوسف شاہ اور ہمدانی گروپ) میں صلح کرانے کے لئے ایک 10 رکنی مصالحتی بورڈ کشمیر جائے اس میں علامہ اقبال شامل ہوں۔ (52)

7 جون 1933ء کو علامہ اقبال نے ایک بیان میں کہا کہ بعض کشمیری رہنما لاہور آئے ہیں۔ انہوں نے کشمیر کے حالات پر مختلف خبریں سنائی ہیں وہ برطانوی ہند کے مسلمانوں اور کشمیری مسلمانوں کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ (ہم انہیں سمجھائے دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ قادیانی آلہ کاروں نے کشمیر کمیٹی توڑنے، ان کی صدارت ختم کرنے اور ان کو بدنام کرنے کے لئے کیا۔ مصنف) اس کے بعد علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اس چال کے پیچھے کچھ بھی ہو وہ اس واقعے کے متعلق متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ کشمیر کمیٹی کے ارکان اتنے

بے وقوف نہیں کہ اس دام میں پھنس جائیں گے جو ان کے لئے بچھائے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپیل کی کہ کشمیری مسلمان آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کریں۔ کشمیر میں ایک سیاسی خیال کی حامل متفقہ جماعت ہی ان کے مفاد کی ضامن ہو سکتی ہے۔ (53) علامہ اقبال قادیانیوں کی درپردہ سازشوں سے آگاہی حاصل کرتے جا رہے تھے۔

مہاراجہ کشمیر کی حکومت پہلے ہی سے کشمیر کمیٹی جیسی تنظیموں کے خلاف تھی۔ اس نے برطانوی ریڈیڈنٹ مقیم کشمیر کے ذریعے پنجاب حکومت پر دباؤ ڈالا کہ کمیٹی کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرے۔ علامہ اقبال کے صدر بننے کے بعد حکومت پنجاب ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی اور ان پر اور ان کے ساتھیوں پر مقدمات قائم کرنا چاہتی تھی لیکن اس تجویز پر عمل درآمد نہ کیا گیا کیونکہ انہیلی جنس کی رپورٹوں سے پتہ چلتا تھا کہ کشمیر کمیٹی مائل بہ پرواز نہیں ہو سکتی۔ (54) 4 جون 1933ء کے اجلاس کی تجویز کے مطابق جس وفد کو مذہبی اور سیاسی رہنماؤں میں مصالحت کے لئے کشمیر جانا تھا اس کی حکومت کشمیر نے اجازت نہ دی۔ حکومت خاص طور پر علامہ اقبال کے کشمیر جانے کے خلاف تھی۔ مرزا محمود کی سازشوں، کشمیر اور پنجاب میں سرگرم قادیان نواز عناصر کی چالوں، قادیانیوں کے کشمیر کمیٹی سے مکمل طور پر عدم تعاون، مالی وسائل کی کمی، حکومت پنجاب کی ناپسندیدگی اور سر فضل حسین کی سیاسی حکمت عملی کے نتیجے میں 20 جون 1933ء کو علامہ اقبال نے مجبوراً کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ (55)

اس اعلان کے ساتھ ہی الفضل قادیان اور پنجاب کے قادیانیت نواز پریس نے شور مچا دیا کہ علامہ اقبال کو آخر کار استعفیٰ دینا ہی تھا۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ جو کام مرزا محمود نے کئے وہ اپنی بے بضاعتی کے باعث ایسے کام کیسے انجام دے سکتے تھے۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران علامہ اقبال کو قادیانیوں کے مذہبی معتقدات اور سیاسی کردار کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اب وہ کھل کر ان کے مخالف ہو چکے تھے۔

20 جون 1933ء کو کمیٹی سے استعفیٰ دیتے وقت علامہ اقبال نے جو بیان دیا اس میں

قادیانیوں کے رویے، کشمیر کمیٹی کو دو نکتے کرانے کی ان کی سازش اور کمیٹی کی کارروائیوں سے عدم تعاون پر افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ قادیانی صرف مرزا محمود کا حکم مانتے ہیں اور ان کے کہنے پر کام کرتے ہیں، ان کو کشمیریوں سے حقیقی بھائی نہیں ہے۔ ان کی صدارت کے مختصر عرصے میں قادیانی ورکرزوں نے تمام کام سبب کر دیا، مقدمات کی پیروی ختم کر دی اور اعلان کیا کہ وہ کسی کمیٹی کو نہیں مانتے وہ صرف اپنے خلیفہ کا حکم مانتے ہیں، مقدمات کی پیروی ترک کرنے میں ظفر اللہ پیش پیش تھے۔ کشمیر کمیٹی کے مینڈیٹ کی بنیاد پر بعض قادیانی مبلغوں شیخ بشیر احمد، زین العابدین ولی اللہ شاہ، صوفی عبدالقدیر وغیرہ نے برطانوی ریڈیو میں مقیم کشمیر لیٹر Latimer اور کرنل ہیلی کے اشاروں پر کام کیا۔ کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دینے کے متعلق ایک بیان (21 جون) میں علامہ اقبال نے ایک کمیٹی قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو عوام کی تائید سے بنے اور کشمیری مسلمانوں کی مدد جاری رکھے۔

28 جون 1933ء کو مفتی محمد صادق ناظم امور خارجہ جماعت قادیان نے ایک بیان دیا کہ علامہ اقبال نے جوئی کشمیر کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا ہے وہ نامناسب ہے یہ صرف لاہور کے عوام کا انتخاب ہوگا۔ احمدی کمیٹی کے نئے آئین کی تشکیل میں دوٹ نہیں دیں گے اگر پھر بھی اقبال کہتے ہیں کہ احمدیوں کا اس کمیٹی میں حصہ لینا منسرف ہے تو وہ کمیٹی سے مستعفی ہو جائیں گے۔ (56)

جولائی 33 میں لاہور میں ایک جلسہ منعقد کر کے غیر احمدیوں پر مشتمل ایک کشمیر کمیٹی بنائی گئی، علامہ اقبال اس کے صدر تھے۔ لاہوری احمدی ڈاکٹر یعقوب سیک نے (57) اگست 1933ء کے انٹرنیشنل میں ایک بیان دیا کہ کشمیر کمیٹی سے احمدیوں کو نکالنا ناجائز جتنی بڑی غلطی ہے۔ مرزا محمود احمد نے کمیٹی کے لئے بہت خدمات انجام دی ہیں ان کو کمیٹی میں قومی رکن کے طور پر الگ نہیں کرنا چاہئے تھے۔ کشمیر کمیٹی کو مسلمانوں کا نمائندہ ادارہ ہونا چاہئے، قادیان اور لاہور جماعت کے افراد کو ساتھ لے کر چلتے۔ علامہ اقبال کا یہ کہنا کہ احمدی مختصر کو کمیٹی سے مذہبی بنا پر علیحدہ نہیں کیا گیا تو وہ احمدیوں سے نفرت و تشدید کریں ایسے ہی ملک برکت علی کا یہ کہنا کہ قادیانی کشمیریوں کی امداد کی بجائے احمدیت

کی تبلیغ کر رہے ہیں تو یہ میر واعظ یوسف شاہ کا پردیگندہ ہے، اس الزام کو ثابت کیا جاتا۔ لاہور اور قادیان جماعت گذشتہ 19 سال (1914-1933) کی علیحدگی کے بعد کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئیں، اس لئے علامہ اقبال سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ متحدہ مخاذا قائم کریں۔ (58)

20 جون 1933 کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ کے بعد جولائی 33 کے آخر تک حکومت پنجاب نے علامہ اقبال کی سرگرمیوں پر بڑی نظر رکھی۔ یکم جولائی کو حکومت کو اطلاع ملی کہ علامہ اقبال اور ملک برکت علی سری نگر کا دورہ کرنے والے ہیں۔ یہ افواہیں بھی عام تھیں کہ وہ قادیانیوں کی طرف سے تقسیم کئے جانے والے تین رسائل کے جواب میں ایک رسالہ تقسیم کرانا چاہتے ہیں۔ جولائی کے دوسرے ہفتے میں علامہ اقبال، ملک برکت علی اور سید محسن شاہ کے دستخطوں سے ایک اشتہار وادی کشمیر میں تقسیم ہوا جس نے بالکل مچا دی۔ کشمیر میں مقیم برطانوی ریذیڈنٹ کی ہدایت پر حکومت پنجاب نے علامہ اقبال کو وارننگ دی کہ وہ کشمیر کے معاملات میں مداخلت بند کر دیں۔ (59) علامہ اقبال نے پنجاب حکومت کے دباؤ، نامساعد حالات اور کشمیر انتظامیہ کی مخالفت کے باوجود کشمیریوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے اپنی تحریک کسی نہ کسی رنگ میں جاری رکھی۔ وہ خود کشمیر جانا چاہتے تھے لیکن 1931ء کے بعد ان کی وفات 1938ء تک ان کا کشمیر میں داخلہ بند رہا۔

سر فضل حسین کشمیر کمیٹی کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے تھے۔ 26 جون 1933ء کو انہوں نے سر ظفر اللہ کو خط لکھا جس میں کشمیر کمیٹی میں جاری سازشوں کا ذکر کیا۔ پہلے مرزا صاحب نے استعفیٰ دیا اب اقبال نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اور ایک بیان جاری کیا ہے کہ انہوں نے استعفیٰ مرزا صاحب کے پیروکار احمدیوں کی تخریب کارانہ سرگرمیوں کی وجہ سے دیا۔ مسلم رہنما ذاتی مفاد کے لئے فرقہ وارانہ مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں، اس بحث سے جو نقصان ہوتا تھا ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ کیا یہ آپ (سر ظفر اللہ) کے لئے ممکن ہے کہ مرزا (محمود) صاحب کو یہ بتا دیں۔ (60)

کشمیر کمیٹی کو قادیانیت کی تبلیغ کے لئے استعمال کرنے اور جماعتی اغراض کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے کی قادیانی روش کا شیخ عبد اللہ نے بھی اپنی آپ بیتی میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بہت جلد ہم پر قادیانی حضرات کے اصل مقاصد بھی آشکار ہونے لگے انہوں نے ہماری تحریک کی آڑ میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو عام کرنا شروع کیا تو میرے ساتھ میرے کچھ اور ساتھیوں نے اس غلط رجحان پر تشویش محسوس کی اور قادیانی حضرات مجھ سے بھی برگشتہ ہو گئے۔ شیخ عبداللہ مزید لکھتے ہیں کہ لاہور میں انہوں نے ایک میننگ طلب کی جس میں مرزا محمود بھی آئے اس میں انہوں نے کہا کہ کچھ عرصے سے قادیانی عقیدے کے دوستوں نے اس پلیٹ فارم (کشمیر کمیٹی) سے اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی ہے اگر اس پر روک نہ لگائی گئی تو نتائج بہت تباہ کن ہوں گے۔ مرزا صاحب نے میری تقریر صبر و سکون کے ساتھ سنی پھر بولے ”احمدی جماعت بنیادی طور پر ایک تبلیغی جماعت ہے ہم نے پہلے پہل کشمیر میں اس قسم کی سرگرمیوں پر روک لگا رکھی تھی لیکن یہ ایک عارضی مرحلہ تھا، ہمارے لئے مستقل طور پر اس کی پابندی کرنا اور اپنے مشن سے دستبردار ہونا ممکن نہیں ہے اس پر میں نے دو ٹوک جواب دیا کہ ایسے حالات میں احمدی جماعت کے ہم خیال کارکنوں کا تحریک سے وابستہ رہنا نہ مناسب ہے اور نہ ممکن۔“ (61)

3 ستمبر 1933ء کو مرزا محمود نے لوریگ ہوٹل لاہور میں ایک نئی کشمیر کمیٹی (تحریک کشمیر) قائم کی اور علامہ اقبال کو اس کی صدارت کی پیش کش کی۔ علامہ نے اسے ایک فریب قرار دیا اور واضح کیا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ (قادیانی) یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سابقہ کشمیر کمیٹی ختم نہیں ہوئی بلکہ نئی کمیٹی کے پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ ان کی یہ چال کہ وہ اسباب جن کی بنا پر انہوں نے کشمیر کمیٹی کی از سر نو تشکیل کرائی تھی اب ختم ہو چکے ہیں، نہ انہیں اور نہ مسلم عوام کو قائل کر سکتی ہے۔ ابھی تک قادیانی ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے کوئی واضح اعلان نہیں ہوا کہ کسی مسلم ادارے میں شامل ہونے کی صورت میں قادیانیوں کی اطاعت و طرفہ نہ ہوگی۔ بلکہ یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ تحریک کشمیر کے نام سے قائم کردہ ادارہ جس میں بقول الفضل مسلمانوں کو صرف رسمی طور پر شرکت کی اجازت دی گئی تھی اغراض و مقاصد کے لحاظ سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے بالکل مختلف ہے۔ قادیانی جماعت کے سربراہ (مرزا محمود) نے کشمیری بھائیوں کے نام کئی خطوط لکھے ہیں۔ انہیں غیر قادیانی ہونے کے وجہ سے مسلمان

کے بجائے بھائی کہا گیا ہے یہ بات اس قادیانی تحریک کے پوشیدہ اغراض و مقاصد کا انکشاف کرتی ہے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات میں ایک مسلمان کس طرح ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے جس کا اصل مقصد غیر فرقہ واریت کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت (قادیانی - مصنف) کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ (62)

یہ دوسرا اہم موڑ تھا جس نے علامہ اقبال کو قادیانیت کے مذہبی معتقدات اور سیاسی عزائم سے شناسائی حاصل کرے کا موقع فراہم کیا۔ ان مشاہدات کو بعد میں انہوں نے قادیانیت کے خلاف لکھے جانے والے مضامین میں پیش کیا۔

28 مارچ 1934ء کو قادیانیوں نے ایک آل انڈیا کشمیر ایسوسی ایشن قائم کی۔ (63) انہوں نے کشمیر کے معاملات میں اپنی مداخلت جاری رکھی وہ کشمیریوں کو قادیانی بنانے، اس خطے میں تبلیغی مراکز قائم کرنے اور انگریز کے سامراجی مقاصد کی تکمیل میں سرگرم رہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تحریک کشمیر کے آخری دور میں مرزا محمود نے مہاراجہ کشمیر کا بھرپور ساتھ دیا۔ مسجد اور دارال تبلیغ کے نام پر مہاراجہ کشمیر سے چار کنال زمین لی اور فتح کدل سے غلام نبی گلکار کو الیکشن جتوایا۔ وہ اس نازک مرحلے پر کشمیریوں سے ہمدردی کو بھلا بیٹھے لیکن تقسیم کے بعد ایک دم کشمیر کے معاملات میں مداخلت کرنے لگے۔ (64)

قادیانیوں نے کشمیر کی سیاسی تنظیم مسلم کانفرنس سے اپنے خفیہ روابط قائم رکھے۔ (افروزی 1934ء کو علامہ اقبال نے پنشن کے وکیل نعیم الحق کو ایک خط میں لکھا:

جس مقدمے کی پیروی کے لئے میں نے آپ سے درخواست کی تھی۔ چوہدری ظفر اللہ خان کیوں کر اور کس کی دعوت پر وہاں جا رہے ہیں مجھے معلوم نہیں شاید کشمیر کانفرنس کے بعض لوگ ابھی قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں۔ (65)

شیخ عبد اللہ، پنڈت نہرو اور کانگریس

شیخ عبد اللہ بڑی تیزی سے کشمیریوں کے مقبول رہنما اور شیر کشمیر بن گئے تھے۔ ان کو میر واعظ

یوسف شاہ کی آزاد مسلم کانفرنس کی مخالفت کا سامنا رہا۔ 17-15 دسمبر 1933ء کو مسلم کانفرنس کے میرپور میں منعقد ہونے والے اجلاس میں شیخ عبداللہ نے علامہ اقبال کو شرکت کی دعوت دی لیکن انہوں نے مصروفیات کے باعث معذرت کر لی۔ کشمیر کے اندرونی حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ مسلم کانفرنس نے اپنے مطالبات کیلئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا پروگرام بنایا۔ شیخ عبداللہ کا مرزا محمود سے رابطہ قائم تھا اور وہ ان کی تجویز کردہ سیاسی حکمت عملی پر کام کرتے تھے۔ مرزا محمود نے یوں تو مختلف مواقع پر کشمیری بھائیوں کے نام آٹھ خطوط لکھے لیکن ان کا تحریر کردہ پمفلٹ 'حقیقتِ حال' بہت اہم ہے جس میں انہوں نے کشمیر میں سول نافرمانی کی تحریک چلانے سے منع کیا کیونکہ یہ ایک مشتبہ ہتھیار تھا جو دشمن کو ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو بھی ہلاک کر سکتا تھا۔ (66) انگریز بھی اس تحریک کے خلاف تھے۔

27 اگست 1934ء کو کشمیری رہنماؤں نے سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی۔ مسلم کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس 13-11 نومبر 1934ء کے بعد شیخ عبداللہ پنڈت نہرو سے ملے اب وہ نیشنلسٹ رہنما بننے جا رہے تھے۔ پنڈت نہرو خود کشمیری تھے ان کی بیوی کملا کشمیری تھیں۔ ایک ہوشیار سیاست دان ہونے کی وجہ سے وہ کشمیر کی سیاسی اور جغرافیائی حیثیت کو سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ برصغیر انگوٹھی ہے اور کشمیر اس کا گنبد ہے۔ جمیعت العلماء ہند پہلے ہی سے کانگریس کے ساتھ تھی۔ گاندھی جی نہرو کو آئندہ قیادت سنبھالنے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ (67) شیخ عبداللہ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ 1935ء میں انہوں نے لاہور میں پنڈت نہرو اور سیف الدین کپلو سے ملاقات کی اس کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ کشمیر میں فرقہ واریت پنجاب کے فرقہ پرست لیڈروں کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے ان کا آئندہ پروگرام کانگریس کے اصولوں پر کام کرنا ہوگا اور وہ عنقریب وطن کشمیر جا کر اس قسم کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالیں گے جو قوم پرور نظریے کی حامی ہو۔ 1937ء میں انہوں نے پنڈت نہرو سے لاہور انٹیشن پر ملاقات کی اور ان کے ساتھ سرحد گئے جہاں کئی روز قیام کیا۔ (68) 1936ء میں کشمیر کے وزیر اعظم کالون کی جگہ گوپال سوامی آئیٹنلر کو

وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اور 1939ء میں شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس بنا کر کانگریس سے اپنے روابط استوار کر لئے جو تقسیم ہند کے بعد بھی قائم رہے۔

نتائج:

1931ء سے 1934ء تک کشمیر کمیٹی نے کشمیری مسلمانوں کے سیاسی مسائل حل کرنے اور ان پر کئے گئے ڈوگر مظالم کے خلاف آواز بلند کی جس کے نتیجے میں گلانی کمیشن کا تقرر ہوا اور جموں و کشمیر مسلم کانفرنس قائم ہوئی۔ تحریک کشمیر کو ایک نئی جہت ملی اور مسلمانوں میں اپنے جائز حقوق کے حصول کا ولولہ تازہ پیدا ہوا۔ اس کا ز کے لیے مسلم رہنماؤں خصوصاً علامہ اقبال نے نمایاں کردار ادا کیا۔

☆ قادیانیوں نے سرفضل حسین، دوسرے لفظوں میں برطانوی سامراج، کے اشارے پر کشمیر کی سیاست میں حصہ لیا وہ کشمیری مسلمانوں سے مخلص نہ تھے، وہ ان کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ وہ کشمیر میں قادیانی بیس قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ مستقبل میں اس جغرافیائی لحاظ سے اہم خطے میں انگریز کے سیاسی مفادات کے لئے کام کر سکیں۔ وہ وسط ایشیاء اور روس میں سرگرم کمیونسٹ انقلابیوں کی جاسوسی کا فریضہ انجام دے سکتے تھے۔ (6) کشمیر کی 30 لاکھ کی آبادی کو قادیانی بنانا ممکن نہ تھا لیکن ان کی غربت، دین کی کم واقفیت اور دیگر مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں قادیانیت کا ہمنوا بنانا ممکن تھا۔ کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم کو قادیانیت کی تشہیر، کشمیری رہنماؤں کو ہارس فریڈنگ میں مبتلا کرنے، سامراجی پالیسیوں کی تکمیل اور مرزا محمود کے سیاسی قد کاٹھ میں اضافے کے لئے استعمال کیا گیا۔ احرار نے قادیانی عزائم کو بے نقاب کرنے میں اہم کردار ادا کیا اگرچہ ان کی تحریک بنگالی بنیادوں پر شروع ہوئی اور جلد ہی ختم ہو گئی۔

انگریز نے اپنا سیاسی مقصد حاصل کر لیا۔ پنجاب سے مہاراجہ کشمیر پر سیاسی دباؤ ڈال دیا گیا۔ پنجاب حکومت نے کشمیر حکومت کو کشمیر چلو تحریک کو کچلنے پر سرف ہونے والے اخراجات ادا کرنے کا نوٹس دیا۔ مہاراجہ نے مجبور ہو کر گلگت اور اس کے ارد گرد کا علاقہ 60 سال کے لیے

پر انگریز کو دے دیا تا کہ وہ روسی خطرے کا مقابلہ کر سکے۔

☆ سب سے بڑھ کر اس تحریک کی بدولت مسلمان رہنما خصوصاً علامہ اقبال قادیانی سازشوں سے آگاہ ہو گئے۔ ان کی کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران قادیانیوں نے جو روش اختیار کی اور جو درپردہ سازشیں کیں ان کے بعد علامہ قادیانیت اور قادیانیوں کے خلاف ہو گئے اور یہ مخالفت ان کی وفات تک جاری رہی۔

حوالے و حواشی

- (1) Rafiq Zakaria, Iqbal, The Poet and Politician, p.127
- (2) Mirza Mahmud Ahmad, Hindu - Muslim Problem, Qadian, Feb. 1927
- (3) تاریخ احمدیت جلد ششم ص 7
- (4) اقبال اور احمدیت صفحات 7-196
- (5) محمد حنیف شاہد، مفکر پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ص 268-269
- (6) اقبال اور احمدیت ص 196
- (7) تاریخ احمدیت جلد ششم ص 11
- (8) ایضاً
- (9) جسٹس محمد منیر، پاکستان ٹائمز 24 جون 1964ء
- (10) زاہد چوہدری، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء ص 102
- (11) تاریخ احمدیت جلد ششم ص 82
- (12) II مرزا محمود کی نام نہاد خود مختار مسلم ریاست کی تجویز
- (13) شیخ عبدالمجید، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 149
- (14) مرزا محمود احمد، نہرو رپورٹ مسلمانوں کے حقوق بکڈ پو تالیف و اشاعت قادیان 20 نومبر 1928
- (15) نہرو رپورٹ اور مسلمانوں کے حقوق ص 5
- (16) ایضاً 64
- (17) ایضاً 109
- (18) مرزا محمود احمد، ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسئلہ کا حل قادیان دسمبر 1930ء
- (19) ایضاً ص 30
- (20) ایضاً ضمیمہ 8
- (21) محمد رفیق افضل گفتار اقبال ص 108

(21) رفیق افضل، گفتار اقبال ص 148

(22) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت ص 206

(23) ایضاً

III تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش

(24) اقبال اور احمدیت ص 404

(25) ذکر اقبال ص 164

(26) تاریخ احمدیت جلد ششم ص 338-339

Sharif ud Din Pirzada , Foundation of Pakistan. p.187 (27)

Evolution of Muslim Political Thoughts, 1929-36 vol (iv), The (28)

Communal Award. A.M Zaidi pp, 110-112

(29) ایضاً

(30) ڈاکٹر عاشق حسین اقبال کے آخری دو سال ص 282 اور نور احمد، مارشل لاء سے مارشل تک ص

141-44

(31) محمد حنیف شاہد مفکر پاکستان ص 297

(32) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت ص 232 اقتباس ادارہ الفضل قادیان 3 اپریل 1932ء

IV کشمیر کمیٹی اور اقبال

(33) بشیر احمد، تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گلہ جوڑ، عبداللہ اکیڈمی، لاہور 2003ء ص: 143

(34) تاریخ احمدیت، جلد ششم، ص: 435-436

محرم علی چشتی کشتور میں حکیم نور الدین سے مل کر برطانوی اقتدار مسلط کرنا چاہتا تھا لیکن یہ منصوبہ ناکام ہوا

اور اس کو بھی کشمیر سے نکال دیا گیا۔ بعد میں وہ اخبار رفیق ہند لاہور کا ایڈیٹر بنا۔ (رفیق دلاوری، آئندہ تلخیص

لاہور 1937ء ص: 471)

(35) تاریخ احمدیت، جلد ششم، ص: 465

(36) روزنامہ انقلاب، لاہور 11 جون، 1931

(37) ممتاز احمد، مسئلہ کشمیر، لاہور، 58

(38) پروفیسر لیون پنسر کوپ لینڈ نے خفیہ سرکاری مراسلت اور کشمیر اور پنجاب کی حکومتوں کی خفیہ رپورٹوں کی بنیاد پر

جو تجربہ پیش کیا ہے اس کے لئے دیکھیں۔ بشیر احمد، احمدیہ مومنٹ: برٹش۔ جیوش۔ کنکشنز، راولپنڈی

1994ء زیر عنوان کشمیر میں قادیانی سازشیں، اس کتاب کے اردو ترجمے تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گٹھ

جوڑ (مترجم احمد علی ظفر) عبداللہ اکادمی لاہور 2003ء، باب 11 ص: 247 تا 320

(39) سید محمود آزاد، تاریخ کشمیر، سیادت پبلی کیشنز، مظفر آباد، 1970ء، ص: 208

(40) مرزا غلام احمد نے ایک آنے والے مصلح موعود کی جو صفات بتائیں ان میں ایک یہ تھی۔ مرزا صاحب کا سبز

اشتہار۔

(41) اخبار زمیندار، لاہور 17 اگست 1937ء

(42) تاریخ احمدیت جلد ششم ص: 499، 508

(43) ابوذر بخاری، احرار اور سرکاری خط و کتابت، ملتان 1968ء، ص: 14 تا 27

(44) K. Warikoo, Central Asia and Kashmir, Gian Publishing House, Delhi,

1989, p. 201

(45) Yousaf Saraf, Kashmir Fights for Freedom, Vol. I, Lahore, 1977,

p. 460-61

نیز دیکھیں:

عبداللہ ملک، پنجاب کی سیاسی تحریکیں، لاہور ص: 161 اشرف عطاء، کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشاں

تذکرے، لاہور 1966ء

(46) کوپ لینڈ، حوالہ سابق، ص: 240

(47) بشیر احمد، حوالہ سابق، ص: 155

Sir Samuel Hoare Papers, India Office Library, London

(48) اشرف عطاء، کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشاں تذکرے، لاہور، ص: 37

Prem Nath Bazaz, History of Struggle for freedom , p. 149 (49)

(50) محمد حنیف شاہد، مفکر پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص: 314

(51) تاریخ احمدیت جلد ششم، مؤلف دوست محمد شاہد میں سارا ریکارڈ موجود ہے۔

(52) اخبار انقلاب، 8 جون 1933ء

(53) حرف اقبال، ص: 191

Govt. of India Foreign & Political File 257 (p) Secret Report. 29 June (54)

1933, Quoted by Lavan.

(55) حرف اقبال، نیز عبداللہ قریشی کا مضمون اقبال اور کشمیر، مجلہ بزم اقبال اکتوبر 1956ء

(56) انقلاب، 28 جون 1933

(57) ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے بے نقاب کئے جانے پر بری طرح

تلملے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح قادیانیوں کو دوبارہ کشمیر کمیٹی میں شامل کر کے کھل کھیلنے کا موقع دیا

جائے۔ اسی لئے ان کو 1936ء میں انجمن حمایت اسلام سے علامہ اقبال نے نکلوا دیا تھا۔ حمزہ فاروقی، اقبال

کا سیاسی سفر، 316

(58) انقلاب، 9 اگست 1933ء

Political File 150, 1st July 1933, p. 154-5 (59)

11 July 1933, G.C. Garbett to Iqbal, Lavan p. 155

Letters of Sir Fazle Hussain, p. 310-311 (60)

(61) شیخ عبداللہ کی آپ بیتی، آتش چٹار، چوہدری اکیڈمی لاہور، صفحات 6-145

(62) حرف اقبال، ص: 196

(63) اخبار الاصلاح، سری نگر، 4 جولائی 1946ء، دوست محمد شاہد، تاریخ احمدیت جلد ششم، ص: 628

(64) الفضل قادیان (1 جنوری، 1946)

(65) اقبال نامہ حصہ اول ص: 435

(66) تاریخ احمدیت، جلد ششم، ص: 37 ضمیمہ

Yousaf Saraf, opcit p-507 (67)

(68) آتش چنار، ص: 145

(69) کمیونسٹوں کی تاشقند وسط ایشیاء اور ہندوستان میں سرگرمیوں کے نئے دیکھیں

Joseph Korbel, Danger In Kashmir, U.S.A

علامہ اقبال نے 1933ء میں قادیانیت کے خلاف مضامین کیوں نہ لکھے؟

عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے وسط 1933ء میں کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دیا۔ ان کو اس زمانے میں قادیانیوں کی سیاسی چالوں اور ان کی مفاد پرستانہ سرگرمیوں کا بخوبی علم ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بیانات دیئے اور قادیانیوں نے بھی حتی المقدور ان کی کردار کشی کی کوشش کی تو انہوں نے اسی زمانہ میں ان کے خلاف کیوں الگ سے مضامین نہ لکھے۔ انہوں نے دو سال بعد مئی 1935ء میں جب ظفر اللہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بن گئے تو سلسلہ مضامین شروع کیا۔ واضح رہے کہ ظفر اللہ کا باقاعدہ تقرر 26 مئی 1935ء کو ہوا اور علامہ اقبال کا پہلا مضمون مئی 1935ء کے دوسرے ہفتے میں شائع ہوا۔ قادیانی الزام لگاتے ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ احساس محرومی میں مبتلا ہو گئے کہ انہیں وائسرائے کونسل کا ممبر نہیں مقرر کیا گیا اور ظفر اللہ کونسل کے ممبر مقرر ہو گئے۔ (1)

یہ اعتراض ان کی کردار کشی کی مہم کا نمایاں حصہ ہے جس کو قادیانی اکثر اچھالتے رہتے ہیں۔ ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں اور اس سلسلے میں بعض حقائق پیش کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کا تصنیفی منصوبہ

علامہ اقبال 1933ء ہی میں قادیانیوں کے کردار پر لکھنے کا سوچ رہے تھے ان کے پیش نظر بعض تصانیف کی ترتیب و تالیف تھی لیکن وہ وجود میں نہ آسکیں۔ ان میں مقدمہ القرآن، اسلامی اصول فقہ، تاریخ تصوف وغیرہ شامل تھیں۔ (2) علامہ اقبال نے 1933ء میں ایک کتاب تصنیف کرنے کا منصوبہ بنایا جس کا نام Introduction to the Study of Islam تھا، جس کے

اہم موضوعات کا انہوں نے ایک خاکہ تیار کر لیا تھا۔ اس کو انہوں نے میاں محمد شفیع (م ش) کے حوالے کیا اور ان کو ہی کتاب کی ڈکٹیشن دینا چاہتے تھے۔ اس کے چند موضوع درج ذیل ہیں۔

اسلام میں مذہبی تحریکیں

☆ ابن تیمیہ

☆ عبدالوہاب

☆ بابی

☆ احمدیہ وغیرہ (پیش گوئیاں تمام کم و بیش مجوسی)

☆ سرسید کی عقلیت پسندی

☆ نئی تحریکیں

ایک آنے والا موعود مسیح وغیرہ (3)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قادیانیت کے موضوع پر لکھنا ان کے آئندہ کے پروگرام میں شامل تھا۔ علامہ اقبال وقت، فرصت اور حالات کے مطابق اس منصوبہ پر عمل کرتے۔ لیکن ایک تو وہ پنجاب اور ہندوستان کی سیاست کے دیگر مسائل میں بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ مثلاً انہوں نے پنجاب میں فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے ایک فارمولے پر غور و خوض کے بعد 14 جولائی 1933ء کو اس کے متعلق ایک بیان دیا۔ (4) ایسے ہی کمیونل ایوارڈ پر انہوں نے 19 جون 1934ء کو اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (5) یونی میٹ پارٹی کی سرگرمیوں اور مستقبل کے دستوری اور آئینی ڈھانچے پر بھی ان کی نظر تھی۔

جنوری 1934ء میں وہ بیمار ہو گئے ان کا گلا خراب ہو گیا انہوں نے مقامی اطباء سے علاج کرایا لیکن افاقہ نہ ہوا آخر کار جنوری 1935ء میں علاج کے لئے بھوپال گئے۔ ان کی زوجہ محترمہ بھی علیل تھیں جن کے علاج میں ان کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا تھا۔ علامہ اقبال پنجاب کی سماجی، معاشی اور مذہبی تحریکوں اور سیاسی اتار چڑھاؤ پر ہمیشہ گہری نظر رکھتے تھے ان دو سالوں

1933-35ء میں انہوں نے قادیانیوں کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں خصوصاً تحریک احرار کا مشاہدہ کیا اور ان کے دینی معتقدات کے خلاف چھپنے والے لٹریچر کا مطالعہ کیا جس کے نتیجے میں انہیں قادیانیت کے سیاسی اور مذہبی پہلوؤں سے زیادہ بہتر طور پر شناسائی حاصل ہوئی۔ اس ضمن میں ہم پہلے تحریک احرار کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔

تحریک احرار

1931-32ء میں علامہ اقبال نے احرار کے کردار کو تحریک کشمیر کے دوران دیکھا تھا۔ احرار قادیانیت کے خلاف تھے اور اسے برطانوی سامراج کی ایک ایجنسی قرار دیتے تھے۔ (6) وہ اشتراکی فکر رکھتے تھے اور سر فضل حسین اور ان کی یونینسٹ پارٹی کے مخالف تھے جو جاگیرداروں اور سرکار پرستوں کی نمائندہ تھی۔ 1934ء کے اوائل میں مجلس احرار کی قادیانیوں کے خلاف بھرپور تحریک جاری تھی۔ (7) قادیانی احرار کے خلاف جو ابی حملے کر رہے تھے۔ قادیانیوں کا ایک زمانہ سے پسندیدہ مشغلہ چلا آرہا تھا کہ وہ مسلمانوں کو مباحث میں الجھاتے، دور دراز دیہی علاقوں اور بڑے شہروں میں مناظروں کے پنڈال جماتے اور وسیع پیمانے پر قادیانی لٹریچر تقسیم کرتے تھے۔ یہ مباحثے اور مناظرے لا حاصل ہوتے تھے۔ قادیانیوں کا مقصد اسلام کے بنیادی عقیدے ختم نبوت سے مسلمانوں کا ایمان متزلزل کرنا، ان کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرنا اور ان کی توانائیاں ملتی استحکام اور سیاسی حقوق کی جدوجہد سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرانا تھا۔ پنجاب حکومت ان کی پشت پناہ تھی احرار نے قادیانیت کے خلاف عوامی سطح پر تحریک چلائی اور قادیان میں اپنا مرکز قائم کیا، انہوں نے مرزا محمود کے مخالف عناصر کی مدد سے قادیانیت کو لاکار۔ مولانا عنایت اللہ چشتی نے قادیان میں قدم جما کر قادیانیت کا شدید تعاقب کیا، ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ قادیانیت کو فرقہ وارانہ مسئلے کے طور پر دیکھتا تھا۔ عقیدہ ختم نبوت کے وسیع تر دینی، سیاسی اور تہذیبی مضمرات پر اس کی توجہ بہت کم تھی۔ احرار نے قادیانیت کے محاسبے کی تحریک کے دوران روایتی بحث کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی دہرایا کہ یہ تحریک ایک الگ نبوت کا پرچار کرتی

ہے اس لئے یہ ایک الگ مذہب ہے۔ قادیانیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کیا جائے اور انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ وہ قادیانیوں کو برطانوی امپریلزم کے دست و بازو کہتے تھے اور اس بات پر زور دیتے کہ قادیانیوں سے ان کی جنگ مذہبی ہی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہے۔ (8)

21 اکتوبر 1934ء کو مجلس احرار نے قادیان کے قریب رجادہ میں ایک تبلیغی کانفرنس منعقد کی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے قادیانیت پر سخت تنقید کی انہوں نے قادیانیوں کو برطانوی سامراج کے دم بریدہ کتے کہا جو انگریز کے بوٹ چاٹنے کو فخر سمجھتے ہیں۔ (9) کانفرنس میں ایک قرارداد ظفر اللہ کو واسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر نامزد کرنے خلاف منظور کی گئی۔

سرفضل حسین نے 27 اکتوبر 1934ء کو گورنر پنجاب ایمرسن کو خط لکھا کہ ان کی موجودہ پالیسی کے تحت احرار کی حوصلہ افزائی اور احمدیوں کی حوصلہ شکنی ہو رہی ہے، دشمن مضبوط ہو رہے ہیں دوست کمزور ہو رہے ہیں، مناسب پالیسی یہ ہے کہ احرار کی احمدیوں کے خلاف جارحیت سے سختی سے نمٹا جائے اور اس کا خاتمہ کیا جائے پھر احمدیوں سے گفت و شنید کی جائے۔ (10)

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو احرار کانفرنس میں تقریر کرنے کے جرم میں چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔ اپیل میں بے ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور نے وہ تاریخی فیصلہ سنایا جس نے مرزا غلام احمد کی شخصیت، مرزا محمود کے سیاسی عزائم، قادیان میں متوازی حکومت کی موجودگی اور مخالفین پر ڈھائے جانے والے مظالم کو آشکار کر دیا۔ یہ فیصلہ جون 1935ء میں منظر عام پر آیا۔ مجلس احرار نے اس کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی۔ قادیانیوں نے اس کے خلاف اپیل کی اور سر جج بہادر سپرو کو وکیل مقرر کیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے جج کولڈ سٹریم نے اس فیصلے کے بعض حصے حذف کر دیے۔ (11) لیکن مسلمانوں کے ذہن پر اس کا بہت اثر ہوا۔

قادیانیوں کی سیاسی پالیسی

کشمیر کمیٹی کے خاتمے اور احرار کی تحریک کے زمانے (1934) میں قادیانیوں کی سیاسی روش کا جاننا ضروری ہے۔

احرار کی تحریک کے دوران مرزا محمود نے حکومت پنجاب کو اپنی سابقہ سیاسی خدمات یاد دلانیں تاکہ حکومت احرار جیسی انگریز مخالف تحریک کو کچل دے۔ انہوں نے کہا کہ گذشتہ پچاس سالوں میں انہوں نے تقسیم بنگال، کانپور مسجد ایجنسی ٹیشن اور جنگ عظیم اول 18-1914ء کے دوران حکومت کی تائید کی نیز رولٹ ایکٹ کے خلاف ہنگاموں، تحریک خلافت، ہجرت، سول نافرمانی، بنگال میر رازم، عدم تعاون کی کانگریسی تحریکات غرضیکہ ہر حکومت مخالف تحریک کو ناکام بنایا اور انگریزی حکومت کے ساتھ اپنی لازوال اور غیر متزلزل وفاداری کا عملی ثبوت فراہم کیا۔ ان خدمات کے صلے میں جماعت نے اتنے تمغے حاصل کئے کہ ان سے کئی ٹوکریاں بھری جاسکتی ہیں۔ ان خدمات ہی کا نتیجہ تھا کہ 1935ء میں انڈین کانگریس کے سکرٹری سید محمود جب ان (مرزا محمود) سے ملے تو انہیں بتایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو جب یورپ کے دورے سے لوٹے تو انہوں نے پہلی بات یہ کہی کہ ہندوستان میں جب تک احمدیہ جماعت کو کمزور نہ کیا جائے اس وقت تک برطانوی حکومت زوال پذیر نہیں ہو سکتی۔ مرزا محمود کہتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر شخص احمدی جماعت کو انگریزوں کی نمائندہ اور ان کی ایجنٹ سمجھتا تھا۔ (12)

اخبار پیغام صلح لاہور نے قادیان کی سیاسی پالیسی پر ایک عمدہ تبصرہ کیا۔ اخبار لکھتا ہے قادیانی محمودی لوگ مذہب کے نام پر سیاست میں حصہ لینا ضروری سمجھتے ہیں گورنمنٹ میں اثر و رسوخ بڑھا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنا چاہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس طریق سے بہت سے دنیوی عز و جاہ کے طالب اور ملازمت کے خواہاں خود بخود ہماری طرف کھینچے چلے آئیں گے۔ اس طرح ہمارا جھتا زبردست ہو جائے گا جس سے گورنمنٹ پر مزید اثر پڑے گا اور ہماری آمدنی بھی بڑھے گی اور ریاست کی بنیاد بھی پڑ جائے گی اس لئے وہ گورنمنٹ کے مرکزی دفاتر کا طواف کرنا اور سیاسی کاموں میں ظاہر اور خفیہ طور پر گورنمنٹ کے دست و بازو بننا اپنا شعار بناتے ہیں اور اس کے بدلے میں گورنمنٹ میں رسوخ بڑھانا اور نفع اٹھانا ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے لیے مذہب کے نام پر لاکھوں روپیہ قوم سے لے کر خفیہ سیاسی کاروائیوں میں صرف کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ چونکہ ان کے عقائد ہی ایسے باطل ہیں کہ کسی عقل مند کو اپیل نہیں کر سکتے اس لئے سیاسی

رنگ میں جھٹے بندی کے سوا ان کا مقصد کسی اور طریق سے حاصل ہونا انہیں مشکل نظر آتا ہے بدیں وجہ وہ سیاسی میدان میں کارنمایاں دکھا کر اپنا جتھا بڑھانے کا کام کرتے رہتے ہیں۔ (13)

قادیانیت کے بارے میں ایسے حقائق مسلسل منظر عام پر آ رہے تھے اور ذی شعور مسلمان رہنماؤں کو قادیانی سیاست کی بوالعجیوں پر غور کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ علامہ اقبال بھی ان سے آگاہی رکھتے تھے اور کسی مناسب موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ وہ پنجاب میں مسلم مفادات کے تناظر میں قادیانیوں کی سیاسی حکمت عملی کا مطالعہ کر رہے تھے جو یونینسٹ پارٹی کے حلیف اور سر فضل حسین کے حامی تھے جبکہ علامہ اقبال ان کے خلاف تھے۔

آل انڈیا نیشنل لیگ:

جنوری 1935ء میں مرزا محمود نے ایک نیم سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل لیگ قائم کی اس کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں تھا اور بشیر احمد ایڈوکیٹ اس کے پہلے صدر تھے۔ اس کے ساتھ نیم فوجی دستے احمدیہ کورز منسلک کئے جس کا پہلا کمانڈر ظفر اللہ کا بھائی اسد اللہ تھا۔ یہ تنظیم قادیان کی سیاسی پالیسی اور اس کے نظریات کی ترجمان تھی۔

مولانا ظفر علی خاں اور زمیندار

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی کتاب مولانا ظفر علی خاں: حیات، خدمات و آثار، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 1993ء میں رقمطراز ہیں۔

1935ء میں اقبال نے قادیانیت کے خلاف لکھا۔ اقبال کے اس تغیر کو اقبالی مصنف عام طور پر کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کے کردار کے مشاہدے سے منسوب کرتے ہیں۔ فوری رد عمل کے لحاظ سے یہ بات ایک حد تک مانی جاسکتی ہے مگر اس ذہنی تبدیلی میں ظفر علی خاں کی تحریک کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال پر ظفر علی خاں کے اثرات کی یہ بات شاید بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ اقبال اور ظفر علی خاں کے تعلقات 1910ء سے آخر دم تک ذاتی سطح پر سوائے سائنس کمیشن کے موقع پر جزوی اختلافات کے، بڑے گہرے رہے۔ ان کے مزاجوں میں کچھ فرق تھا اور یہ قدرتی

امر ہے مگر مقاصد ملی میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ دونوں صاحبان ایک دوسرے کی قدر پہنچانتے تھے اور ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے۔ زمیندار اور ستارہ صبح میں اقبال کا کلام چھپتا تھا اور اقبال ان جریدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے تھے۔ پھر وہ ان مباحث سے کیسے بے خبر رہ سکتے تھے جو ظفر علی خاں نے قادیانی نبوت کے بارے میں ستارہ صبح اور زمیندار میں اٹھا کر عالم اسلام میں ایک تحریک پیدا کی ص: 466

22 نومبر 1934ء کو مولانا ظفر علی خاں نے قیصر ہند شاہ برطانیہ اور ان کے توسط سے پوری مسیحی دنیا کے نام اردو اور انگریزی میں ایک کھلا خط شائع کیا جس پر زمیندار کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اس پر انہوں نے ایک ادارہ زمیندار کا نیا امتحان لکھا جس میں ظفر اللہ کے تقرر کو منسوخ کرنے اور قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

پروفیسر ذوالفقار لکھتے ہیں: ”اس زمانے میں جسٹس مرزا سر ظفر علی نے بھی قادیانیوں کو از روئے شریعت دائرہ اسلام سے خارج سمجھ کر حکومت سے انہیں جداگانہ جماعت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اس طرح یہ تحریک مسلم عوام اور جدید تعلیم یافتہ اہل فکر و نظر سب کی اجتماعی تحریک بن گئی۔“ ص: 501

قادیانیت کے خلاف کتابیں اور مضامین

1933-35ء میں قادیانیوں کے خلاف کئی عمدہ کتب منظر عام پر آئیں جن سے اس تحریک پر پڑے پردے اٹھتے چلے گئے اور یہ مسئلہ سنجیدہ مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ان کتب اور مضامین میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سید حبیب کی ’تحریک قادیان‘ 1933ء

سید حبیب مدیر اخبار سیاست لاہور نے تحریک قادیان کے نام سے اپریل، اگست 1933ء میں قادیانیت کے خلاف تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جو نہایت مقبول ہوا۔ الفضل قادیان نے جوابی مضامین لکھے۔ لاہور جماعت کے اخبار پیغام صلح نے ان اعتراضات کا جواب دیا جو دسمبر

1933ء میں آئینہ احمدیت کے نام سے شائع کیا گیا۔ (14)

مرزا ظفر علی کے مضامین 1934-35ء

1934-35ء میں مرزا ظفر علی ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ لاہور نے قادیانیت کے خلاف بعض عمدہ

مضامین لکھے اور انہیں مسلمانوں سے علیحدہ قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ (15)

کے ایل گابا کا مطالبہ 1935ء

ممتاز قانون داں خاند لطف گابا نے جماعت احمدیہ کو اسلام سے خارج کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اخبارات میں ایک مضمون شائع کرایا جس میں کہا کہ مسئلہ خلافت کے بعد مرزائیت ایسا مسئلہ جس نے مسلمانان ہند کو اتنا مشتعل کیا ہے جیسے کہ وہ آج کل ہیں اس لئے انہیں مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے۔ (16)

مقدمہ بہاولپور کا فیصلہ 1935ء

فروری 1935ء میں مقدمہ بہاولپور کا فیصلہ شائع ہو گیا جو قادیانیوں کے خلاف تھا۔ محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج بہاولپور نے قادیانیوں کو ان کے عقائد کی بناء پر غیر مسلم قرار دیا۔ مقدمے کے دوران مسلمانوں کی طرف سے منشی محمد شفیع، مولانا انور شاہ کا شمیر، مولانا مرتضیٰ حسن اور قادیانیوں کی طرف سے جلال الدین شمس اور غلام احمد بدو ملہی پیش ہوئے۔ مقدمہ کی پوری کاروائی چھپ چکی ہے۔ اس فیصلے کا ہندوستان کے طول و عرض میں بڑا چرچا ہوا۔ (17)

پروفیسر الیاس برنی کی 'قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ'

مولانا محمد الیاس برنی، پروفیسر معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے قادیانی تحریروں کے اقتباسات کو عمدہ طریقے سے جمع کر کے قادیانیوں کو ان کے عقائد اور تحریک کے خدوخال کا ایک آئینہ دکھایا۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کا ایک منفرد انداز تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن

1352ھ (1933ء) کے آخر میں منظر عام پر آیا اگلے سال دوسرا ایڈیشن طبع ہوا۔ یہ کتاب علامہ اقبال کو بھی ارسال کی گئی۔ انہوں نے مولانا الیاس برنی کو ایک خط لکھا جس کا ذکر مولانا نے کتاب قادیانی مذہب کے چوتھے ایڈیشن کے دیباچے (1354ھ 1935ء) میں کیا ہے۔ مولانا برنی کہتے ہیں:

”آج علماء سے بڑھ کر قومی لیڈر اس کتاب کی اہمیت محسوس کرتے ہیں من جملہ اکابر ملت سر محمد اقبال نے دوسرے ایڈیشن پر رائے دی ہے کہ یہ کتاب ملک میں وسیع پیمانے پر شائع ہونے کے قابل ہے۔“ (18)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اس کتاب کی افادیت کے معترف تھے۔ کتاب کی تعریف میں ان کے اور خطوط بھی مولانا برنی کے نام ہیں۔ جسٹس (ر) عطاء اللہ سجاد ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے 1934ء میں اپنی بیماری کے دوران اس کتاب کا مطالعہ کیا اور پھر اصل قادیانی کتب منگوا کر پڑھیں۔ اس کے بعد انہوں نے تحریک احمدیت کے متعلق حتمی رائے قائم کی۔ (18-A)

علامہ اقبال نے مولانا الیاس برنی کو 27 مئی 1937ء کو ایک خط لکھا جس میں مسئلہ بروز پر تحقیق کی ضرورت بیان کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس تحقیق سے قادیانیت کے خاتمہ میں مدد مل سکتی ہے۔ (19) اسی قسم کا ایک خط انہوں نے سید سلیمان ندوی کو 17 اگست 1936ء کو لکھا اور بروز کے متعلق سوال کیا کہ صوفیا کی کتب میں یہ بحث کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔ (20)

’ہزہ ولی نس‘

1935ء میں مرزا محمود کی شخصیت اور قادیانیت کے خلاف انگریزی زبان میں لاہور سے ایک نہایت عمدہ کتاب ہزہ ولی نس شائع ہوئی۔ (21) اس کا پیش لفظ مولانا ظفر علی خان نے لکھا۔ اس کے مصنف نے بعض وجوہ کی بناء پر اپنا قلمی نام فونکس Phoenix استعمال کیا۔ پیش لفظ میں مولانا ظفر علی نے لکھا کہ قادیانیت بہائیت کا چرہ ہے جو غلطیاں باب اور بہاء اللہ نے کیں اور اسلام سے

الگ ہو گئے، مرزا غلام احمد نے ان کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالا۔

فاضل مصنف فونکس نے دیباچے میں پروفیسر الیاس برنی کی کتاب قادیانی مذہب سے استفادہ کرنے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ مصنف نے ڈاکٹر اقبال کی بھی تعریف کی اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اس کتاب کو دیکھا اور اس کے آخری باب کو سنا۔ یہ باب مرزا صاحب کی ابتدائی زندگی، دعاوی ان کے اوہام والہام، ذہنی و جسمانی عوارض، پیش گوئیوں، شخصیت کے تضادات، مضحکہ خیز تاویلات وغیرہ پر مشتمل ہے شاید اسی لئے علامہ نے اپنے ایک مضمون میں مرزا صاحب کے الہامات کی روشنی میں ان کے نفسیاتی تجزیے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس وقت مرزا صاحب کے الہامات کا ایک مجموعہ موجود تھا جو بابو منظور الہی (22) نے بشریٰ کے نام سے دوحصوں میں 1913ء میں مرتب کیا تھا۔ یہ بہت مختصر تھا بعد میں قادیانیوں نے تذکرہ کے نام سے مرزا صاحب کے تمام کشف و الہامات شائع کر دیئے۔

فاضل مصنف فونکس دیباچے میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی ہدایت پر اس کتاب میں ایک باب غلام احمد قادیانی اور بہاء اللہ کی تحریکوں میں مماثلت پر شامل کیا گیا ہے جس کا عنوان قادیان اور عکہ ہے، اس میں احمدیت اور بہائیت کا تقابل کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے 1935ء میں قادیانیت کو بہائیت کا چربہ قرار دیا تھا۔ (23)

ہمیں یقین ہے کہ 1934ء اور وسط 1935ء تک کی تمام قادیانیت مخالف تحریکیں اور قادیانیت پر لکھی گئی اہم کتب علامہ اقبال کے پیش نظر رہی ہوں گی۔ انہوں نے قادیانیت کے خلاف اپنی نفرت اور بیزاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا

”ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت، بانی ﷺ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا تھا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آں حضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ (24)

کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کے کردار کے عملی مشاہدے اور ان کے خلاف جاری تحریکات اور قادیانی مذہب و سیاست کو آشکار کرنے والے مواد نے ان کے فکری ارتقاء کو ایک جہت عطا کی۔ ان دو سالوں 1933-34ء میں وہ Receiving End پر رہے اور جب ان کی فکر اور رائے پختہ ہو گئی تو وہ حقائق سامنے لے آئے۔

یہ ایک مختصر پس منظر تھا، اب ہم اس کا پیش منظر بیان کرتے ہیں اور ان محرکات کا ذکر کرتے ہیں جن کے باعث علامہ اقبال نے قادیانیت کی خلاف کھل کر مضامین لکھے۔

علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف مضامین کیوں لکھے؟۔ فوری محرکات

علامہ اقبال کے مئی 1935ء کے بیان کے بعض فوری محرکات بھی تھے جن کی وقتاً فوقتاً نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ شیخ بشیر احمد قادیانی ایڈووکیٹ صدر نیشنل لیگ اس کی وجہ پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کے بیان کو قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

’علامہ اقبال کی طرف سے جو بیان احمدیت کے خلاف شائع ہوا اس کے متعلق ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی طرف سے اس کا جواب پیش کیا جائے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ یہ بحث ہر ایکسی لینسی گورنر بہادر کی مسلمانان پنجاب کو نہایت دانشمندانہ نصیحت پر شروع ہوئی جو مختلف فرقوں کے سیاسی و ملکی اتحاد کے متعلق تھی کیونکہ ایسے اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ مختلف مسلمان جماعتیں باہمی تنازعات کو نظر انداز کر کے اپنی قوی عمارت کی بنیاد اس عقیدت پر رکھیں جو اسلام کے ساتھ ہے۔‘ (25)

علامہ اقبال نے بھی اپنے مضمون ’قادیانی اور جمہور مسلمان‘ میں گورنر پنجاب کے بیان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’ہندوستان کے مذہبی مدعیوں کی حوصلہ افزائی سے لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگے ہیں اور ہندوستانی دماغ مذہب کی جگہ اور بدلے میں روس کی دہری مادیت کی ملتی جلتی شکل پیدا کر دے گا۔ لیکن پنجابی مسلمانوں کی پریشانی کا باعث محض مذہبی سوال نہیں ہے۔ کچھ جھگڑے سیاسی بھی ہیں جن

کی طرف سر ہر برٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے یہ اگرچہ خالص سیاسی جھگڑے ہیں لیکن ان کی اہمیت مذہبی سوال سے کسی طرح کم نہیں۔ جہاں مجھے حکومت کا شکریہ ادا کرنا ہے اسے پنجابی مسلمانوں کی وحدت کا احساس ہے وہاں میں حکومت کو اپنے احتساب کا مشورہ دوں گا میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ شہری۔ دیہاتی مسلمان کی تمیز کے لئے کون ذمہ دار ہے جس کی بدولت مسلمان جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے جو ہر دم آپس میں برسر پیکار ہیں (یونینسٹ پارٹی اور سر فضل حسین کی طرف اشارہ ہے۔ مصنف) سر ہر برٹ پنجابی مسلمانوں کی صحیح قیادت کی عدم موجودگی کا گلہ کرتے ہیں لیکن شہری۔ دیہاتی تمیز کو حکومت خود غرض اور سیاسی حیلہ بازوں کے ذریعے برقرار رکھے ہوئے ہے اور یہ حربہ صحیح رہنما کے پیدا ہونے سے روکنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ سر ہر برٹ ایمرسن صحیح رہنما کی عدم موجودگی کا رونا روتے ہیں اور میں اس نظام کا رونا روتا ہوں جس نے ایسے رہنما کی پیدائش کو ناممکن بنا دیا ہے (26)

احراری۔ قادیانی نزاع

جماعت احمدیہ لاہور کے ایک ممتاز مناظر اختر حسین گیلانی نے 1944ء میں اقبال اور تحریک احمدیت نامی کتاب میں ان مضامین کی وجہ احراری۔ قادیانی نزاع بتائی ہے، فرماتے ہیں۔

(i) 1935 میں احراری۔ قادیانی نزاع کے باعث مخالفت کا جو طوفان پھا ہوا، وہ عوام سے ہاتھ کر بہت سے خواص کو بھی اپنی رو میں لپیٹ کر لے گیا۔ یہ وہ دور ہے جس میں ہمیں علامہ اقبال 'اسلام اور قادیان ازم، اور اسلام اور احمد ازم، کے نام سے بیانات شائع کرتے نظر آتے ہیں اور یہی وہ زمانہ ہے جس کے بعد اقبال کے کلام میں تحریک احمدیت کے متعلق طنزیہ اشعار کا وجود نظر آتا ہے کہیں تو علامہ اقبال حضرت مجدد (مرزا غلام احمد) کو 'مجوسی' کا نام دیتے ہیں کہیں 'یہودی آریائی' تصوف کا حامل قرار دیتے ہیں اور کہیں 'مذہبی چلتا پرزہ' نام رکھتے ہیں۔

(ii) تحریک احمدیت کے متعلق آپ کے آخری بیانات درحقیقت کسی عرصہ دراز کی محققانہ کاوش کا

نتیجہ نہ تھے بلکہ اس ہنگامہ سے اثر پذیری کا نتیجہ تھے جو مرزا محمود احمد صاحب کی عنایت سے ”احرارى۔ قادیانى“ نزاع کے نام سے مشہور ہوا تھا علامہ اقبال کے ایک نیاز مند، جناب سید نذیر نیازی علامہ اقبال کی آخری علالت پر مضمون لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”قادیانى۔ احرارى نزاع سے متاثر ہو کر حضرت علامہ جن خیالات کا اظہار و تقابلاً کر چکے تھے اب انہیں کا تقاضا تھا کہ ایک مفصل بیان اس قضیے کے متعلق شائع کریں۔“ رسالہ اردو اقبال نمبر 1938ء انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن ص 312 (27)

قادیانى مبلغ کا خیال

لیون پسنر نے اپنی کتاب احمدیہ مومنٹ (1974)ء کی تالیف کے دوران نیو یارک میں قادیانى مبلغ خلیل ناصر سے 25 جنوری 1970ء کو انٹرویو کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ تمام محرکات جو علامہ اقبال کے قادیانیوں کے خلاف مضامین لکھنے کا باعث بنے ان کا پتہ لگانا مشکل ہے لیکن خلیل ناصر کا نظریہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی جماعت احمدیہ کے خلاف پہلی واضح تنقید کشمیر کمیٹی سے ان کے استعفیٰ کے وقت (20 جون 1933ء۔ مصنف) سامنے آئی۔ اقبال جب کشمیر کمیٹی سے وابستہ تھے اس وقت وہ عام زندگی سے ریٹائر ہو چکے تھے ان کی وکالت نہ چلتی تھی اب وہ بحیثیت شاعر اپنی شہرت و ناموری قائم رکھنا چاہتے تھے۔

جب مرزا محمود نے کمیٹی سے استعفیٰ دیا اور علامہ اقبال صدر بن گئے تو اس کمیٹی کی موجودگی کے باوجود مرزا محمود نے پرانی کمیٹی کے برقرار ہونے کا اعلان کیا اور بعض ممبروں کی مدد سے انکا ایک اجلاس بلا کر کمیٹی قائم کرنے کی کوشش کی تو علامہ اقبال نے ان اقدامات سے محسوس کیا کہ ایک تو قادیانى ان کی صدارت اور کمیٹی کے دیانتدار نہ کام کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں دوسرے اب وہ کھل کر ان کے خلاف ہو گئے ہیں اس لئے انہوں نے بعد میں یہ مضامین لکھ کر اس مخالفت کا جواب دیا۔ پسنر کہتا ہے کہ خلیل ناصر کا یہ نظریہ اس مسئلے پر نئی روشنی ڈالتا ہے ساتھ ہی وہ علامہ اقبال کا وہ بیان نقل کرتا ہے جس میں انہوں نے خود کہا تھا کہ ذاتی طور پر انہیں اس تحریک سے اچھے نتائج کی

امید تھی لیکن جب انہوں نے خود ایک قادیانی کو نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کے خلاف نازیبا کلمات کہتے سنا تو وہ اس تحریک کے سخت خلاف ہو گئے۔ (28)

ریویو آف ریلیجنز کا تبصرہ

علامہ اقبال کے مضامین پر ریویو آف ریلیجنز قادیان بابت ماہ جون 1935ء میں جو تبصرہ شائع ہوا اس میں کہا گیا:

ڈاکٹر اقبال مولویوں کے اس مخصوص طبقے سے ملے ہوئے ہیں جن کو تیسرے درجے کے چند سیاست دانوں اور بدنامی مول لینے کے خوگر عناصر کی مدد اور تائید حاصل ہے اس کے بعد فکر سے عاری اور دلائل سے تہی طبقے ہیں جو ان کے ساتھ مل گئے ہیں اس لئے وہ نہایت جھوٹا اور احمدیوں کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ ریویو ان مضامین کا ایک محرک یہ بتاتا ہے کہ ظفر اللہ نے دوسری گول میز کانفرنس میں جو کردار ادا کیا اس پر انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا، اس نے ڈاکٹر اقبال کے دل میں مخالفت، حسد اور رقابت پیدا کر دی۔

ریویو کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے سیاسی وجوہات کی بناء پر یہ مضامین لکھے وہ مسلمانوں کے سیاسی رہنما بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ (29)

سرفظر اللہ کا موقف

سرفظر اللہ نے منیر احمد منیر ایڈیٹر پندرہ روزہ آتش فشاں لاہور کو ایک طویل انٹرویو دیا جو مئی 1981ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ وہ علامہ اقبال کے ایک قریبی دوست چوہدری محمد حسین کو ان مضامین کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جو پنجاب پریس برانچ میں کام کرتے تھے۔ اس انٹرویو کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔

منیر احمد منیر: کیا علامہ اقبال صاحب بھی کسی زمانے میں احمدی رہے؟

ظفر اللہ: نہیں

س: ایک کتابچہ ان کا لکھا ہوا ہے آپ کے عقیدے کے متعلق ٹریڈز آف اسلام انگریزی زبان میں!
 ج: آخر میں ان پر زیادہ اثر ان کے حاشیہ نشینوں کا ہو گیا تھا جن میں زیادہ ان کے پاس بیٹھے
 والے اور انہیں ان امور پر اکسانے والے تھے چوہدری محمد حسین پہاڑنگی، پہاڑنگ ضلع سیالکوٹ میں
 ایک گاؤں ہے وہاں کے تھے وہ اس سلسلے کے بڑے سخت مخالف تھے۔ ان کے ساتھ ایک دو اور
 آدمی تھے لیکن شروع شروع میں ڈاکٹر صاحب کی بانی سلسلہ جماعت کے متعلق رائے بڑی اچھی
 تھی۔ شاید علی گڑھ میں تقریر کی تھی کہ اگر اس زمانے میں ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ دیکھنا ہو تو احمدیہ
 جماعت کو دیکھو۔ سعد اللہ لدھیانوی بانی سلسلہ کے سخت مخالف تھے اس پر ڈاکٹر صاحب نے نظم لکھی،
 اسے کندم کیا، اس وقت ڈاکٹر صاحب کالج میں پڑھتے تھے۔ (30)

سر ظفر اللہ کو باقی قادیانیوں کی طرح گلہ ہے کہ پہلے علامہ اقبال احمدیت کے متعلق اچھی رائے
 رکھتے تھے بعد میں مخالف ہو گئے حالانکہ خود اس بات کی ذمہ دار قادیانی منافقت ہے۔ اگر شکایت
 کریں تو مسلمان کر سکتے ہیں کہ ان کے حسن ظن اور حسن سلوک سے کس درجہ ناجائز فائدہ اٹھایا گیا اور
 در پردہ ان کے دین و ملت کی بیخ کنی کی گئی اور اوپر سے سینہ زوری کہ ان سے الٹی شکایت ہو رہی
 ہے۔

سر ظفر اللہ نے اپنے ایک دوسرے انٹرویو میں جو مد بیعت روزہ لاہور لاہور کو دیا فرمایا۔
 ثاقب زیروی۔ علامہ اقبال کا جماعت احمدیہ کے متعلق منفی رویہ کس طرح شروع ہوا۔ ٹرننگ
 پوائنٹ کیا تھا؟

حضرت چوہدری صاحب: میرا خیال ہے کہ جب احرار نے شور مچانا شروع کیا کہ کشمیر کمیٹی کو
 اس کے صدر نے اپنی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہوا ہے اس سے یہ روش شروع ہوئی ورنہ جب حضرت صاحب
 نے پہلی میٹنگ میں ہی یہ کہا تھا کہ مجھے صدر نہ بناؤ تو ڈاکٹر اقبال نے اصرار سے یہ کہا تھا کہ مرزا
 صاحب ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کو حقوق ملیں اور ہمارے کرنے سے تو کچھ ہونا نہیں۔ حضرت
 صاحب نے فرمایا جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے وہ تو ہمارا فرض ہے ہم کو یہ حقوق دلانے کی

پوری کوشش کرنی چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ پھر آپ صدارت سنبھالیں۔ آپ کے پاس تنظیم ہے، افراد ہیں۔ اس طرح سے اقبال نے اصرار کر کے آپ کو بنوایا پھر جب ایک سال مکمل ہو گیا تو حضرت صاحب نے کہا کہ اب کام اچھا ہو گیا ہے اب کسی اور کو مقرر کیا جائے تو پھر اقبال نے اصرار کر کے آپ کو دوبارہ مقرر کروایا۔ اس وقت تک تو ان کی طرف سے کوئی مخالفت نہیں ہوئی اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رویہ بدل گیا۔ یہ تو ہے ایک بات۔

دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر اقبال اپنے بھولیوں سے بڑا اثر قبول کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں ایک صاحب چوہدری محمد حسین پہاڑنگی تھے۔ جماعت احمدیہ کے مخالف تھے دوسرے رانا محمد احسن یا محمد حسن۔

ایک دفعہ جب کہ ابھی کشمیر کمیٹی نہیں بنی تھی تو حضرت صاحب لاہور تشریف لائے۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر اقبال بیمار ہیں ان کو کوئی سخت درد وغیرہ تھی۔ حضرت صاحب نے کہا چلو عیادت کے واسطے چلیں۔ ان کے کمرے میں گئے۔ ان کا گھر کا لباس بنیان اور تہہ ہی ہوتا تھا باہر جانے کے لئے سوٹ وغیرہ پہنتے تھے۔ تو وہ اسی لباس میں تھے۔ ان کو بیماری کی تکلیف بہت تھی وہ ملاقات میں سارا وقت یہی کہتے رہے مرزا صاحب میرے لئے دعا کرنا، مرزا صاحب میرے لئے دعا کرنا، مرزا صاحب میرے لئے دعا کرنا۔ تو جو شخص کسی کو کافر سمجھتا ہو اس کو دعا کے لئے تو نہیں کہتا۔ (31)

ڈاکٹر جاوید اقبال کا تجزیہ

ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں:

کشمیر کمیٹی سے جب اقبال مایوس ہوئے تو ممکن ہے احراریوں نے ان سے مفاہمت کرنے کی کوشش کی ہو کیونکہ ان کی جماعت احمدیہ سے پرانی عداوت تھی لیکن علامہ اقبال اور احرار کے نظریات میں ہمیشہ فرق رہا احرار جمعیت العلمائے ہند کی طرح نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت اور کانگریس کی ہمنوا تھی۔ وہ کبھی پارلیمانی سیاسی جماعت نہ بن سکی۔ علامہ اقبال احرار اور اتحاد ملت کا مسلم لیگ سے اتحاد کرنا انہیں یونینسٹ پارٹی کے مقابلے پر لانا چاہتے تھے۔

وہ مزید کہتے ہیں:

علامہ اقبال کے قادیनों کے خلاف مضامین کا پس منظر سمجھنے کے لئے تین چار امور ذہن میں رکھنے ضروری ہیں جنہوں نے مستقبل میں پنجاب کی مسلم سیاست پر اثر انداز ہونا تھا یہ امور تھے کمیونل ایوارڈ، 1934ء میں محمد علی جناح کے ہاتھوں مسلم لیگ کا احیاء، 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی خود مختاری کا مسئلہ، سر فضل حسین کا یونینسٹ پارٹی کا پروگرام اور پنجاب میں مسلم اکثریت کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں درپیش خطرات۔ ان امور کے پس منظر میں محمد علی جناح، اقبال اور پنجاب کے دیگر مسلم لیگی رہنماؤں، احراریوں، یونینسٹوں اور احمدیوں کے سیاسی عزائم نے 1935ء تک جو شکل اختیار کی ان کی روشنی میں اقبال کے تحریک احمدیہ کے خلاف بیانات کو پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ (32)

یہ بات قابل غور ہے کہ پنجاب میں نہایت قلیل اکثریت کے باعث مسلمان الگ وزارت تشکیل نہ دے سکتے تھے جب تک ہندوؤں اور سکھوں کو ساتھ نہ ملائیں۔ علامہ اقبال کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر احمدیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا (1935ء میں ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی تعداد 56 ہزار سے زائد ہو گئی ہے اور لوگ تیزی سے بیعت کر رہے ہیں۔ مرزا محمود نے ہر قادیانی کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے کم از کم ایک آدمی کو قادیانی بنا کر جماعت کی تعداد میں اضافہ کرے) تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں وہ انگریزی حکومت کے ایماء پر یا یونی نیٹ پارٹی کے اثر و رسوخ کے ذریعے مسلمانوں کی معمولی اکثریت کو صوبائی اسمبلی میں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ ان کا یہ خدشہ بعد کے سیاسی حالات اور قادیانیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ نہ ہونے کی وجہ سے درست ثابت نہ ہوا، لیکن یہ بلا جواز نہ تھا۔

اس پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ 1934-33ء کی مذہبی تحریکات، قادیانیت کے خلاف شائع ہونے والے لٹریچر اور نئے سیاسی تقاضوں اور خطرات خصوصاً پنجاب میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے سوال کے پیش نظر علامہ نے یہ مضامین لکھے۔

حوالے و حواشی

- (1) شیخ اعجاز احمد، مظلوم اقبال، ص: 184
- (2) B.A Dar, Letters and Writings of Iqbal, Iqbal Academy, Lahore, P. 93
- (3) علامہ اقبال: حیات، فکرو فن۔ مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر مقالہ اقبال کی موعودہ تصانیف از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ص: 219 تا 231
- (4) حرف اقبال، ص: 198
- (5) حرف اقبال، ص: 174
- (6) چوہدری افضل حق، تاریخ احرار ملتان، 1968ء، ص: 180
- (7) ایضاً
- (8) تاریخ احمدیت، جلد ہفتم، ص: 501
- (9) Y.B. Mathur, Growth of Muslim Politics in India, Lahore. p.109
- (10) سرفضل حسین کے خطوط، ص: 385
- (11) الفضل قادیان، 25-27 مارچ 1936ء
- (12) ملخص خطبہ محمود احمد، الفضل قادیان، 6 اگست 1935ء
- (13) پیغام صلح لاہور، 5 دسمبر 1935ء
- (14) دوست محمد، آئینہ احمدیت، حصہ اول و دوم، انجمن احمدیہ لاہور، دسمبر 1933ء
- (15) الفضل قادیان، 3 مئی 1935ء قادیانیوں نے مرزا ظفر علی پر جو سب و شتم کیا اس پر مولانا ظفر علی خان کی ایک نظم وفاداران مادر زاد (ارمغان قادیان ص، 61-63) قابل ذکر ہے۔
- (16) الفضل، قادیان، 30 مئی، 1935ء
- (17) روداد مقدمہ بہاولپور، اسلامک فاؤنڈیشن لاہور
- (18) قادیانی مذہب، ص 34 مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان کا ایڈیشن
- (18-A) روزنامہ نوائے وقت 21 اپریل 1999ء
- (19) اقبال نامہ حصہ اول، ص: 419

- (20) بشیر احمد ڈار، اقبال اور احمدیت، ص: 25
- (21) Phoenix, His Holiness, The Islamic Literature Publishing House, Lahore, 1935
- (22) لاہوری جماعت میں شامل ہو گئے۔ مجموعہ الہامات وحی 'البشری' 1913ء میں شائع ہوا۔
- (23) علامہ اقبال کے ریماکس۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، تصانیف اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ، ص: 449
- (24) حرف اقبال، ص: 112
- (25) شیخ بشیر احمد ایڈوکیٹ کا مضمون اصلاح و ارتقاء کے مقابلے میں دقیانوسیت پر اصرار، احمدیت کے خلاف ڈاکٹر اقبال کا بیان۔ الفضل قادیان، 5 جون 1935ء
- (26) حرف اقبال، ص: 108
- (27) اختر حسین گیلانی، اقبال اور تحریک احمدیت، احمدیہ انجمن لاہور، 1944ء، ص: 13
- (28) Lavan Spencer, Ahmadyyah Movement, Delhi, 1974, p. 184
- (29) Review of Religions, Qadian, June 1935 (Dr. Iqbal and the Ahmadyyah Community)
- (30) پندرہ روزہ آتش فشاں، لاہور، مئی 1981ء، ص: 34
- (31) ماہنامہ انصار اللہ ربوہ، نومبر، دسمبر 1985ء، ص: 102
- (32) زندہ رود حصہ سوم، ص: 589

کیا علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف اس لئے مضامین لکھے کہ وہ وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر نہ بن سکے اور سر ظفر اللہ ممبر بنادیئے گئے؟

شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں احمدیت کے متعلق علامہ اقبال کے بیانات میں تلخی کی وجہ ایک سازش کے تحت احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں جس میں ایک ذاتی معاملے میں ان کا احساس محرومی بھی شامل ہو گیا۔ شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ ذاتی معاملہ وائسرائے کونسل کا ممبر نہ بننا تھا۔ (1)

قادیانی ماہنامہ الغرقان ربوہ میں جماعت احمدیہ کے ایک سابق مبلغ شیخ نور احمد منیر نے ایک مضمون 'علامہ اقبال اور احمدیت' حقائق کے آئینے میں لکھا۔ اس میں انہوں نے یہی موقف اختیار کیا ہے اور کہا ہے خالصتاً سیاسی محرکات اور ذاتی وقار کے لئے علامہ اقبال نے مخالفانہ اقدام اٹھایا جیسا کہ سید حبیب مدیر سیاست اور دوسری آراء اس امر پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈال رہی ہیں۔ (2)

اس کے برعکس ڈاکٹر جاوید اقبال کا موقف ہے کہ علامہ اقبال وائسرائے کونسل کے ممبر نہ بن سکتے تھے اس لئے کہ اس زمانے میں وہ بیمار تھے اور انگریز کی ملازمت کے لئے تیار نہ تھے، انگریز کی توقعات پر پورا نہ اترتے تھے کیونکہ انہوں نے انگریزی حکومت کو کئی بار تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

وہ لکھتے ہیں کہ ظفر اللہ کا تقرر سر فضل حسین کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خاں کے زمیندار، ویلکی میل اور مجاہد میں تیز و تند بیانات یا احرار کی ایجنسی ٹرینسٹیشن صرف سر ظفر اللہ کے تقرر یا احمدیوں کے خلاف ہی نہ تھی بلکہ سر فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی کے خلاف بھی تھی۔ اقبال کو اگر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت میں دلچسپی ہوتی تو سر فضل حسین کی ڈائری یا خطوط میں اس کا ذکر ملتا۔ انگریز اتنے کمزور نہ تھے کہ احرار کی ایجنسی ٹرینسٹیشن یا زمیندار کی حمایت کے باعث اقبال کو ممبر مقرر کر دیتے۔ اقبال نے کئی بار انگریزی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا اس لئے ان کے تقرر کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ 1934-35ء سے خود بیمار چلے آ رہے تھے اور اس قابل ہی نہ تھے کہ رکنیت قبول

کرتے، پھر ان کی اہلیہ محترمہ سردار بیگم سخت بیمار تھیں ان کی ناگہانی وفات اور نابالغ بچوں کی نگہداشت ایسے مصائب و آلام نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ (3)

قادیانیوں کا یہ الزام کہ علامہ اقبال احرار کے کسی سیاسی دباؤ میں آگئے تھے اس لئے یہ مضامین لکھے قطعاً بے بنیاد اور حقائق کے خلاف ہے۔

علامہ اقبال کے احرار رہنماؤں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی وغیرہ سے دوستانہ تعلقات تھے لیکن یہ بات غلط ہے کہ وہ احرار کے زیر اثر یا دباؤ میں آگئے۔ وہ احرار کے کانگریس نواز کردار سے بخوبی آگاہ تھے۔ احرار رہنما چوہدری افضل حق لکھتے ہیں کہ علامہ سر محمد اقبال ذہنی طور پر احرار تھے انہیں مرزائیوں کے عزائم میں اسلام کے لئے خطرہ نظر آتا تھا وہ مرزائیوں کی اسلام دشمنی کے اول سے قائل تھے اور کبھی آنکھوں میں جگہ نہ دیتے تھے کشمیر کمیٹی (جس کے صدر مرزا بشیر الدین تھے) کے وہ ضرور ممبر ہو گئے تھے لیکن یہ کیفیت اضطرابی تھی وہ فوراً سنبھل کر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں لگ گئے اور احرار کی تنظیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے عرف عام میں ان کے مرزائی شکن بیانات نے تعلیم یافتہ طبقے پر گہرا اثر کیا اور ہوا کا رخ ادھر سے ادھر پھر گیا۔ (4)

احرار نے ہمیشہ علامہ اقبال کی عزت کی مولانا انور شاہ کاشمیری نے مسئلہ قادیانیت اور ختم نبوت پر علامہ کی رہنمائی کی (5) شاید احرار لیڈر علامہ اقبال کے قادیانیوں کے خلاف مضامین لکھنے کا کچھ کریڈٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لئے ایسی باتیں بیان کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے علامہ اقبال پر سیاسی اثر یا دباؤ ڈال کر مطلب برآری کی۔ ایسی کوئی بات واقعات اور تاریخی حقائق سے ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ شہید گنج مسجد کی تحریک 1935ء میں سر فضل حسین نے احرار کی سیاسی ساکھ کو تباہ کر دیا تھا اور قادیانیوں نے ان کے خلاف اس زمانے میں اتنا وسیع اور مکر وہ پروپیگنڈا کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے وہ کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کے قابل نہ تھے وہ خود مسلمانوں سے ڈر کے مارے منہ چھپاتے پھرتے تھے کیونکہ انہوں نے تحریک میں حصہ نہ لیا تھا۔ اتحاد ملت پارٹی اور مولانا ظفر علی خان ان پر الگ برس رہے تھے۔ علامہ اقبال احرار کی کانگریس نواز نیشنلسٹ روش کے بھی خلاف تھے

ان کے مسلم قومیت کے متعلق الگ نظریات تھے اس لئے احرار کے کسی دباؤ کا یا ان سے تعاون کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

کیا علامہ اقبال وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بننے کے خواہشمند تھے؟
کیا اس بات کے کوئی تاریخی شواہد موجود ہیں کہ علامہ اقبال وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بننے کے خواہشمند تھے۔ آئیے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں:

بنیادی بات یہ ہے کہ اگر علامہ اقبال وائسرائے کی کونسل کا ممبر بننا چاہتے تو وہ سر فضل حسین سے بنا کر رکھتے، انگریز اور یونینسٹ پارٹی کی مخالفت نہ کرتے اور پنجاب مسلم لیگ کی تنظیم نو نہ کرتے۔ سر فضل حسین کی ڈائری اور ان کے خطوط میں علامہ اقبال کے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بننے کے بارے میں کوئی ذکر تک نہیں۔ نہ ہی کہیں متبادل امیدوار کے طور پر بھی ان کا نام لیا گیا ہے، نہ ہی ان کی ایسی کسی خواہش کو بیان کیا گیا ہے نہ ہی سر فضل حسین کا ظفر اللہ کے علاوہ کسی بھی شخص کے بارے میں ممبر بنوانے کا خیال یا ارادہ تھا۔ برٹش بیورو آف انٹیلی جنس کی رپورٹ کے مطابق اقبال ہندوستان میں ایک گھنٹا ترین بد معاش The Quietest Rogue In India تھا۔ (6) جب کہ سر ظفر اللہ انگریز کے نفس ناطقہ ان کی ہر سیاسی پالیسی کے موئد اور مذہبی عقیدے کی رو سے برطانوی سامراج کے وفادار اور خیر خواہ تھے۔ اس لئے علامہ اقبال کے ممبر بنائے جانے کا سرے سے امکان ہی نہ تھا انگریز کا انتخاب محض ظفر اللہ تھے۔

زندگی کے آخری سالوں میں علامہ اقبال کی صحت گر رہی تھی، پریکٹس کم ہو گئی تھی اور انہیں مالی دشواریوں نے گھیر رکھا تھا۔ اگرچہ وہ مسلمانوں میں بہت مقبول تھے اور مسلمان ان پر دل و جان نچھاور کرتے تھے لیکن پیشہ و سیاست دانوں نے ان کو ہمیشہ نظر انداز کئے رکھا۔ تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آ کر وہ سیاست سے ایک لحاظ سے کنارہ کش ہو گئے تھے اگرچہ وہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن وہ اس وقت ایک کاغذی تنظیم تھی۔ پنجاب کے سیاست دان سر فضل حسین سے تعلقات کو اہمیت دیتے تھے اور اس کو اپنے لئے اعزاز سمجھتے تھے کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے ممبر ہیں وہ ان سے عہدے اور

مرامات حاصل کرتے تھے اور انگریز کے قریب ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ سر فضل حسین علامہ اقبال کی بطور شاعر عزت کرتے تھے لیکن ان کے سیاسی نظریات اور اور ان کے انداز سیاست کو ناپسند کرتے تھے۔ اقبال کا خیال تھا کہ سر فضل حسین خود غرض اور موقع پرست شخص ہیں، وہ اپنی لیڈری کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں کم دلچسپی رکھتے ہیں۔ سر فضل حسین کے بیٹے عظیم حسین نے اپنے والد کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ان کے والد ہر سطح پر اقبال کی مدد کرنا چاہتے تھے لیکن اقبال نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کیا۔ مثال کے طور پر:

1- 1924ء میں سر فضل حسین نے پنجاب کے گورنر سر میلکم ہیلی کو اس بات پر راضی کیا کہ اقبال کو ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا جائے لیکن اس سے قبل اقبال نے برطانوی حکمرانوں پر سخت تنقید کر کے ان کی ہمدردیاں کھودیں۔

2- 1927ء میں سر فضل حسین نے ایک تجویز پیش کی کہ ایک مسلم وفد اقبال کی سربراہی میں لندن جائے اور سکریٹری آف سٹیٹ برائے ہند کو سیاسی اصلاحات کے بارے میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کرے لیکن اس وفد کے لئے فنڈ جمع کرنے کی تجویز کو علامہ اقبال نہ مانے بعد میں سر ظفر اللہ یہ وفد لے کر لندن گئے جن پر فضل حسین کو مکمل اعتماد تھا۔

3- سر فضل حسین اقبال کو پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا صدر منتخب کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے یونینسٹ پارٹی پر تنقید جاری رکھی جس کے باعث یونی نیسٹ رہنماؤں نے ان کی مخالفت کی اور ان کی جگہ سر شہاب الدین کو صدر منتخب کیا گیا۔

4- ستمبر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس لندن کے لئے علامہ اقبال کو سر فضل حسین کے ایماء پر مدعو کیا گیا۔ یہ بات غلط ہے ان کو خود وائسرائے ہند نے وفد میں شامل ہونے کی دعوت دی کیونکہ وہ اس وقت مسلم لیگ کے صدر تھے۔ (7)

5- سر ظفر اللہ کہتے ہیں کہ تیسری گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال کو انہوں نے مسلم وفد میں شامل کرایا۔ سر ظفر اللہ اس وقت سر فضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے عارضی ممبر تھے وہ

کہتے ہیں:

تیسری گول میز کانفرنس میں گورنمنٹ برطانیہ ان کو نہیں بھیج رہی تھی اور نہ قائد اعظم کو۔ تیسری گول میز کانفرنس کے لئے جب ڈاکٹر صاحب کا نام آیا تو وائسرائے نے مجھے بتایا کہ پچھلی کانفرنس میں انہوں نے کوئی کنٹری بیوشن نہیں کی نہ دلچسپی لیتے تھے میں نے کہا دلچسپی تو وہ اب بھی نہیں لیں گے۔ نہ میں گارنٹی دے سکتا ہوں کہ وہ تقریر کریں گے لارڈ ولنگٹن میرے ساتھ بے تکلف تھے انہوں نے کہا 'میرے پیارے پھر تم کیوں اصرار کرتے ہو؟'

My dear then why do you insist?

میں نے کہا کہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان طبقے میں ڈاکٹر صاحب کا بڑا احترام ہے اگر یہ چلے جائیں تو وہ سمجھیں گے کہ راونڈ ٹیبل کانفرنس میں کوئی کام کی بات ہو رہی ہے ڈاکٹر صاحب جو گئے ہیں، میں تو اس پر سٹیج کے لئے چاہتا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تار میں لکھ دیا ہوگا کیونکہ سیکرٹری آف سٹیٹ مان گئے تھے۔ میں اس وقت میاں صاحب کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تھا اور نہ تو میرا کوئی واسطہ ان باتوں سے نہ ہوتا۔ (8)

یہ بات ہم سر ظفر اللہ کی نیت پر چھوڑتے ہیں کہ انہوں نے علامہ اقبال سے دوستی کی بنیاد پر ان کا نام وفد میں شامل کرایا یا انگریز کی محبت میں کیا تا کہ مسلمانوں کا گول میز کانفرنس پر اعتماد برقرار رہے۔

اقبال نے کبھی کسی چھوٹے بڑے سرکاری عہدے کے لئے تگ و دو نہ کی۔ بعض اوقات انہوں نے مالی وجوہات کی بناء پر کسی منصب کے لئے سوچا بھی تو وہ وقتی نوعیت کا فیصلہ تھا۔ وہ دوستوں میں گھرے رہنے پر خوش رہتے تھے۔ وہ عوامی روابط نہ بڑھاتے تھے اور مشاعروں میں بہت کم جاتے تھے۔ سرکاری تقریبات میں تو شاذ ہی جاتے تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بننے کے لئے کس قسم کے سیاسی کردار اور اہلیت کی ضرورت تھی اور یہ عہدہ کن خدمات کے صلے میں دیا جاتا تھا اب ہم اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

سرفظر اللہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر کیسے بنے؟

سرفضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے اور ان کے پاس وزارت تعلیم کا قلم دان تھا۔ وسط ماہ جون 1932ء میں بیماری کے باعث انہوں نے چار ماہ کی چھٹی لی اور انگریزی حکومت نے فضل حسین کی سفارش پر ان کی جگہ سرفظر اللہ کو عارضی رکن نامزد کر دیا ان کو محکمہ تعلیم و صحت دیا گیا۔

واضح رہے کہ جب کبھی ایسی اہم پوسٹ خالی ہو جاتی تھی یا خالی ہونے کی صورت پیدا ہوتی تھی تو ہندوستانی پریس میں افواہوں اور طرح طرح کی قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، کوئی اخبار کسی اہم شخصیت کا نام لیتا اور کوئی کسی کا ذکر کرتا۔ اس طرح اپنی پسند کے آدمی کو اس اہم منصب پر فائز کرانے کے لئے کئی قسم کے جواز تراشے جاتے تھے۔ سرفظر اللہ سرفضل حسین کے پروردہ تھے اور فضل حسین کا حکومت میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔ وہ جماعت احمدیہ کے ہمدرد تھے ان کے والد کے مرزا، احمد قادیانی سے خاندانی تعلقات تھے، خود انہوں نے دو تین بار مرزا صاحب سے ملاقات کی تھی۔

سرفظر اللہ اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

سرفضل حسین کے بارے میں یہ ہے کہ ایک دفعہ جب آپ پہلی بار ولایت سے تشریف لائے، بیرسٹری کر کے، تو ابھی انہوں نے پریکٹس شروع نہیں کی تھی کہ ان کے والد صاحب نے انہیں قادیان بھیجا۔ ان کے شہر بٹالہ میں بعض احمدی خاندانوں سے تعلقات تھے ان کو ساتھ لے کر یہ قادیان آئے، میں اتفاق سے وہیں تھا۔ میں ان دنوں طالب علم تھا۔ خاصی دیر انکی ملاقات حضرت بانی سلسلہ سے ہوئی۔ ایک بات مجھے یاد ہے۔ میاں صاحب نے کچھ پریشانی کا اظہار کیا کہ آریہ بہت بڑھتے چلے جا رہے ہیں ان کے بارے میں تشویش ہے تو حضرت بانی سلسلہ نے فرمایا ”میاں صاحب ان لوگوں کی بنیاد روحانیت پر نہیں ہے اس لئے یہ زیادہ عرصہ نہیں چلیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر دے یا فرمایا لمبی عمر دے آپ دیکھیں گے کہ یہ ختم ہو جائیں گے۔“

ایک یہ واقعہ یاد ہے، میاں صاحب کا لباس بھی یاد ہے سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ اچھی صحت والے تھے۔ اور پھر ایک بار میں موجود نہیں تھا میاں صاحب حضرت بانی سلسلہ سے اکیلے بھی ملے تھے۔ یہ

حضور کا آخری سفر لاہور تھا مئی 1908ء کی بات ہے۔

پھر رؤساء کی جو دعوت کی گئی تھی حضرت صاحب کی اجازت سے اور اس میں حضور نے خطاب بھی فرمایا تھا، اس میں بھی شامل ہوئے تھے۔

لیکن جو واقعہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ 1934ء میں جب میں ولایت میں تھا اس وقت یہاں یہ بڑا شہرہ ہو رہا تھا کہ میاں صاحب کی جگہ پر آئندہ اپریل میں کونسا شخص ہوگا۔ سر فضل حسین نے کہا میرے پاس چند علماء وفد لے کر آئے اور مجھے کہا کہ یہ کرو، وہ کرو اور احمدیوں کو آگے نہ آنے دو۔ میں نے کہا کہ تم کو کیا اعتراض ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ مسلمان کی جگہ ہے اور ظفر اللہ مسلمان نہیں۔ میاں صاحب نے فرمایا اگر وہ مسلمان نہیں تو اس نے مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں سے بڑھ کر ہماری خدمت کی ہے تو تم کو اور کیا چاہئے۔ انہوں نے کہا نہیں ہم یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ یہ سیٹ جو مسلمانوں کی ہے اس پر غیر مسلم قبضہ کر لیں۔ میاں صاحب نے کہا آپ ان کو کیوں غیر مسلم سمجھتے ہیں؟ انہوں نے حضرت بانی سلسلہ کے عقائد کے بارے میں بعض باتیں کہیں کہ وہ فلاں فلاں عقیدہ رکھتے تھے۔ میاں صاحب نے کہا میں زیادہ مسئلے مسائل نہیں سمجھتا۔ خود انہوں نے مجھے بعد میں بتایا کہ میرے پاس ڈرٹمن (مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک تصنیف) تھی میں اٹھا اور دوسرے کمرے سے جا کر وہ کتاب اٹھالایا اور ان کو دی اور کہا کہ یہ لے جاؤ اس کا اچھی طرح مطالعہ کرو اگر اس کتاب کے مصنف سے زیادہ کسی عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تمہیں پتہ ہو تو مجھے آکر بتانا۔

ان کے بڑے بیٹے نے بیعت کی آپ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ تو وہ احمدی تو نہیں تھے لیکن حضرت بانی سلسلہ کو مفتری نہیں سمجھتے تھے۔ مجھے انہوں نے اپنی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں بڑا زور لگا کر رکھنا حالانکہ ملک فیروز خاں نون کو مجھ سے زیادہ تجربہ تھا۔ وہ صوبے میں وزیر بھی رہ چکے تھے اور ان کا بھائی میاں فضل حسین صاحب کا داماد بھی تھا۔ اور بھی تھے میاں صاحب کے تعلقات والے احمدیار خاں دولتانہ، سکندر حیات وغیرہ۔“ (9)

سر فضل حسین کو ظفر اللہ کی وفاداری پر یقین تھا۔ اور یہی اعتماد حکومت برطانیہ کو تھا۔ سر فضل حسین

جماعت احمدیہ کو نوازنے اور مرزا محمود خلیفہ قادیان کو زیر بار احسان رکھنا چاہتے تھے وہ ان سے یونینسٹ پارٹی اور سرکار برطانیہ کے لئے خدمت لیتے رہتے تھے کچھ ظفر اللہ کی اپنی لیاقت کا بھی اس میں کسی قدر دخل تھا۔ پریس میں جیسے ہی سر ظفر اللہ کی تقرری کی خبر اڑتی تھی ہندو پریس مسلم دشمنی کے باعث ان کی مخالفت کرتا اور مسلم پریس ان کے غیر مسلم (قادیانی) ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف ادارے لکھتا۔ بعض اخبارات ایسے بھی تھے جو ان کی حمایت میں دلائل تراشتے ان میں زیادہ تر لبرل خیالات اور قومی فلاح و بہبود کے نام لیوا سرکار کے حامی اخبارات تھے۔ وہ سیاسی عناصر جو قادیانی خلیفہ اور جماعت احمدیہ سے تعاون کو اپنی ترقی کا زینہ سمجھتے تھے اور مستقبل میں فوائد حاصل کرنے کی امید رکھتے تھے ظفر اللہ کے تقرر کو نہایت دانشمندانہ اور درست فیصلہ قرار دیتے اور قادیانی اکابر اور انگریز حکام سے ملاقاتوں میں ان کے انتخاب کی داد دیتے تھے۔

1932ء میں چار ماہ کے لئے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا نمبر نامزد ہونے کے وقت سر ظفر اللہ دہلی سازش کیس میں کراؤن کونسل یا سرکاری وکیل تھے۔ یاد رہے پنجاب کے دو انقلابیوں بھگت سنگھ اور دت نے مرکزی اسمبلی کے ایوان میں 18 اپریل 1929ء کو دو بم پھینکے۔ یہ لاہور سازش کیس کہلاتا ہے اس جرم میں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو 22 مارچ 1931ء کو لاہور میں پھانسی دے دی گئی۔ ابھی یہ مقدمہ چل رہا تھا کہ 23 دسمبر 1929ء کو دہلی کے قریب وائسرائے کی ٹرین کو بم سے اڑانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ بچ گئے۔ اسے دلی سازش کیس کہتے ہیں اس کیس کی پیروی کرنے اور حریت پسند انقلابیوں (جنہیں قادیانی اور برطانوی حکومت باغی اور دہشت پسند کہتے تھے) کو سزا دلانے کے لئے حکومت نے ظفر اللہ کی خدمات حاصل کیں اور ان کو بھاری فیس ادا کی گئی تھی یہ خدمت صرف ایسے شخص کو سونپی جاسکتی تھی جو سرکار برطانیہ کا پکا وفادار ہو اور آزادی پسندوں کو ہر ممکن قانونی ہتھکنڈوں سے تختہ دار پر لٹکوانے میں ماہر ہو۔ انقلابیوں کی طرف سے آصف علی (ارونا آصف علی کے شوہر) اور سیف الدین کپلو پیش ہوئے۔

خیر یہ تو چار ماہ کی مدت کے لئے ظفر اللہ کی وائسرائے کونسل میں تقرری کا مسئلہ تھا جب سر فضل حسین

بیماری کے باعث ایبٹ آباد میں چھٹیاں گزار رہے تھے، تو اس تقرری نے ان کے آئندہ ممبر بننے کے امکانات پیدا کر دیئے کیونکہ فضل حسین تھوڑے عرصے بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔

سر ظفر اللہ کا وائسرائے کی کونسل میں مستقل تقرر

تیسری گول میز کانفرنس 17 نومبر سے 24 دسمبر 1932ء تک منعقد ہوئی جس میں ظفر اللہ نے شرکت کی۔ سر فضل حسین نے ان کو محمد علی جناح کو دو بدو جواب دینے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ (10) کیونکہ وہ ان کے سیاسی نظریات کے خلاف تھے۔ انہوں نے چوہدری رحمت علی کی پاکستان سکیم کی مخالفت کی (11) اور اسے طلباء کی سکیم اور ناقابل عمل بتایا۔

جولائی 1934ء کے اوائل میں سر ظفر اللہ اپنے خرچ پر لندن گئے انہوں نے سکرٹری آف سٹیٹ اور دیگر اعلیٰ برطانوی افسروں سے ملاقاتیں کیں تاکہ اپنے سیاسی مستقبل کی راہ ہموار کر سکیں۔ انہوں نے لندن کے پارک لین ہوٹل میں سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندو سر سمویل ہور کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ وزیر ہند نے ان کی گول میز کانفرنسوں اور جائنٹ سلیکٹ کمیٹی میں انجام دی گئی خدمات کو سراہا اور انہیں یقین دلایا کہ ہندوستان میں ان کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور امید ظاہر کی کہ وہ برطانیہ کے ہمیشہ مخلص رہیں گے۔ (12)

سیکرٹری آف سٹیٹ سر سمویل ہور نے سر ظفر اللہ سے کہا کہ دو سال ہوئے انہوں نے سر فضل حسین کی جگہ کام کیا تھا۔ اب ان کی اور وائسرائے ہند (لارڈ ولنگٹون) کی خواہش ہے کہ آئندہ سال تم سر حسین کی جگہ لو۔ ظفر اللہ کہتے ہیں کہ انہوں نے سکرٹری آف سٹیٹ کو بتایا کہ پنجاب سے دو آدمی میاں سر شفیع اور میاں سر فضل حسین پہلے ہی کونسل کے ممبر رہ چکے ہیں اب ان کا تقرر ہوا تو بنگال، یوپی وغیرہ کے مسلمانوں کو شکوہ ہوگا لیکن سکرٹری آف سٹیٹ نے جواب دیا کہ حکومت برطانیہ کسی صوبہ وارانہ انتخابی قاعدے کی پابند نہیں۔ ظفر اللہ کہتے ہیں کہ انہوں نے نواب چھتاری اور سر سکندر حیات کے نام موزوں امیدواروں کے طور پر پیش کئے لیکن سکرٹری آف سٹیٹ نہ مانے (13) اور انہوں نے ظفر اللہ کو ہی یہ 'سعادت' بخشی۔

سرفظرفلہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے وزیر ہند سے یہ بھی کہا کہ وہ احمدی ہیں، مسلمان اس پر احتجاج کریں گے، سکرٹری آف سٹیٹ نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا اس پر فظرفلہ نے جواباً کہا کہ وہ شروع ہی سے اپنے تقرر پر رضامند ہیں۔

13 اکتوبر 1934ء کو ان کی وزیر ہند سر سیمول ہور سے پھر ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے بتایا کہ ان کی تقرری کے بعد انہیں ہندوستان سے بہت سے تار اور مراسلات اس کی مخالفت میں آئے ہیں لیکن انہوں نے اپنے سکرٹری کروفٹ کو کہہ دیا ہے کہ جو بھی خط یا تار اس سلسلے کا آئے اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دے۔ انہوں نے کروفٹ کو بلوا کر کہا کہ وائسرائے کو جلد اطلاع کرو کہ فظرفلہ اس تقرر پر رضامند ہے آئندہ ہفتے اس کے تقرر کا اعلان کر دیا جائے۔ وزیر ہند انہیں فضل حسین کے قلمدان کے بجائے سر جوزف بھورمبر وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کا قلمدان تجارت اور ریلوے دینا چاہتے تھے۔

سرفظرفلہ اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں کہ نومبر 1934ء میں وہ لندن سے واپس ہندوستان آئے۔ ہندوستان میں سرفضل حسین کی جگہ نئے آدمی کے تقرری کی بحث اخبارات اور سیاسی حلقوں میں جاری تھی۔ اس سلسلے میں کئی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ فظرفلہ نے وائسرائے ہند لارڈ ولنگٹن سے پہلی میں ملاقات کی اور انہوں نے ان کو (سکرٹری آف سٹیٹ کی ایما پر) کونسل کا ممبر بننے کی تجویز پیش کی۔ فظرفلہ کہتے ہیں کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ سر سیمول ہور برطانوی سکرٹری آف سٹیٹ پہلے ہی ’پختہ طور پر‘ اس کو فرما چکے تھے لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ خود اس کا ان سے ذکر کریں۔ (14)

وہ اسمبلی میں یورپین اراکین جوزف بھورمبر وغیرہ سے وائسرائے کی ہدایت پر ملتے رہے اس دوران وزیر ہند سر سیمول ہور نے وائسرائے کو ایک سخت ڈانٹ کا خط لکھا کہ فظرفلہ کے تقرر میں دیر کیوں کی جا رہی ہے۔ اور اس طرح فظرفلہ کو اپنی مرضی کا محکمہ اور وائسرائے کونسل میں تقرر کا پروانہ مل گیا۔ واضح رہے کہ 1934ء میں حکومت فظرفلہ کو سر شادی لال کی جگہ ہائی کورٹ کا جج بنانے پر رضامند تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ وائسرائے ہند نے انہیں پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ کی پیشکش کی لیکن انہوں نے اس کو بھی قبول نہ کیا اور مئی 1935ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر مقرر

کئے گئے۔ (15) جس میں ان کو دلچسپی تھی۔

اخبار الفضل ان کے تقرر میں تاخیر کے متعلق لکھتا ہے:

اخبار احسان نے لکھا ہے کہ ظفر اللہ کو عارضی طور پر وائسرائے کو نسل کا ممبر مقرر کیا گیا ہے یعنی جب تک سر جوزف بھور لندن سے واپس نہیں آتے۔ اخبار نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس عارضی تقرر کے دوران وہ اپنے حامی پیدا کریں گے اس لئے مسلمانوں کے احتجاج میں فرق نہیں آنا چاہئے اسی لئے احرار یوں نے شور جاری رکھا ہوا ہے۔

”اب احرار یوں کو یہ سن کر خود کشی کر لینی چاہئے کہ ملک معظم نے جناب چودھری صاحب کو 26 مئی 1935ء (16) سے وائسرائے کی کو نسل کا مستقل ممبر مقرر کر دیا ہے۔ اور اس کا اعلان گزٹ آف انڈیا میں ہو گیا ہے۔ اس طرح ایک بار پھر نہ صرف مدیر و سر دیر احسان کی حماقت اور نادانی کی یاد تازہ ہو گئی بلکہ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جناب چودھری صاحب کے خلاف احرار یوں کو شور و شر مچانے میں کلیئہ ناکامی و نامرادی حاصل ہو چکی ہے۔“ (17)

اس شمارے میں اخبار الفضل نے سر ظفر اللہ کو نائٹ ہڈ کا خطاب دینے کا ذکر کیا ہے جو ملک معظم کے یوم ولادت اور سلور جوبلی کی تقریب پر انہیں دیا گیا۔ اخبار نے جماعت احمدیہ کی طرف سے انہیں ہدیہ تبریک پیش کیا اور دعا کی کہ خدا انہیں بیش از بیش انعامات کا مورد بنائے۔ وہ پہلے احمدی ہیں جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ (18)

یہ پس منظر ہم نے اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ برطانوی حکومت وزارت اور شرکت اقتدار کے لئے ہر شخص کو دعوت نہ دیتی تھی بلکہ کئی باتوں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا علامہ اقبال اس وفاداری اور اطاعت سرکار کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ کیا انہوں نے اس تقرری کے دوران کسی مسلم ادارے، جماعت یا تنظیم سے اپنے حق میں پروپیگنڈا کرایا، پس پردہ مسلمانوں کو ظفر اللہ کے تقرر کے خلاف احتجاج پر اکسایا یا کوئی اور سیاسی حربہ استعمال کیا؟ کیا انہوں نے

کسی انگریز حکمران، اپنے کسی دوست، ریاستوں کے کسی فرماں روا یا سیاسی شخصیت سے کوئی ملاقات کی یا کوئی خط لکھا جس میں یہ کہا گیا ہو کہ سر ظفر اللہ کے ممبر بننے سے ان کی حق تلفی ہوئی ہے؟ کیا وہ اس سلسلے میں گورنر پنجاب سر ایمرسن یا وائسرائے لارڈ ولنگٹن سے ملے۔ (19) کیا انہوں نے اس تقرر کے خلاف خود کوئی احتجاجی بیان دیا یا کسی سے دلویا؟ کیا انہوں نے سر فضل حسین کے در دولت پر حاضری دی؟ کیا انہوں نے ظفر اللہ کے تقرر کے سرکاری فیصلے کے بعد کسی مرحلے پر اپنی وفات تک کبھی کسی سے اشارت یا کنایتاً کوئی ذکر کیا، اگر ایسی کوئی بات نہیں تو اس کو محض الزام ہی کہا جاسکتا ہے۔

سر ظفر اللہ لکھتے ہیں کہ 1932ء میں جب ان کے سر فضل حسین کی چار ماہ کی رخصت کے دوران عارضی تقرر کی بحث جاری تھی اور وہ دلی سازش کیس میں سرکاری وکیل کے فرائض انجام دے رہے تھے تو روزنامہ ٹریبون (ایک کانگریسی اخبار) میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ان کی جگہ اس عرصے کے لئے لاہور کے ایک وکیل کا تقرر ہوگا۔

ظفر اللہ کہتے ہیں کہ خبر پڑھ کر صدر علی اسٹنٹ جیلر نے جو مقدمہ سازش کے ملزمان کو جیل خانے سے عدالت لاتے اور لے جاتے تھے ٹیلی فون پر انہیں مبارک باد دی۔ ظفر اللہ کہتے ہیں ”میں نے انہیں بول دیا کہ خبر میں کوئی نام درج نہیں حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا ہی تقرر ہوگا دوسری صبح انہوں نے پھر ٹیلی فون کیا کہ آج نام چھپ گیا ہے لیکن ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام ہے تمہارا نہیں، میں (ظفر اللہ) نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب میری نسبت کہیں زیادہ اس کے اہل ہیں۔“ (20)

ظفر اللہ چاہے خود 1932ء میں علامہ اقبال کی اہلیت کی بناء پر ان کی تقرری کے معترف ہوں لیکن ان کو معلوم تھا کہ قمر عقال انہی کے نام نکلے گا۔ اصولی طور پر تو علامہ اقبال اس کے اہل تھے لیکن انگریز کی کتاب میں کچھ اور مقاصد اور سیاسی تقاضے بھی تھے جن کو پورا کرنا ضروری تھا اس لئے یہ بات ہر لحاظ سے غلط ہے کہ علامہ اقبال کو سر ظفر اللہ کے تقرر سے کوئی رنجش یا احساس محرومی ہو اور انہوں نے اس کو قادیانیت کے خلاف مضامین لکھ کر نکالا۔ قادیانیت کے خلاف مضامین میں انہوں نے کسی فرد پر

کسی قسم کی تنقید نہیں کی بلکہ مجموعی طور پر تحریک کے اسلام مخالف کردار کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کو اس کے تہذیبی اور سیاسی مضمرات سے آگاہ کیا ہے جس کو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ ایکٹ آف 1935ء کے نفاذ کے بعد پنجاب میں جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہونے والی تھیں ان کی روشنی میں مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے تحفظ پر ان کی نظر تھی۔ علامہ اقبال کے مضامین پر سید حبیب کے اخبار سیاست اور بعض دوسرے اور تیسرے درجے کے اخبارات جیسے رونامہ حق لکھنؤ نے جو تنقیدی ادارے لکھے ان میں اور باتوں کے علاوہ یہ شوشہ چھوڑا کہ علامہ اقبال کو چونکہ وائسرائے کونسل کا ممبر نہیں بنایا گیا اس لئے وہ احمدیت کے مخالف ہو گئے اور ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تا کہ یہ ظاہر ہو کہ ظفر اللہ غیر مسلم ہیں، انکا تقرر مسلم سیٹ پر کیوں کیا گیا۔ ظفر اللہ کے تقرر کی خبر 1934ء سے اڑ رہی تھی علامہ اقبال کوئی تحریک چلاتے تو اس زمانے میں چلاتے جب اس کا کوئی اثر پڑتا، جب یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ ظفر اللہ ہی ممبر بنیں گے، پھر احمدیوں کی مخالف کا کیا فائدہ تھا۔ علامہ اقبال نے ان الزامات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ سر ظفر اللہ کا ایک غیر مطبوعہ انٹرویو قادیانی ماہنامہ انصار اللہ ربوہ میں شائع ہوا اس میں وہ فرماتے ہیں کہ 1940ء میں وائسرائے کونسل کے ممبر کے طور پر ان کے عہدہ کی معیاد ختم ہونے والی تھی لیکن اس معیاد کے ختم ہونے سے پہلے سیشل وارنٹ آف کنگ (Warrant of King) کے ذریعے انہیں مزید پانچ سال کے لئے ممبر مقرر کیا گیا لیکن انہوں نے ایک سال پانچ ماہ بعد فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے جج کا عہدہ قبول کر لیا۔

سوال: محترم چوہدری صاحب آپ کی پبلک لائف کا آغاز کب ہوا؟

جواب: پبلک لائف سے نجانے آپ کی کیا مراد ہے۔ میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز وکالت کی پریکٹس سے کیا۔ پھر 1926ء میں میں صوبائی کونسل کا رکن منتخب ہوا اور اس طرح سے پنجاب کی سیاست میں میرا عمل دخل شروع ہوا اور ایک لحاظ سے پہلا پبلک عہدہ 1932ء کے موسم سرما میں حاصل کیا جبکہ میں میاں سرفضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں عارضی طور پر رکن مقرر ہوا۔ اس کے بعد 1935ء

(17) اخبار الفضل قادیان 5 جون 1935ء۔ آنراہیل سرچوہدری ظفر اللہ خان صاحب کا وائسرائے کی کونسل میں مستقل تقرر

(18) ایضاً

(19) میاں شفیع (م ش) لکھتے ہیں کہ جن دنوں فضل حسین کے جانشین کے تقرر کا معاملہ زیر غور تھا وائسرائے اور ڈولنگٹن نے ایک ملاقات میں علامہ اقبال سے کہا کہ اب ہم اکثر ملتے رہا کریں گے۔ علامہ اقبال کے وائسرائے سے ملنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ولینگٹن 1931ء سے 1936ء تک وائسرائے ہند رہا۔ 1934ء یا اس سے پہلے علامہ اقبال کے ان سے ملنے کی کوئی شہادت نہیں۔ م ش نے یہ روایت قادیانی موقف کو تقویت پہنچانے کے لئے گھڑی ہے جیسا کہ ان کا وطیرہ تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اس بات کی تردید کی (زندہ رود، ص: 582)

(20) تحدیث نعت ص 299

(21) ماہنامہ انصار اللہ ربوہ، نومبر دسمبر 1985ء

قادیانیت کے حقیقی خدو خال

علامہ اقبال نے مئی 1935ء کے دوسرے ہفتے میں اپنا پہلا بیان 'قادیانی اور جمہور مسلمان' سٹیٹس مین دہلی میں شائع کرایا۔ انہوں نے اسلام میں عقیدہ ختم نبوت کی تمدنی اہمیت، اس عقیدے کے خلاف قادیانیوں کی بغاوت، قادیانیت کے دیگر عقائد، اس کا یہودیت کی طرف راجع ہونا اور دین کی باغی اس جماعت سے مسلمانوں کو پہنچنے والے معاشی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی نقصانات کی نشاندہی کی۔ (1)

اس بیان اور اس پر سٹیٹس مین کے تبصرے 14 مئی 1935ء کے بعد بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ علامہ اقبال نے حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانیوں کو کچل دے۔ علامہ نے اس بات سے انکار کیا۔ 10 جون کو انہوں نے اخبار سٹیٹس مین کو ایک خط لکھا جس میں کہا کہ حکومت کیلئے بہترین طریق یہ ہے کہ وہ ان کو الگ جماعت تسلیم کرے جو قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہو گا، مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لیں گے جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتے ہیں۔ (2)

علامہ اقبال کے بیان کے اہم نکات

- ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناءً نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لئے ایک خطرہ تصور کریں گے اور یہ اس لئے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہے۔

- اسلام جو تمام جماعتوں کو ایک لڑی میں پرونے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی تحریک کے ساتھ کوئی

ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لئے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لئے مزید افتراق کا باعث بنے۔

- بہائیت قادیانیت سے زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن قادیانیت اسلام کی چند اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح بعد مقاصد کے لئے مہلک ہے۔ اس کا حاسد خدا کا تصور جس کے پاس دشمنوں کے لئے لاقعداد زلزلے اور بیماریاں ہیں، اس کا نبی کے متعلق کا ہن کا تخیل اور اس کا روح مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔

- اسلامی ایران میں موبدانہ اثر کے تحت جو ملحدانہ تحریکیں انھیں انہوں نے بروز، ظل، حلول وغیرہ کی اصطلاحات وضع کیں تاکہ تنازع کے تصور کو چھپا سکیں۔ مسیح موعود کی اصطلاح بھی اسلام کے دور اول کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔

- قادیانیوں نے معاشرتی طور پر مسلمانوں سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور دنیائے اسلام کو کافر کہتے ہیں۔ وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے پر کیوں مصر ہیں؟

- علامہ ذاتی طور پر تحریک سے اس وقت بیزار ہوئے جب ایک نئی نبوت، بانی اسلام ﷺ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا، اور ایک قادیانی کی زبان سے خود انہوں نے آنحضرت ﷺ کے خلاف نازیبا کلمات سنے۔

- قادیانیوں کے مفاد میں ہے کہ وہ اپنے عقیدہ اور مسلک کی رو سے مسلمانوں سے الگ ہو جائیں۔ حکومت کے لئے بھی بہتر طریق یہی ہے کہ وہ ان کو الگ جماعت قرار دے۔ (3)

حقائق پر مبنی دلائل

مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریک کی ابتداء اور اس کی مخالفت کے آغاز 1891ء سے لے کر 1935ء تک اہل علم حضرات نے سیکڑوں کتب، رسائل اور اشتہارات شائع کر کے مرزا صاحب کے

دعاوی اور دلائل کی تردید کی۔ یہ تمام لٹریچر مرزا غلام احمد کی پیش گوئیوں کے جھوٹا ہونے، حیات مسیح کے دلائل، مہدی اور مجدد کے عقیدے اور ختم نبوت کے دینی ثبوت پر مشتمل ہے۔ اس کے جواب میں مرزا غلام احمد نے اپنے مخالفین کو نہایت سخت اور تحقیر آمیز انداز سے مخاطب کیا اور اپنے دعوؤں کو اپنی وحی سے تقویت دی۔

مسلمانوں نے تحریک احمدیت کے حقیقی مقاصد اور اس کے عواقب و عوامل کا بہت کم جائزہ لیا تھا، علامہ اقبال نے پہلی دفعہ کھل کر بتایا کہ تحریک احمدیت کے مسلمانان عالم خصوصاً اسلامیان ہند کے لئے سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی مضمرات کیا ہیں انہوں نے اپنے مضامین میں واضح کیا کہ مرزا غلام احمد نے نئی نبوت کا دعویٰ کیا اور بروز اور ظل کی متصوفانہ اصطلاحات کی آڑ میں ختم نبوت کا انکار کیا اور نبی کریمؐ کے ختم نبوت کے منصب پر ڈاکہ ڈالا۔ انہوں نے اپنی وحی کی بنیاد پر امت محمدیہ کی شکستہ سنت کر کے ایک نئی امت تشکیل دی جس کے لئے مسلمانوں کو کھل کر کافر قرار دیا، ان سے رشتہ ناطہ خدا کے حکم سے ممنوع قرار دیا، غیر احمدی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی ممانعت کی اور مسلمانوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کر دیا۔ اس طرح انہوں نے ایک نئی جماعت کی نیواٹھائی۔ یہ اسلام سے کھلی غداری اور بغاوت تھی چونکہ انہوں نے انگریز کی اطاعت اور وفاداری کا درس دیا اور اس کی مذہبی رواداری سے فائدہ اٹھا کر اپنے باطل نظریات کی ترویج کی اس لئے مسلمانوں کو اپنے ملی استحکام اور دینی وحدت کے تحفظ کے لئے ایسی باغی جماعت کو اپنے سے الگ قرار دینے کا حق حاصل ہے اور حکومت کو چاہئے کہ ان کو مسلمانوں سے الگ قرار دے۔

قادیانی اپنے اس جرم یعنی اسلام دشمن معتقدات اور دین کے خلاف کھلی بغاوت کا ذکر نہیں کرتے جس کا مرزا غلام احمد نے ارتکاب کیا بلکہ اپنے گھسے پٹے دلائل دہراتے رہتے ہیں مرزا صاحب کے دو صاحبزادوں مرزا محمود احمد اور مرزا بشیر احمد ایم اے نے جس انداز سے ان کے دعاوی کی صداقت اور مسلمانوں کی قادیانیوں سے مکمل علیحدگی پر زور دیا وہ اس کے مضمرات کو زیر بحث نہیں لاتے، اس کے بجائے علامہ اقبال کی ذات پر یکچڑا چھانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ قادیانی مبلغ علامہ

اقبال کے دلائل کا رد پیش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے کیونکہ جس انداز سے علامہ نے حقائق کو واضح کیا وہی تحریک احمدیت کا مدعا و مقصود اور اس کی حقیقی روح ہے۔ علامہ نے یہ بھی کہا کہ قادیانی جماعت ہی احمدیت کے اصل منشا اور نظریے کی صحیح ترجمان ہے لاہوری جماعت نہیں۔

مرزا صاحب کے دعاوی، الہامات، اور تحریرات اور ان کی قادیانی اصول کی فلاسفی کی بنیاد پر علامہ اقبال نے ان کے نفسیاتی تجزیہ کا مطالبہ کیا اور ان کو ایک ذہنی مریض قرار دیا جیسا کہ ان کے وحی والہامات کے اس وقت کے شائع شدہ مختصر مجموعے البشری سے مترشح تھا بعد میں ان کا ایک جامع مجموعہ، تذکرہ قادیان سے شائع ہوا جو اس مسئلہ کی بہتر تفہیم مہیا کرتا ہے۔

1931ء کے نصف آخر میں علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ لندن مشن کے قادیانی امام فرزند علی نے علامہ اقبال اور وفد کے بعض دوسرے اراکین کو کھانے کی دعوت دی۔ علامہ اقبال نو مسلم انگریزوں کی زبان سے قرآن سن کر خوش ہوئے۔ ایک انگریز نوجوان عبدالرحمن ہارڈی کے حسن قرأت اور صحیح تلفظ سے بے حد محظوظ ہوئے ایک انگریز بچی سے سورہ فاتحہ سن کر اس کو ایک پاؤنڈ انعام دیا اور امام مسجد لندن کا شکریہ ادا کیا جن کی توجہ سے یہ موقع میسر آیا۔ (4)

اس واقعے کے چند ماہ بعد ان کے ایک دوست محمد احسن نے جن کے بھائی محمد حسن لاہوری احمدی تھے ان کو اپنے بارے میں قادیانیت اختیار کرنے کے متعلق ایک خط لکھا۔ انہوں نے 7 اپریل 1932ء کو اس کے جواب میں فرمایا۔

1- مرزا صاحب نے اسلام کو پیش کرنے کا جو طریق اختیار کیا وہ زمانہ حال کی طبائع کے لئے موزوں نہیں۔

2- لاہور جماعت میں ایسے افراد ہیں جو غیرت مند مسلمان ہیں ان کی مساعی میں ان کا ہمدرد ہوں اس جماعت کے اکثر افراد میں اشاعت اسلام کا جو جوش پایا جاتا ہے وہ قابل قدر ہے۔ (5)

3- لاہوری جماعت میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا تعلق ان کی اپنی سمجھ اور رائے پر ہے۔

انہوں نے یہ مشورہ نہ دیا کہ ضرور شامل ہو جاؤ یہ سچے ہیں اور میں بھی احمدی خیالات رکھتا ہوں۔

1935ء میں علامہ اقبال نے قادیان اور لاہور جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں اور بلند بانگ دعوؤں کا ازسرنو جائزہ لیا اور اپنی سابقہ رائے تبدیل کر لی۔ ان کو لاہور جماعت کے دوکنگ مشن کے قیام میں برطانوی حکومت کے سیاسی مقاصد کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس سلسلے میں برطانوی حکومت نے جس رواداری کا مظاہرہ کیا تھا اس نے اسلام کے لئے بعض پیچیدہ مسائل کو جنم دیا۔ علامہ فرماتے ہیں:

پس میرے خیال میں وہ تمام ایکثر جنہوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا زوال و انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ کٹ تپلی تھے۔ ایران میں بھی اس قسم کا ایک ڈرامہ کھیلا گیا لیکن اس میں نہ وہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام کے لئے ہندوستان میں پیدا کئے ہیں۔

روس نے بابی مذہب سے رواداری کا برتاؤ کیا اور انہیں عشق آباد میں اپنا پہلا تبلیغی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی انگلستان نے احمدیوں کو دوکنگ میں اپنا پہلا تبلیغی مشن قائم کر کے ویسی ہی رواداری سے کام لیا۔ ہمارے لئے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا روس اور انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بناء پر کیا یا وسعت نظر کی وجہ سے۔ اس قدر تو بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لئے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے۔ اسلام کی اس ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے اس کو سمجھا ہے، یقیناً کامل ہے کہ ان دشواریوں سے وہ زیادہ پاک و صاف ہو کر نکلے گا۔ (6)

اسلام کی تبلیغ کے بارے میں علامہ اقبال کے نقطہ نظر کی سیدندیر نیازی نے بہت عمدہ ترجمانی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام کی صرف یہی خدمت اور مطالبہ نہیں کہ تبلیغ کی جائے بلکہ عقائد کی تبلیغ کے علاوہ یہ اس طرز زندگی کی تبلیغ ہے جس کی اسلام نے نوع انسانی کو دعوت دی اور

امت محمدیہ خیر الابرار قرار پائی۔ اسکے لئے فرد اور جماعت دونوں کا ایک مخصوص اور مسلسل جدوجہد کرنا ضروری ہے ظاہر ہے کہ اس جدوجہد کی حیثیت انفرادی نہیں ہوگی بلکہ سیاسی اور اجتماعی ہوگی تا کہ ہم ایک دوسرے سے اپنے روابط، سیرت کردار اور معاملات کی دنیا میں وہ تبدیلی پیدا کریں جس کا اسلام خواہشمند ہے اور جس کے پیش نظر اس میں ریاست کا وجود لازم ٹھہرتا ہے لہذا اگر تبلیغ اسلام سے مراد یہ ہے کہ ایک دستور حیات کے طور پر اسلام کی تبلیغ ہو تو اس کا بیڑا وہی جماعت اٹھا سکتی ہے جو خود بھی اس پر عمل پیرا ہو ورنہ ناممکن ہے اس میں کوئی معنی پیدا ہوں۔ لیکن جماعت احمدیہ کا تو یہ نقطہ نظر ہی نہیں، سیاست اس کے نزدیک شجر ممنوعہ ہے اور حکومت خواہ کوئی بھی ہو اس کی وفاداری ان کے ایمان کا جزو اعظم ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ زوال پذیر حالت اور فکر و عمل کی غلطیوں کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں وہ اپنے مخصوص عقائد کی چار دیواری میں بند ہیں۔ 1912ء میں جب دو کنگ مشن لندن میں قائم ہوا تو مسلمانوں نے عقیدہ کے اختلاف کے باوجود مالی مدد کی ان کا خیال تھا کہ یورپ نے اسلام قبول کر لیا تو ان کی شکست فتح مندی میں بدل جائے گی۔ اسلام عالمگیر دعوت کا تقاضا فرد اور جماعت سے کرتا ہے اس کی نوعیت محض تبلیغی نہیں عملی اور اجتماعی ہے۔ (7)

علامہ اقبال کے بیان پر اعتراضات

علامہ اقبال کے مئی 1935ء کے بیان پر لاہوری جماعت کے ہفتہ وار اخبار لائٹ لاہور نے تبصرہ کیا کہ علامہ اقبال الہام پر یقین نہیں رکھتے۔ علامہ اقبال نے مدیر لائٹ (محمد یعقوب خان) کی توجہ اپنی کتاب تشکیل نوص 21 کی طرف مبذول کرائی جس میں اس بات پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ وہ الہام کے منکر نہیں لیکن ختم نبوت کے بعد کسی شخص کے الہام کو دین میں حجت نہیں سمجھتے۔ جب ان کی توجہ لائٹ کے اس استفسار پر کہ ہر صدی کے سر پر ایک مجدد آتا ہے مبذول کرائی گئی تو انہوں نے جواب دیا کہ بخاری و مسلم میں یہ حدیث نہیں جو تاریخی عمل کا نہایت حسابی تصور پیش کرتی ہے۔

جب علامہ اقبال کی توجہ ایک دوسرے قادیانی اخبار سن رائز کے ایک خط کی طرف مبذول

کرائی گئی جس میں علامہ کی ایک تقریر کا حوالہ دیکر تناقض خود کا الزام لگایا گیا تھا تو آپ نے جواب میں کہا کہ انہیں افسوس ہے کہ ان کے پاس نہ وہ اصل انگریزی تقریر اور نہ اس کا ترجمہ موجود ہے جس میں جماعت قادیان کو ٹھیکہ اسلامی سیرت کا نمونہ کہا گیا ہے۔ انہوں نے 1911ء یا اس سے قبل یہ تقریر علی گڑھ میں کی تھی اور اس وقت انہیں اس تحریک سے، جسے نتائج کی امید تھی۔ مولوی چراغ علی نے بھی مرزا صاحب کی کتاب براہین احمدیہ کی تصنیف میں ان کی مدد کی تھی۔ کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی اس میں برسوں لگتے ہیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی تنازعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو مرزا صاحب کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ یہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر وہ اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوئے جب ایک نئی نبوت، بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ (8) اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ یہ بیزاری بعد میں بغاوت میں بدل گئی جب انہوں نے خود تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ اگر انکے موجودہ رویے میں کوئی تناقض ہے تو یہ ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ رائے بدل سکے بقول ایمرن صرف پتھر آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔ (9)

واضح رہے کہ جب علامہ اقبال کو علی گڑھ کی تقریر کا مسودہ مل گیا تو انہوں نے 12 اکتوبر 1935ء کو اس پر نوٹ لکھا کہ اس تحریک کی روح اسلام کے خلاف ہے اور یہ آخر کار بہائیت پر اختتام پذیر ہوگی جہاں سے یہ اثر پذیر ہوئی۔

جب علامہ اقبال سے الہام اور مصلحین کے آنے کے امکانات کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے بتایا کہ ختم نبوت کا مقصد ہی یہ ہے کہ روحانی زندگی میں اب ایسا کوئی الہام یا وحی نہیں ہو سکتی جو ذاتی سند کا درجہ رکھتی ہو اور جس کا انکار مستلزم کفر ہو۔ باطنی واردات اور کیفیات کا تجربہ صوفیاء بلکہ غیر مسلموں نے بھی بیان کیا ہے۔

ایک پارسی کا مراسلہ

ایک پارسی مسٹر اے ڈنٹا نے علامہ اقبال کے بیان پر اخبار سٹینٹس میں کلکتہ کو ایک مراسلہ بھیجا۔ 'حرف اقبال' اور اقبال کی تقاریر بیانات اور مضامین کے دیگر مجموعوں میں یہ مراسلہ درج نہیں، علامہ اقبال نے جو جواب دیا ہے وہ موجود ہے۔ اس لئے ہم ڈنٹا کے انگریزی خط کا ترجمہ روزنامہ الفضل سے نقل کرتے ہیں:

”ڈاکٹر اقبال نے اپنی اپیل میں مذہبی موضوع کو سیاسی بازیگاہ میں لانے کی کوشش کی ہے اس پر آپ کے اخبار سٹینٹس میں کا مقالہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی مبصرانہ تلخ نوائی کے مقابلے میں قابل تحسین اعتدال کا مظہر ہے۔ وہ لوگ جنہیں ڈاکٹر صاحب موصوف سے عقیدت ہے اور وہ ان کے جو ہر خداداد کے ثنا خواں ہیں، انہیں یقیناً افسوس ہوا ہوگا کہ انہوں نے اس نوع کی بحث کو اپنی بین الاقوامی شہرت سے وزنی کرنے کی کوشش کی ہے۔ غیر مسلم طبقہ شاید اس سے اتفاق کرے کہ سر محمد اقبال ان تمام واقعات کا جو اسلام کی وحدت ملی پر اثر انداز ہوتے ہیں محاسبہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن جہاں تک ان کے پر زور دلائل کے سیاسی پہلوؤں کا تعلق ہے آپ (ایڈیٹر سٹینٹس میں) نے بہت غیر جانبدارانہ طریق سے انہیں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کے اس مذہبی اختلاف پر جس کے مسلمانوں کی حیات ملی پر اثرات ہو سکتے ہیں مجھے مزید روشنی ڈالنے کی خواہش نہیں اور نہ ہی میں اس سیاسی گورکھ دہندے میں الجھنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد علمی ہے جس کا انحصار صرف دو اصولوں پر ہے۔ اول وہ مجوسی نظریہ جس کے ساتھ سر اقبال نے احمدیت کو وابستہ کیا ہے دوم بحیثیت ایک مذہبی محقق کے مجھے لنگا میں تحریک احمدیت کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے اور ایک دفعہ ان کے جلسہ عام کی صدارت کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ایک غیر مسلم سے ان کا یہ رویہ مذہبی رواداری کا بہترین آئینہ دار ہے۔

مجوسی ثقافت آزادی کے طور پر دین زرتشت سے متعلق ہے۔ گودونوں ایک نہیں۔ بعض کے خیال میں یہ تثلیث و یہودیت دونوں پر ساری و طاری ہے کیونکہ موخر الذکر ادیان کی نمایاں

خصوصیات مجوسی کلچر سے ہی ماخوذ ہیں۔ میں ایک مثال دے کر اسے اور واضح کر سکتا ہوں، دور حاضر کی مذہبی تحقیقات اسے مزید تقویت بخشتی ہے کہ دوزخ، بہشت، وحدت وجود اور جزا و سزا کا مرکزی تخیل یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا مشترکہ تخیل ہے اس کا سرچشمہ دین زرتشت ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حقیقت مختلف ادیان مذکورہ بالا کی عظمت میں سدراہ ہو سکتی ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی اشارہ کیا ہے کہ مجوسی تمدن کا انحصار نسلی خیالات پر تھا۔ حقیقت میں مجوسی قدیم آریاؤں ہی کی ایک شاخ ہیں اور اگر ان کا کلچر سمیٹک (Semitic) قوم پر اثر انداز ہوا تو اس کی وجہ مجوس کا عمیق روحانی تصوف ہے وہی مجوسی جو حکیمان مشرق کے نام سے مشہور ہیں اور جو بائبل کے توسط سے مذہبی دنیا سے متعارف ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شکایت کا لب لباب یہ ہے کہ قادیانیت کی بنیاد چونکہ مجوسی اصول پر استوار کی گئی ہے اس لئے یہ اتحاد ملت کے لئے زہر قاتل ہے۔ مزید برآں میں اور ثبوت دے سکتا ہوں کہ مسلم لٹریچر نے کہاں تک ایرانی اثر قبول کیا۔ روسی فاضل Inostrounger کی تحقیقات خاص طور پر واضح کرتی ہیں کہ ایرانی عنصر تاریخ اسلام میں خارجی اور داخلی طور پر بیش از بیش پایا جاتا ہے اور جہاں تک تحریک احمدیت کا تعلق ہے علامہ اقبال کی عدم رواداری کی حجت بہت ادا اور انسانی ادراک سے بالا ہے۔ اس میں تو مطلق شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس تحریک کا انحصار یقینی طور پر رسول عربی ﷺ اور قرآن مجید پر ہے اور ان لوگوں کو تو اس میں ذرا بھی کلام نہیں جن کو میری طرح احمدیت سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس تحریک کا ابتدائی مراحل میں غیر مسلموں سے تصادم ہوا اور حکومت کو ناگوار حالات کو رفع کرنے کے لئے اپنا اثر استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، یہ دلیل ہے احمدیوں کے جوش اسلامی کی، علیٰ ہذا القیاس مسئلہ اجرائے نبوت جس کو علامہ اقبال نے اسلام کے لئے طوفان مصائب قرار دیا ہے، قادیان نے اس مسئلہ کی صداقت کو نصوص قرآنیہ کی روشنی میں واشگاف کر دیا ہے۔ اگر یہ جماعت اپنا پیغام سب مسلموں اور غیر مسلموں تک پہنچانے کی مدعی ہے تو بھی یہ مقصد سر اقبال کے اپنے بن فریضے سے ہم آہنگ ہے کہ اسلام اقوام گیتی کو متحد کرنا

چاہتا ہے۔

ایک مذہب میں فروغی اختلافات کے بدنتائج کو سمجھنا سہل امر ہے جن کے بھیانک اثرات سے دنیا کا کوئی مذہب نہیں بچ سکا۔ احمدیت کے تاریخی وجود کو دائرہ اسلام سے خارج کرنا امر دیگر ہے اس بارے میں سر محمد اقبال کے معروضے کو تسلیم کرنا روم کے وقار کی خاطر تاریخ انگلستان پر ریفرامیشن کے اثرات کو مسخ کرنے کے مترادف ہے ان چند سالوں میں سلسلہ احمدیہ نے جس روحانی اور جماعتی نشاۃ ثانیہ کا مظاہرہ کیا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اس لیے نتیجتاً ایک صفا باطن انسان یہ امید کر سکتا ہے کہ ہندوستان کے پرستاران توحید احمدیوں کے اسلام کے اندر اور اسلام کی خاطر ایک نئی تحریک کے اجراء کی ضرورت پر صف ماتم نہیں بچھائیں گے برعکس اس کے قادیان جیسی جماعت کی تاریخی زندگی کو کبھی اور کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ (10)

علامہ اقبال نے اس مراسلہ کے جواب میں فرمایا۔

مجھے اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کرنا ہے سوائے اس کے کہ مجھے ان کے مرکزی خیال سے پورا اتفاق ہے یعنی اسلام کی ظاہری اور باطنی تاریخ میں ایرانی عنصر کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ یہ ایرانی اثر اس قدر غالب رہا ہے کہ سپنگلر (SPENGLAR) نے اسلام پر موبدانہ رنگ دیکھ کر اسلام کو ہی ایک موبد مذہب سمجھ لیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب ”تشکیل نو“ میں کوشش کی ہے کہ اسلام پر سے اس موبدانہ خول کو دور کر دوں اور مجھے امید ہے کہ اسی سلسلے میں میں اپنی کتاب ”قرآنی تعلیم کا مقدمہ“ میں مزید کام کر سکوں گا۔ موبدانہ تخیل اور مذہبی تجربہ مسلمانوں کی دینیات، فلسفہ اور تصوف کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں بہت سا مواد ایسا موجود ہے جس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ تصوف کے چند اسکولوں نے جو اسلامی سمجھے جاتے ہیں اس موبدانہ حالات و واردات کو ہی زندہ کیا ہے میں موبد تمدن کو اسلامی تمدن کے بیشمار مظاہرات میں سے ایک مظاہرہ سمجھتا ہوں۔ میں نے اس لفظ کو برے معنی میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس بھی حکومت کا تصور تھا، فلسفیانہ مباحث تھے، حقائق بھی تھے اور غلطیاں بھی لیکن جب تمدن پر زوال آتا ہے۔ تو اس کے فلسفیانہ مباحث،

تصورات اور دینی واردات کے اشکال میں انجماد اور سکون آ جاتا ہے۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو موبد تمدن پر یہی حالت طاری تھی۔ اور تمدنی تاریخ کو جس طرح میں سمجھتا ہوں اسلام نے اس تمدن کے خلاف احتجاج کیا، خود قرآن کے اندر شہادت موجود ہے کہ اسلام نہ محض ذہنی بلکہ مذہبی واردات کے لئے بھی نئی راہ پیدا کرنی چاہتا تھا لیکن ہماری مغانہ وراثت نے اسلام کی زندگی کو کچل ڈالا اور اس کی اصل روح اور مقاصد کو ابھرنے کا کبھی موقع نہ دیا۔ (11)

علامہ اقبال کے بیان پر مسلم پریس کا رد عمل

اخبار سیاست کا تبصرہ

علامہ اقبال کے قادیانیت کے بارے میں بیان پر ہندوستان کے مسلم پریس نے ادارے لکھے۔ غیر مسلم اخبارات و جرائد نے بھی اپنی آراء دیں۔ مسلم اخبارات نے ان کے نظریات اور مطالبات سے اتفاق کیا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے مطالبے کی تائید کی انہوں نے علامہ اقبال کی قادیانیت کے متعلق تنقید کو خراج تحسین پیش کیا لیکن اکاد کا اخبارات نے چند دیگر سوالات بھی اٹھائے مثلاً اخبار سیاست لاہور نے 15-14 مئی 1935ء کی اشاعتوں میں دو ادارے تحریر کئے۔ اخبار کے مدیر سید حبیب 1933ء میں تحریک قادیان کے عنوان سے قادیانیت پر زبردست تنقید کر چکے تھے۔ اس کے بعد بھی وہ قادیانیت کے خلاف مضامین لکھتے رہے۔ ان کے اداریوں کے چیدہ چیدہ نکات یہ ہیں:

- اگر مسیح اور مہدی کے عقیدے کے انکار پر مسلمانوں کا اتفاق رائے حاصل کر لیا جائے تو اس سے احمدیت کو سخت نقصان ہوگا۔

- علامہ اقبال نے حکومت پر مرزائیت نوازی کا الزام لگایا ہے لیکن مختلف مذہبی فرقے چکڑالوی اور مرزائی فرقے کے علاوہ ہندوستان اور انگریزی حکومت کے حلقہ اثر سے باہر پیدا ہوئے لہذا حکومت برطانیہ کی روش کو افتراق بین المسلمین کا سبب قرار دینا کچھ صحیح نظر نہیں آتا۔

علامہ اقبال نے چودھری ظفر اللہ کے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بننے کے بعد قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ کیوں کیا اس سے قبل مرزائیوں کے خلاف علم جہاد کیوں بلند نہ کیا۔

امت مسلمہ میں جو انتشار رونما ہو چکا ہے وہ بحث یا مناظرہ سے نہیں مٹ سکتا۔ علامہ اقبال کو مجادلہ مقاطعہ کی بجائے بحث مباحثہ ترک کر کے سیاسی لحاظ سے متحد ہونے کا ذکر کرنا چاہئے تھا۔ میں مدیر سیاست تحریک قادیان نامی کتاب میں لکھ چکا ہوں اور مرزا محمود نے مقدمہ گورداسپور میں بیان دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں لہذا مرزائی جماعت کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور میں اس معاملہ میں ان کا ہمنوا ہوں۔

علامہ اقبال مختلف تمدنی، سیاسی، علمی اور معاشرتی مجالس میں قادیانیوں کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے، مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں ظفر اللہ کے ساتھ یکساں طور پر بطور مسلمان ممبر کام کرتے رہے اور انہوں نے اعتراض نہ کیا ظفر اللہ کے مسلم لیگ کا صدر بننے پر اعتراض نہ کیا۔ علامہ اقبال لیگ اور کانفرنس کے صدر رہے لیکن انہوں نے اعتراض نہ کیا کہ قادیانی ان مجالس میں بطور مسلمان کیوں شامل ہوتے ہیں۔ قادیان سے ان جماعتوں کو مالی امداد ملی۔ پنجاب کونسل، سائمن کمیشن، اور گول میز کانفرنس میں ظفر اللہ کو بطور مسلمان چنا گیا لیکن انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ ظفر اللہ کے دوش بدوش کام کیا۔ ظفر اللہ کے بھائی سیالکوٹ سے پنجاب کونسل کے رکن بنے، لیکن انہوں نے سیالکوٹ کے مسلمانوں کو یہ مشورہ نہ دیا کہ وہ ایک غیر مسلم کو ممبر منتخب نہ کریں۔ لندن میں ملک معظم کی سلور جوبلی کے موقع پر جو جماعت اس غرض کے لئے قائم ہوئی ہے کہ برطانیہ اور دنیائے اسلام سے تعلقات بہتر ہوں اس میں علامہ اقبال اور ظفر اللہ دونوں بطور مسلمان شامل ہیں۔ کوئی غیر مسلم انگریز اس کا رکن نہیں ہو سکتا اس میں سر آغا خان، امیر عبداللہ والی شرق اردن، سابق ولی عہد ایران، نواب چھتاری، سر عبدالصمد خان، سر عبدالقادر وغیرہ شیعہ سنی آغا خانی سب موجود ہیں اس

لئے جس طرح عام مفاد ملت میں شیعہ سنی وغیرہ مل کر کام کرنے کو تیار ہیں اس طرح مرزائی اور غیر مرزائی مسلمان بھی اتحاد عمل پر آمادہ ہیں اور یہ وہ بات ہے جو ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان قبول کریں اور اپنا اصول عمل بنائیں۔

علامہ اقبال کی تکفیر مرزائیت سے اتفاق کے بعد میرا استدلال یہ ہے کہ نبوت کو تو حید باری تعالیٰ سے بڑھایا نہیں جاسکتا اگر تو حید رسالت سے بالاتر ہے تو علامہ اقبال خدائی کے دعویدار آغا خان کے ساتھ اتحاد عمل کرتے ہوئے کس طرح مرزائیوں سے اتحاد عمل کو ناروا قرار دے سکتے ہیں۔ (12)

ہم گزشتہ صفحات میں بتا چکے ہیں کہ کسی غیر مسلم شخص یا جماعت سے قومی اور اسلامی مفاد کی خاطر سماجی و سیاسی اشتراک عمل یہ ثابت نہیں کرتا کہ ایسا شخص کوئی جرم کر رہا ہے یا وہ اس عقیدے اور مسلک کو درست تسلیم کر رہا ہے۔ یہ وسیع تر قومی مفاد کا تقاضا ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نیرنگی سیاست دوران سے خوب آشنا تھے وہ کسی بھی غیر مسلم ہندو و سکھ کے ساتھ کسی مذہبی بحث و تکرار کے قائل نہ تھے شائستگی کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انہوں نے ملت کی فلاح کے لئے کئی کام کئے۔ انہوں نے بلاوجہ اور بے مقصد کسی کی مخالفت نہ کی بلکہ قادیانیوں نے جب کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران اپنا حقیقی چہرہ دکھایا تو پھر بھی انہوں نے کافی صبر و تحمل اور سوچ بچار کے بعد قادیانیت کے مضمرات سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا اپنا فرض منہی جانا۔

سید حبیب کا اعتراض یہ ہے کہ علامہ اقبال نے ظفر اللہ کے پنجاب کونسل، سائن کمیشن اور پہلی بار وائسرائے کونسل کے ممبر بننے پر یہ اعتراض کیوں نہ کیا کہ سر ظفر اللہ غیر مسلم ہیں ان کو مسلمانوں کی سیٹ نہ دی جائے، اسی طرح مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں قادیانیوں کی بطور مسلمان رکنیت پر آواز نہ اٹھائی اور گول میز کانفرنس میں ان کے بطور مسلمان نمائندہ شمولیت پر کچھ نہ کہا بلکہ ان کے ساتھ مل کر کام کیا۔

شاید سید صاحب کو معلوم نہیں کہ 1917ء کے وائسرائے مانیٹگو کے ذمہ دار حکومت کے قیام کے اعلان کے بعد 1919ء کے ایکٹ سے لے کر 1935ء کے ایکٹ تک مسلمان اپنے سیاسی

حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے اور اپنے مطالبات منوانے کے لئے کانگریس اور انگریز سے برسرِ پیکار تھے انگریز نے جس طرز حکومت اور اقتدار کی منتقلی کے آئینی ڈھانچہ کی نیواٹھائی تھی اس کی حدود قیود کے اندر ہی جدوجہد کی جاسکتی تھی۔ قادیانیوں کی پالیسی یہ تھی کہ وہ مسلمان بن کر مسلمانوں کے سیاسی حقوق پر ڈاکہ ڈالیں اور ان میں حصہ دار بن جائیں۔ مسلمانوں کے کوٹے پر قادیانیوں کو تعینات کرائیں اور مسلمانوں کی سیاسی انجمنوں میں شامل ہو کر اپنے جماعتی مفادات کا تحفظ کریں۔ سر ظفر اللہ انگریز کی مدد اور سر فضل حسین کی اعانت سے مسلمان کہلوا کر ہی اس جدوجہد میں اپنا کردار ادا کر سکتے تھے۔ سردار سنگھ یا گوپی چند بن کر نہیں کر سکتے تھے۔ ایڈیٹر سیاست اس عہد کے سیاسی حالات اور مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کو سامنے رکھتے تو یہ سوال نہ اٹھاتے کہ علامہ اقبال نے اس زمانے میں قادیانیوں کے خلاف کیوں آواز نہ اٹھائی کیا سید صاحب یہ توقع رکھتے تھے کہ علامہ اقبال ظفر اللہ کو صداقت مسیح موعود اور ختم نبوت پر مناظرے کے چیلنج دیتے لیکن ان جیسے سیاسی مدبر اور تعلیم یافتہ شخص سے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ بے وقت اور بلا مقصد کسی فرقے پر تنقید کرتے انہوں نے ہمیشہ قومی اور ملی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا اور اسی مقصد کے لئے نہ صرف قادیانیوں بلکہ دیگر غیر مسلموں سے مناسب حد تک اشتراک عمل میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ پنجاب کونسل، سائنس کمیشن اور گول میز کانفرنسوں میں ظفر اللہ کی شمولیت، انگریز کی پالیسی اور سر فضل حسین کی معاونت کا نتیجہ تھی وہ یونینسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ علامہ اقبال کا اس میں نہ تو کوئی دخل تھا اور نہ ہی ان کا مذہبی بنیادوں پر دیا گیا کوئی بیان ظفر اللہ کی حیثیت پر اثر انداز ہو سکتا تھا جب کہ پورے ہندوستان کے مسلمان ان کو کافر اور غیر مسلم قرار دے رہے تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی خاطر دیگر مسلمان رہنماؤں کی طرح علامہ اقبال نے جو جدوجہد کی وہ قابلِ داد ہے وہ اخلاص پر مبنی تھی انہوں نے مسلم مطالبات کو منوانے کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا اگر وہ قادیان جا کر صدر انجمن احمدیہ یا قادیانی مجلس مشاورت میں ظفر اللہ کے ساتھ بیٹھ کر معاملات سلجھاتے تو ہمیں ضرور اعتراض ہوتا۔

سر فضل حسین اور انگریز کو ظفر اللہ کے قادیانی ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا وہ ان سے اپنا کام لیتا

تھا۔ نہ ہی قادیانیوں کے کفر سے اس کو سروکار تھا اس کے سامنے اپنا مفاد تھا وہ وفادار عناصر سے تعاون کرتا تھا۔ یہ خطرہ تو مسلمانوں کو درپیش تھا کہ قادیانی مسلمان بن کر ان کی نیابت کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال ایسے مواقع پر کوئی بیان جاری کرتے تو وہ ملی مفاد کے خلاف ہوتا وہ سیاسی بصیرت رکھتے تھے اور وسیع النظر تھے۔ فضول بحث و مناظرے کے عادی نہ تھے۔ ان سے یہ توقع نہ کی جاسکتی تھی کہ وہ آئینی جدوجہد کا رخ قادیانی مسئلہ کی طرف موڑ کر ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیتے۔ مناسب سیاسی فضا میں انہوں نے اپنے بیان میں قادیانیت کے دینی اور سیاسی پہلو کو اجاگر کر کے ان خطرات کی نشاندہی کی جو نئے سیاسی تقاضوں کے تحت قادیانیوں سے مسلمانان ہند کو درپیش ہو سکتے تھے۔ انہیں سر ظفر اللہ سے کوئی ذاتی پر خاش نہ تھی بلکہ وہ ان کا گورنمنٹ کالج لاہور میں شاگرد رہ چکا تھا دونوں سیالکوٹ سے تعلق رکھتے تھے دونوں بار ایٹ لا اور وکیل تھے معاشرتی سطح پر ان کے ہندوؤں اور سکھوں کی طرح قادیانیوں سے بھی خاص حد تک تعلقات تھے۔ بلکہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطاء محمد قادیانی تھے اور ان میں اور ان کے بیٹے اعجاز احمد میں جو خوبیاں تھیں ان کے وہ معترف تھے۔ انہوں نے کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران قادیانیت کا حقیقی چہرہ دکھ لیا تو پھر انہوں نے مسلمانوں کو اس خطرے کے حقیقی مضمرات سے آگاہ کیا انہوں نے بلا ضرورت، بے وقت اور بلا مقصد کوئی کام نہ کیا جو نہ تو نتیجہ خیز ہو سکتا تھا اور نہ ہی مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کا ضامن! دراصل وہ مسلمانان پنجاب کو قادیانی۔ یونینسٹ گٹھ جوڑ اور نئے سیاسی تقاضوں خصوصاً ایکٹ آف 1935ء کے بعد صوبائی خود مختاری جیسے مسائل کے حل کے لئے تیار کر رہے تھے۔ ان کی نظر مسلم پنجاب اور ابھرتی ہوئی مسلم لیگ کے استحکام اور تنظیم نو کی طرف تھی۔ اس لئے سید حبیب کے یہ اعتراض اس عہد کے ٹھوس حقائق، علامہ اقبال کے شائستہ طرز عمل اور مستقبل کے پنجاب اور ہندوستان میں ابھرنے والے سیاسی تقاضوں کی روشنی میں مسترد کرنے کے قابل ہیں۔

روزنامہ حق لکھنؤ کا ادارہ

’تاریخ احمدیت‘ میں یوپی کے ایک غیر معروف اخبار حق لکھنؤ کے 27 جون 1935ء کے

اداریہ کو نقل کیا گیا ہے اس کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے شعر میں کہا ہے

فرقہ بندی ہے اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

- فرقہ بندی اور ذات پات کے امتیاز سے اجتناب کے باوجود انہوں نے سیاسی مشورہ دیا ہے کہ قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھیں اور حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ قانونی حیثیت سے بھی احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھے۔

- ہم ڈاکٹر سر محمد اقبال سے اتفاق کرتے ہیں کہ عام مسلمانوں اور احمدیوں میں اعتقادات کا بہت بڑا اختلاف ہے جس کے باعث ان میں اتحاد عمل ناممکن سا نظر آتا ہے لیکن مختلف فرقے بھی ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں اس لئے ہر کلمہ کو کو مسلمان سمجھا جائے اس طرح احمدیوں کو بھی دائرہ اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جاسکتا جب کوئی خود اپنے آپ کو مسلمان کہے تو ہم اسے کیونکر مسلمان نہ سمجھیں؟

- موجودہ سیاسی حالت میں ہر جماعت اپنی شیرازہ بندی، تنظیم اور تحفظ کی فکر میں ہمد تن مصروف ہے ہندو اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں اگرچہ وہ ان کے بغیر اکثریت میں ہیں وہ ڈرتے ہیں کہ ان کو مسلمان یا کوئی اور اقلیت اپنے ساتھ ملا کر اکثریت نہ بن جائے۔ احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی تحریک سیاسی اعتبار سے نا سمجھی، نا عاقبت اندیشی اور تدبر کے منافی ہے ان کو مسلمانوں سے علیحدہ نہ کرنے میں فائدہ ہے۔

- احمدیوں کو الگ نہ کر کے ہم اپنی مرضی کے لوگ مجالس قانون ساز میں منتخب ہونے دیں گے یا نہ ہونے دیں گے۔ لیکن ان کو الگ کرنے سے ان کی نشستیں علیحدہ ہو جائیں گی اور وہ ان مجالس قانون ساز میں بلا روک ٹوک جاسکیں گے۔ پنجاب میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ 56 فی صد ہیں اگر دس فیصد احمدیوں کو نکال دیا جائے تو وہ 46 فی صد رہ جائیں گے اور سکھ، ہندو اور احمدی مل کر اکثریت ہو جائیں گے۔ حکومت نے جدید اصلاحات کے تحت مسلمانوں

کے لئے 51 نشستیں رکھی ہیں ان میں سے دو نشستیں احمدیوں کو ضرور مل جائیں گی۔ اور کسی نہ کسی وقت ان کی جماعت کے رکن کا وزیر ہو جانا بھی بعید از امکان نہیں اس لئے احمدی فائدہ میں رہیں گے اور مسلمانوں کو نقصان ہوگا احمدیوں سے مذہبی طور پر اتحاد عمل ناممکن ہے لیکن سیاسی طور پر ان سے تعلقات رہ سکتے ہیں۔ (13)

روزنامہ حق نے ایک تو مسلمانوں کی باہمی روش تکفیر کا سہارا لیا ہے حالانکہ یہ فروعی اختلافات پر مبنی ہے جب کہ مسلمانوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا مرزا غلام احمد کی وحی نبوت کی بنیاد پر ہے اور یہ بنیادی فرق ہے۔ اچھوت یا دلت آج بھی ہندوستانی معاشرے کا حصہ نہیں بن سکے۔ ڈاکٹر امبیڈکار کی شخصیت اور تحریرات اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کے انتہائی تعصب کی بناء پر بدھ مت اختیار کر لیا تھا۔ مہاتما گاندھی بھنگی کالونی دہلی جا کر اچھوتوں کے ساتھ مل بیٹھتے رہے لیکن کیا اچھوتوں نے انہیں اپنا رہنما مانا۔ ہندو جہاں ضرورت پڑتی اچھوتوں کو ساتھ ملا کر اپنی اکثریت ظاہر کرتے اور جب ضرورت ختم ہو جاتی پھر اپنے موقف سے پھر جاتے۔ اگر روزنامہ حق کی دلیل مان بھی لی جائے تو پنجاب کی حد تک بھی قادیانیوں کی ایک یا دو نشستوں کا تحفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان کی تعداد 1921ء کی مردم شماری کے مطابق محض 56 ہزار تھی اور ووٹ کے اہل افراد اس سے بھی کم تھے اس کے علاوہ مسلمانوں کے سیاسی مفادات کا دائرہ پنجاب تک نہیں پورے ہندوستان پر محیط تھا۔ جہاں تک مسلمانوں کا ان سے سیاسی اتحاد عمل کا سوال ہے تو 1936ء میں قادیانی کھلم کھلا کانگریس کے ہمنوا بن گئے وہ مسلم لیگ کی مخالفت کرتے رہے۔ پنجاب میں وہ جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفاد کے لئے کوشاں یونینسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا اور دست بازو تھے۔ 1940ء سے 1947ء تک وہ مطالبہ پاکستان کے خلاف اور اکھنڈ (متحدہ) بھارت کے حامی تھے۔ 1945-46ء کے انتخابات میں انہوں نے یونینسٹ، آزاد زمیندار لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ انتخابی تعاون کیا، ساتھ ساتھ مسلم لیگ سے تعاون کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے۔ (14) اور آخر وقت تک پاکستان کے مخالف رہے ایسی جماعت جس کے عمومی مقاصد اور سیاسی

اغراض اس کے جماعتی اور گروہی مفادات کے تابع ہوں وہ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کی تکمیل میں ان کا ساتھ کیسے دے سکتی ہے۔ 1974ء میں غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مسلمان اور دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں اور اپنی مخصوص مذہبی روش اور سیاسی پالیسی پر کاربند ہیں۔

یوں تو علامہ اقبال کے بیان کے حق میں تمام مسلم پریس تبصرے اور ادارے شائع کر رہا تھا۔ لیکن سر مرزا ظفر علی رینا رڈنج ہائی کورٹ لاہور نے قادیانیوں کے خلاف بعض اہم مضامین لکھے۔ 22 اگست 1935ء کو ان کا ایسٹرن ٹائمز لاہور میں ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں انہوں نے احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کے دلائل دیئے۔ ان کا کہنا تھا۔

1۔ قادیانیوں نے خود اپنا الگ تشخص، مذہبی مقرر کیا ہے۔

2۔ مخالفت احمدیوں اور احرار یوں کے مابین محدود نہیں بلکہ احمدیوں اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک عرصے سے جاری ہے جس کی ذمہ داری تمام تر احمدیوں پر عائد ہوتی ہے۔ ان کے عقائد اسلام کے خلاف اور اشتعال انگیز ہیں۔

3۔ مرزا صاحب نے مسلمانوں کو گالیاں دیں، بد ذات فرقہ مولویوں کے الفاظ استعمال کئے۔ حضرت عیسیٰؑ کی شان میں گستاخیاں کیں اور دیگر انبیاء کی ہتک کی۔ قادیانیوں کے منفی کردار اور ان کے اسلام دشمن عقائد کی بنا پر مرزا ظفر علی کا استدلال تھا کہ انہیں مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے (15) اس مطالبے کی مزید تائید مشہور مترجم قرآن علامہ عبداللہ یوسف علی نے ذاتی سطح پر کی اور کے۔ ایل گابا نے اسمبلی میں آواز اٹھائی۔

علامہ اقبال کے بیان پر قادیانی رد عمل

علامہ اقبال کے بیان پر مجموعی قادیانی رد عمل پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم مرزا محمود کے ایک خطبے کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ احمدیت کی مخالفت کا کس طرح

تدریجی ارتقاء ہوا اور کون کون سے لوگ اس میں شامل ہوتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے کے تمام طبقات قادیانیت کی کسی نہ کسی رنگ میں مخالفت کرتے چلے آ رہے تھے اور اس کو مسلمانوں اور اسلام کے لئے ایک مذہبی اور سیاسی خطرہ سمجھتے تھے۔

قادیانیت کی مخالفت کا تدریجی ارتقاء

مرزا محمود احمد فرماتے ہیں:

احمدیت کی مخالفت میں پہلے احراری تھے پھر احرار کی جماعت میں امراء ذاتی بغض و عناد نکالنے اور ذاتی فوائد حاصل کرنے کے لئے شامل ہوئے پھر پیروں، گدی نشینوں اور اخبار نویسوں کی ایک جماعت ان کے اندر شامل ہو گئی انہوں نے اس جنگ کو اخباروں اور تقریروں کے ذریعے ایسے گوشوں اور کونوں میں پہنچانا شروع کیا جہاں تک اس کا پہنچنا پہلے محال نظر آتا تھا۔ بے منافقین کی جماعت شامل ہو گئی۔ جمیعتہ العلماء ہند اس وقت تک خاموش تھی کیونکہ اس کے لیڈروں کو احراریوں کے سرکردہ لوگوں سے بغض و عناد ہے مگر جب اس نے دیکھا کہ یہ مسئلہ اہمیت اختیار کرتا جاتا ہے اور مسلمانوں کی ایک خاص تعداد کی توجہ اس طرف ہے تو یہ خیال کر کے کہ ایمانہ ہو جماعت احمدیہ کو کچلنے کا سہرا احراریوں کے سر پر ہے اس نے بھی اعلان کر دیا کہ مسلمانان عالم کے سامنے اس وقت سب سے بڑا فتنہ جماعت احمدیہ ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کا استیصال کریں۔ جب اس زور و شور سے اخبارات نے جماعت احمدیہ کا مقابلہ ہوتے دیکھا تو ان میں سے آریہ سماج کے اخبارات بھلا کہاں خاموش رہ سکتے تھے وہ بھی اٹھے اور ہماری جماعت کی مخالفت میں لگ گئے۔ قادیان کے آریہ اور سکھ بھی ان میں شامل ہو گئے۔

ہندوستان کے سیاسی لیڈر ابھی تک خاموش تھے بلکہ کہنا چاہتے تھے کہ ان کا مقصد یہ رہا تھا کہ ہمیں فتنہ فساد اور آپس کے تفرقے سے بچنا چاہئے اسی طرح اعلیٰ عہدیدار خاموش تھے یا کم از کم ظاہر میں خاموش تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا یہ طوفان مخالفت سرد ہونے میں نہیں آتا اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے تو انہوں نے کہا ہم پیچھے کیوں رہیں اس خیال کا آنا تھا کہ سر مرزا ظفر علی صاحب نے ایک

بیان شائع کر دیا پھر ڈاکٹر سراقبال کو خیال آ گیا کہ میں کیوں پیچھے رہوں اور اب آخر (1935ء) میں علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب جو ہمیشہ ان باتوں سے الگ رہتے تھے بول اٹھے اور سمجھا کہ اسلامیہ کالج کا پرنسپل ایسی باتوں میں کیوں دخل نہ دے اور کس لئے جماعت احمدیہ کے خلاف اپنی رائے کا اظہار نہ کرے اور پھر اس موقع سے عیسائیوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور وہ بھی ہمارے مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے۔ (16)

علامہ اقبال کے بیان پر قادیانی اور لاہوری جماعت کی تنقید

علامہ اقبال کی ذات اور ان کے مضامین کے خلاف الفضل قادیان، ریویو اور لاہور جماعت کے پیغام صلح، لائٹ وغیرہ نے بہت کچھ لکھا اور مسلسل لکھتے رہے۔ ان کو یہ بنیادی مسئلہ درپیش تھا کہ علامہ اقبال کے حقیقت پسندانہ دلائل کا کیا جواب دیا جائے۔ علامہ اقبال نے ان کی دکھتی رگ کو چھیڑا تھا۔ انہوں نے اپنے دلائل کی بنیاد دھوس حقائق اور قادیانیوں کے مسلمہ معتقدات پر اٹھائی تھی۔ اگر یہ کوئی مذہبی بحث ہوتی، مرزا صاحب کی صداقت ثابت کرنے کا سوال ہوتا یا محمدی بیگم سے نکاح کی پیش گوئی کے پورا ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ ہوتا تو قادیان کے تنخواہ دار مبلغ دلائل اور تاویلات کے انبار لگا دیتے لیکن یہاں سوال مختلف تھا مرزا محمود گذشتہ 20 سالوں (1915-1935ء) سے خود مرزا صاحب کی نبوت، ان کی نبوت تسلیم نہ کرنے والے عامۃ المسلمین کی تکفیر، ان کی معاشرتی علیحدگی اور ایسے دیگر اسلام مخالف رویوں کا اظہار کر رہے تھے۔ ان مسلمہ عقائد کے مضمرات نہ ماننے کا کوئی جواز نہ تھا انہیں کو سامنے رکھ کر علامہ اقبال نے مسلم معاشرے میں ختم نبوت کی تمدنی اہمیت اور ہندوستان میں اسلامی اقدار کے تحفظ کی ضرورت بیان کی انہوں نے ایسے ناقابل تردید حقائق پیش کئے جن سے نہ تو انکار ممکن تھا نہ فرار اس لئے قادیانی جماعت علامہ اقبال کے دلائل کے مقابلے میں روایتی مذہبی مباحث اور غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے مطالبے کے سیاسی عواقب و عوامل پر زور دیتی رہی اور یہ تبصرے اس زمانے کے سیاسی حالات کی روشنی میں کئے گئے جواب قصہ پارینہ ہیں۔ جہاں تک لاہوری جماعت کا تعلق تھا وہ

ختم نبوت کے قائل ہونے کی دعویٰ دار تھی اور تکفیر مسلمین سے انکار کرتی تھی اس لئے وہ براہ راست اس زد میں نہ آتے تھے۔ مجدد اور مسیح موعود جیسے عقائد میں ان کے لئے میدان موجود تھا لیکن علامہ اقبال کے مضمون کا مرکزی نقطہ عقیدہ ختم نبوت تھا۔ علامہ اقبال کی مخاطب دراصل قادیان جماعت تھی۔ چونکہ انہوں نے مرزا صاحب کے نفسیاتی تجزیے کی بات کی تھی اور ان کو مذہبی سٹے باز کہا تھا، اس لئے لاہوری بھی اس بحث میں کود پڑے اور قادیانیوں کی گذشتہ 20 سالہ مخالفت کو بھلا کر ان کے ہمنوا بن بیٹھے۔ ہم نے 1935ء کے بعد شائع ہونے والے قادیانی تبصروں میں سے صرف ان کا انتخاب کیا ہے جن میں کوئی قابل غور بات ہے یا مرزا محمود کے خطبہ اور مضمون کو ان کی اہمیت کے باعث زیر بحث لائے ہیں ورنہ الفضل کی فائلوں میں لایعنی دلائل اور رطب دیا بس کی کمی نہیں!

مرزا محمود احمد کا خطبہ 24 مئی 1935ء

قادیانی جماعت کے خلیفہ مرزا محمود احمد نے 24 مئی 1935ء کا پورا خطبہ جمعہ علامہ اقبال کی مخالفت کے لئے وقف کر دیا۔ اس کے اہم نکات یہ ہیں۔

1- علامہ اقبال نے انہیں کشمیر کمیٹی کا صدر کیوں مقرر کیا جو اسلامی کمیٹی تھی۔ انہوں نے کیوں 1931ء میں احمدیوں کو مسلمان سمجھا اور اب ان کو کیوں محسوس ہوا کہ احمدیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دینا چاہئے۔

2- انہیں تعجب ہے کہ علامہ اقبال جیسے مسلمانوں کی ایک جماعت کے لیڈر، فلاسفر، شاعر نے جو نہایت عقل مند انسان ہیں انگریزی حکومت پر یہ اعتراض کیوں کیا کہ اس نے احمدیوں کو کیوں پنپنے دیا شروع ہی میں اس تحریک کو کیوں نہ کچل دیا۔ برطانوی حکومت سے رومی حکومت زیادہ غفلت مند تھی کہ انہوں نے مسیح ناصری کو صلیب پر لٹکایا۔ انگریزوں نے اتنی جرات بھی نہ دکھائی اور بناوٹی طور پر بھی حضرت مرزا صاحب کو سزا نہ دی۔

3- مسلمانوں کا ایک طبقہ ہماری دشمنی میں بہت بڑھ گیا ہے لیکن وہ جماعت احمدیہ کو ذرہ بھر بھی

نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ (17)

مرزا محمود احمد کا مضمون 8 جولائی 1935ء

مرزا محمود احمد نے 'ڈاکٹر سر محمد اقبال اور احمدیہ جماعت' کے عنوان سے ایک مضمون الفضل 8 جولائی 1935ء کی اشاعت میں شائع کرایا۔ اس کو 18 جولائی 1935ء کو ایک ٹریکٹ کی صورت میں جاری کیا گیا۔ فرماتے ہیں۔

- پہلے علامہ اقبال جماعت احمدیہ سے تعلق، موافقت اور مواخات رکھنا برا نہیں سمجھتے تھے۔ 1911ء میں فرقہ قادیانی کو پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیلہ نمونہ کہتے تھے۔ اب 1935ء میں احمدیت کو بہائیت سے بھی بدتر کہتے ہیں۔ وہ بہائیت جو قرآن کو منسوخ اور بہا اللہ کو ظہور الہی کہتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کو فضیلت دیتی ہے۔ گویا ڈاکٹر اقبال کے نزدیک اگر ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو منسوخ قرار دیتا قرآن کریم سے بڑھ کر تبسم لانے کا مدعی ہوتا نمازوں کو تبدیل کر دیتا اور قبلہ کو بدل دیتا ہے اور نیا حکم بناتا ہے اور اپنے لئے خدائی کا دعویٰ کرتا ہے حتیٰ کہ اس کی قبر پر سجدہ کیا جاتا ہے تو بھی اس کا وجود برا نہیں مگر جو شخص رسول کریم ﷺ کو خاتم النبیین قرار دیتا، آپ کی تعلیم کو آخری تعلیم بتاتا قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرکت کو آخر تک خدا تعالیٰ کی حفاظت میں سمجھتا ہے، اسلامی تعلیم کے ہر حکم پر عمل کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے اور آئندہ کے لئے سب روحانی ترقیات کو رسول کریم ﷺ کی فرمانبرداری اور غلامی میں محصور سمجھتا ہے وہ برا اور بایکاٹ کرنے کے قابل ہے۔ احمدی سر محمد اقبال اور ان کے ہمنواؤں کو روحانی بیمار قرار دے کر انہیں اپنے علاج کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور ان کے ایمان کی کمزوریوں کو ان پر ظاہر کرتے ہیں۔

- سر اقبال صاحب اس عذر کی پناہ نہیں لے سکتے کہ بہائی منافق نہیں احمدی منافق ہیں۔ بہائی کھلے بندوں اپنے مذہب کی تلقین نہیں کرتے، اپنی کتب چھپاتے ہیں اور ہر ملک میں الگ

الگ عقائد پیش کرتے ہیں لیکن احمدی ایسا نہیں کرتے سر محمد اقبال کو یہ بات معلوم ہے ان کے والد مرحوم احمدی تھے ان کے بڑے بھائی عطا محمد احمدی ہیں ان کے اکلوتے بھتیجے اعجاز احمد سب حج احمدی ہیں ان کے خاندان کے کئی افراد احمدی ہیں۔ اس اعلان کے شائع کرتے وقت وہ (عطاء محمد) ان کی کوٹھی تعمیر کر رہے ہیں۔ کیا سر محمد اقبال صاحب نے ان کی رہائش کے ایام میں انہیں منافق پایا تھا یا خود اپنی زندگی سے زیادہ پاک زندگی ان کی پائی تھی ان کے سکے بھتیجے شیخ اعجاز احمد ایسے نیک نوجوان ہیں کہ اگر سر اقبال غور کریں تو یقیناً انہیں ماننا پڑے گا کہ ان کی اپنی جوانی اس نوجوان کی زندگی سے سینکڑوں سبق لے سکتی ہے۔

مسلمان سوچیں کہ ایک شخص جو اپنے احمدی بھائی کو بلوا کر اس سے کوٹھی بنواتا ہے دوسرے مسلمانوں کو ان کے بائیکاٹ کی تعلیم دیتا ہے کہاں تک لوگوں کے لئے رہنما بن سکتا ہے اور اسی طرح وہ شخص جو رسول کریمؐ کی ذات پر کھلا حملہ کرنے والے کو اچھا قرار دیتا ہے کہاں تک مسلمانوں کا خیر خواہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ (18)

مرزا محمود کے خطبے اور مضمون میں علامہ اقبال کے بیانات کی بنیادی حقیقتوں اور ان کے دلائل کو چھیڑا تک نہیں گیا۔ نہ ہی ایسی واضح دلیل پیش کی گئی ہے جس سے علامہ اقبال کے قادیانیت کے بارے میں نظریات اور ان کا غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ غلط قرار دیا جائے۔ یہ خطبہ اور مضمون عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثالیں ہیں۔ لاہوری احمدی کئی سال سے اپنی تحریروں میں یہ الزام لگاتے چلے آ رہے ہیں کہ قادیانیوں کے موجودہ عقائد نبوت، تکفیر وغیرہ اسلام کے سخت خلاف ہیں اور قادیانیوں کو ان عقائد کی بناء پر بھائیوں کی طرح یا تو اسلام اور مسلمانوں سے بالکل الگ ہونا پڑے گا یا عقائد میں توازن، معقولیت اور اصلاح پیدا کر کے ان میں ایک فرقہ کے طور پر شامل ہونا پڑے گا۔ (19) لیکن وہ اپنے اعتقادات پر قائم ہیں اور اسلام کی شکست و ریخت کر کے مسلمانوں کے اندر سے ایک الگ امت تشکیل دے رہے ہیں دینی ارتداد کا زہر پھیلانے کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی طور پر مسلمانوں کی بیخ کنی اور یورپ کے باطل عزائم کی تکمیل میں اپنی ترقی

اور بقا کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

امیر جماعت احمدیہ لاہور کا جواب 1935ء

مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور نے ایک پمفلٹ میں علامہ اقبال کے بیان کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

- سر محمد اقبال نے درست کہا ہے کہ امت مسلمہ کا اتحاد عقیدہ ختم نبوت پر مبنی ہے۔ اجرائے نبوت کا عقیدہ حضرت محمد ﷺ کے مشن کی عالمگیر حیثیت کے منافی ہے۔ قادیانیوں سے ان کی جماعت کا نبوت اور اس کے متعلقہ مسائل پر اختلاف ہے۔

- اسلام سے قبل انبیاء کی پے در پے آمد کا عقیدہ مجوسیت کی پیداوار نہیں، یہود مسیح کی آمد کے منتظر تھے۔

- اس بحث میں پڑے بغیر کہ مرزا صاحب نے نبوت کا دعویٰ کیا یا نہ کیا میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ میں اکتوبر 1934ء میں ڈاکٹر اقبال کی عیادت کو گیا۔ ڈاکٹر اقبال نے بتایا کہ وہ اور سر فضل حسین 1904ء میں مرزا صاحب سے ملے تھے۔ مرزا صاحب نے سر فضل حسین کے سوال پر کیا وہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہتے ہیں، نفی میں جواب دیا تھا۔ (20)

- مرزا صاحب کا غیر احمدیوں کے جنازے پڑھنے کے متعلق بھی یہ موقف تھا۔ (21)

- اگر ختم نبوت کے تحت کوئی نیا نبی نہیں آ سکتا تو پرانا نبی (مسیح ناصری) بھی نہیں آ سکتا یہی جماعت لاہور کا عقیدہ ہے۔

- آمد مسیح، دجال اور یاجوج ماجوج کے بارے میں مستند احادیث کا انکار ممکن نہیں۔ مرزا صاحب نے مسیح ناصری کے مثیل ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہود مسیح کی آمد سے پہلے ایلیاہ (الیاس) کی آمد کے منتظر تھے۔ مسیح نے بتایا کہ یوحنا (یحییٰ علیہ سلام) ایلیاہ ہے۔ (22) ایسا شخص مجدد اور محدث ہوتا ہے اس کو استعارے کے طور پر نبی کہتے ہیں اس کا الہام خدا کا حکم نہیں ہوتا۔

- حدیث بخاری میں ہے جو تمہاری طرح نماز پڑھے، تمہارے قبلہ کی طرف منہ کرے، تمہارا

ذبیحہ کھالے وہ مسلمان ہے۔ احمدی (چاہے ان کا مرکز قادیان ہو یا لاہور) ایسا ہی کرتے ہیں اس لئے ان کو کافر نہیں کہا جاسکتا، ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ (23)

علامہ اقبال نے واضح طور پر لاہور جماعت کو کافر نہیں کہا لیکن وہ دونوں کو مٹانے کے حق میں ہیں۔

سر محمد اقبال نے مسلمانوں اور قادیانیوں کے اختلافات میں حکومت کو مداخلت کی دعوت دی ہے۔ کیا ان کا خیال ہے حکومت ہر مذہب کے کفر کے متعلق قوانین بنائے ایسا قانون مسلمان چاہے بنوالیں کیونکہ وہ رواداری کے قائل نہیں۔ حکومت علماء کے شغل تکفیر کے باعث منتشر مسلمانوں کو متحد نہیں کر سکتی نہ یہ موجودہ دور میں ممکن ہے۔

سر محمد اقبال نے رواداری کی تلقین کی ہے لیکن مسلمانوں نے احمدیوں کو سب و شتم کا نشانہ بنایا ان کا بائیکاٹ کیا اور ان پر ظلم کیا۔ تعداد کے لحاظ سے ہر ہزار مسلمانوں میں ایک شخص احمدی ہے۔

اسلام میں رواداری اور غیر مسلموں کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ سر محمد اقبال حضرت مسیح اور منصور کو سولی چڑھانے کو درست سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں قادیان کے ولی (مرزا صاحب) کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا لیکن انہوں نے اس مختصر جماعت کے پیروکاروں کو ٹھیکہ اسلامی سیرت کا نمونہ بھی کہا تھا۔

پہلے بیان میں انہوں نے حکومت سے احمدیوں کو کچلنے کا مطالبہ کیا پھر غور کیا اور کہا انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

ایک وقت کے کافر آئندہ کے ولی تسلیم کئے گئے جیسے شیخ احمد سرہندی تھے۔ ممکن ہے مرزا غلام احمد جنہوں نے اشاعت اسلام کے لئے ایک تحریک کی بنیاد رکھی آئندہ کسی زمانے میں ولی مان لئے جائیں۔

مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور یہ بات تو تسلیم کرتے ہیں کہ ختم نبوت کا منکر کافر ہے اور

قادیانی اجرائے نبوت اور تکفیر مسلمین کے مجرم ہیں لیکن اس کے ساتھ قادیانیوں کو کافر قرار نہ دینے کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ (24) یہی بات قادیانی کرتے ہیں وہ لاہوریوں کی سخت ترین مخالفت کے باوجود ان کو اس طرح کافر قرار نہیں دیتے جیسے وہ باقی مسلمانوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج کہتے ہیں۔

اس پمفلٹ میں علامہ اقبال کے بنیادی دلائل کا کوئی جواب نہیں، روایتی قادیانی دلائل اور جماعتی موقف کو بیان کیا گیا ہے۔ کیا لاہور جماعت کا یہ موقف مرزا صاحب کے الہامات اور قادیانی جماعت کے اس کے رد میں شائع شدہ لٹریچر کے بعد تسلیم کیا جاسکتا ہے اسی لئے مسلمانوں نے ان کو اپنے قریب آنے کا موقع نہ دیا اور یہ بھی آخر کار غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی زد میں آگئے۔ یہ قادیانیوں اور مسلمانوں دونوں کو اپنی تاویلات باطلہ سے دھوکہ دیتے ہیں اور خود بھی فریب خوردہ ہیں۔ لاہور جماعت کے ترجمان اخبار لائٹ لاہور کے ایڈیٹر مولوی محمد یعقوب خان کا بیان ہے کہ ان کی سیدنذیر نیازی سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مرزا صاحب نے ان پر ایمان نہ لانے والوں کو کافر نہیں کہا اس کے علاوہ علامہ نے یہ بھی فرمایا کہ ان کا جو بیان اخبارات میں چھپا ہے اس کا جماعت لاہور کی طرف روئے سخن نہیں تھا، نہ ہی مرزا صاحب کے معتقدات پر تبصرہ منظور تھا۔ ایڈیٹر لائٹ کہتے ہیں کہ اس سے قبل ان کے معزز دوست راجہ حسن اختر صاحب نے بھی یہی فرمایا کہ اقبال نے کہا ہے کہ ان کے بیان کا جماعت لاہور سے تعلق نہیں اور نہ ہی مرزا صاحب کی شخصیت سے ہے بلکہ ان کے سامنے وہ احمدیت ہے جس کا نقشہ آج کل (1935ء) قادیانیت کی شکل میں دنیا میں پیش ہو رہا ہے۔ (25)

مولوی محمد یعقوب خان ایک طویل عرصے تک لائٹ لاہور کے مدیر رہے۔ 1935-36ء میں جب علامہ اقبال کے قادیانیوں کے متعلق بیانات شائع ہوئے تو انہوں نے ان پر کئی اعتراضات کئے اور لاہوری جماعت کے عقیدے کا دفاع کرنے میں پیش پیش رہے۔ زندگی کے آخر سالوں میں انہوں نے مرزا ناصر احمد قادیانی خلیفہ سوم کی بیعت کر لی اور لاہور جماعت سے الگ ہو گئے۔

اس زمانے میں لاہور جماعت نے بعض پمفلٹ شائع کئے اور ان پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی کہ انہوں نے قادیانی عقیدہ اپنا لیا جس کے خلاف وہ مسلسل لکھتے رہے تھے۔ علامہ اقبال نے قادیانیوں کے متعلق جو کچھ کہا تھا وفات سے قبل وہ اس کا موردِ ٹھہرے۔

اسی طرح جماعت لاہور کے مناظر اختر حسین گیلانی تھے انہوں نے 1942ء میں علامہ اقبال کے خلاف ایک طویل تقریر کی جس کو 1944ء میں لاہور جماعت نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ 1937ء میں لاہور جماعت نے قادیانیوں سے راولپنڈی میں جو مباحثہ کیا اس میں وہ لاہوری مناظر تھے۔ وہ علامہ اقبال سے ملتے رہتے تھے۔ انہوں نے پاکستان بننے کے بعد جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے سابقہ موقف سے پھر گئے۔ وہ راولپنڈی میں انشورنس کا کام کرتے تھے۔

لاہوری جماعت کے سرکردہ مصنف ممتاز احمد فاروقی کی کتاب فتح حق اور اس کا جو جواب قاضی نذیر لاکل پوری نے غلبہ حق کے نام سے دیا، دونوں کتابیں لائق مطالعہ ہیں۔ ان سے دونوں جماعتوں کے اندرون خانہ حالات پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔

ختم نبوت

علامہ اقبال نے اپنے خطبات مدراس میں ختم نبوت کے عقیدے کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے پے در پے انبیاء مبعوث فرمائے اور ان کو وحی کے ذریعے اپنا پیغام دیا۔ وہ وحی جو پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئی وہ ہر لحاظ سے اکمل تھی اس لئے مزید وحی کی ضرورت نہیں اور وہ خاتم الانبیاء اور نبی آخر الزمان ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کا دینی پیشوائی کو تسلیم نہ کرنا، قرآن کا عقل و تجربے پر بار بار زور دینا، کائنات فطرت اور تاریخ عالم کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرانا یہ سب تصور خاتمیت کے مختلف پہلو ہیں۔

ختم نبوت کے بعد باطنی واردات کا خاتمہ نہیں ہوا البتہ انسانی تاریخ میں ہر اس شخص اختیار کا خاتمہ ہو گیا جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا سرچشمہ مافوق الفطرت (وحی) ہے اور اس کی اطاعت لازم ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔ اب انسان اپنے عقل و مشاہدے سے حاصل شدہ علم اور شعور کی روشنی میں اپنی زندگی کا نصب العین مقرر کر سکتا ہے یعنی اب کسی نئی وحی کی جگہ انسانی عقل اور مشاہدے نے لے لی ہے۔ الہام کشف اور دیگر باطنی واردات کا دروازہ کھلا ہے لیکن وحی محمدیؐ کے بعد یہ حجت نہیں، یہ ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ ان واردات کو قرآنی وحی کی روشنی میں پرکھنا ضروری ہے اگر یہ الہامات قرآن کے خلاف ہیں تو اضعاث الاحلام ہیں اور قابل رد ہیں اگر قرآن کے مطابق ہیں تو قرآنی احکامات پہلے سے موجود ہیں اس لئے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی سوشل مفہوم یا وقعت نہیں اور اس کی حیثیت ایک سماجی۔ سیاسی ادارے social-political institution کی نہیں اور نہ ہی یہ ایسے ادارے کی بنیاد بن سکتا ہے جیسا کہ قرآنی وحی تقاضا کرتی ہے۔

ختم نبوت کے اس اجماعی عقیدے کے خلاف باطل تاویلات کا سہارا لے کر قادیانیوں نے نبوت کے جاری ہونے کا عقیدہ تراشا اور مرزا صاحب نے اپنی نبوت کا ذبحہ کو مختلف ادوار میں مختلف

انداز سے پیش کیا۔

انہوں نے دعویٰ کیا ”یہ مکالمہ نخطبہ جو مجھ سے ہوتا ہے یقینی ہے اگر میں ایک دم کے لئے بھی اس میں شک کروں تو کافر ہو جاؤں اور میری آخرت تباہ ہو جائے۔“ (1)

قادیانی خلیفہ دوم مرزا محمود احمد لکھتے ہیں کہ نبوت کی تین شرائط جو لغت عرب اور قرآن سے ثابت ہیں یعنی

1- کثرت سے امور غیبیہ پر اطلاع پانا۔

2- اس کا یقینی اور قطعی ہونا یعنی عظیم الشان اخبار پر جو انداز اور تبشیر کا پہلو رکھتی ہوں مشتمل ہونا۔

3- خدا تعالیٰ کا نبی کے نام سے پکارنا۔

یہ تینوں شرائط نبوت حضرت مسیح موعود میں پائی جاتی ہیں۔ (2)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علی نبوت جن دلائل اور جن الفاظ سے ثابت ہوتی ہے ان سے بڑھ کر دلائل اور صاف الفاظ حضرت مسیح موعود کی نبوت کے متعلق موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے اگر مسیح موعود بنی نہیں تو دنیا میں آج تک کبھی کوئی نبی ہوا ہی نہیں۔

(3)

قادیانی مرزا صاحب کو حقیقی معنوں میں نبی مانتے ہیں اور ان کی جعلی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے تاویلات کا سہارا لیتے ہیں۔ نئی نبوت میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ: آنی نص صریح خاتم النبیین ہے وہ خاتم النبیین کے معنی افضل اور اپنی مہر سے نبی بنانے والے کے کرتے ہیں۔ (4)

اسی طرح انہوں نے ہر کلمہ گواہ قبلہ مسلمان کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔ اگر کسی شخص نے مرزا صاحب کا نام بھی نہ سنا ہو تب بھی وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اسی بنیاد پر قادیانیوں نے دعویٰ کیا کہ خدا کی وحی کی رو سے مرزا صاحب نے مسلمانوں کا جنازہ پڑھنے، ان سے رشتہ ناطہ کرنے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے احمدیوں کو سختی سے منع کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نبوت ملت میں افتراق کا باعث بنی اور مرزا صاحب کی وحی دین میں حجت قرار پائی اور ان کو حکم کا درجہ دیا گیا۔

علامہ اقبال نے قادیانیوں کے ان عقائد کی بنیاد پر ان کو مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں سے اپنا علیحدہ وجود تسلیم کر لیں اور مطالبہ کیا کہ انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

خدا کی طرف سے مامور نبی و رسول کی وحی اور ایک ولی کے الہام میں فرق یہ ہے کہ

- 1- الہام کا دوسروں تک پہنچانا ضروری نہیں۔ وحی کا پہنچانا فرائض نبوت میں شامل ہوتا ہے۔
- 2- یہ انفرادی لقاء ہوتا ہے اس کا حلقہ بہت ہی محدود اور تنگ ہوتا ہے، وحی ساری قوم کے لئے ہوتی ہے۔
- 3- ضروری نہیں کہ الہام کا تعلق ہدایتِ خلق سے ہو لیکن وحی کا تعلق سراسر ہدایتِ خلق سے ہوتا ہے۔

4- یہ بھی ممکن ہے کہ الہام ایک بالکل رازدارانہ چیز ہو جس کے ابلاغ کا نہیں اخفا کا حکم ہو لیکن وحی نبوت عدم اخفاء اور بالاعلان تبلیغ کی چیز ہے کیونکہ اس کا تعلق پوری اجتماعی زندگی کے نظام سے ہے۔

5- ولی کا الہام حجت نہیں، وحی نبوت حجت ہے۔ الہام اسی کے لئے حجت ہو سکتا ہے جس پر وہ ہوا ہو لیکن وحی ہر مخاطب کے لئے حجت ہوتی ہے۔

6- پیغمبر وحی کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کا منکر کافر ہے لیکن اولیاء کا الہام کوئی دعوے کی چیز نہیں نہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور نہ اس کا منکر کافر ہو سکتا ہے۔ (5)

لاہور جماعت مرزا صاحب کی نبوت کو ولایت کے پردے میں پیش کرتی ہے اور ان کو مجدد اور محدث کہتی ہے۔ لاہوری بعض اولیاء کے کثوف اور باطنی واردات کو اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کشف، الہام، خدا سے ہم کلامی، مجددیت وغیرہ کی جتنی چاہے مثالیں پیش کریں ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو میرے دعاوی کو نہیں مانتا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ دعویٰ مرزا صاحب نے کیا اس لئے مرزا صاحب کے دعاوی کی حیثیت ان حضرات کے دعاوی سے یکسر مختلف ہے جنہیں احمدی حضرات مرزا صاحب کے دعاوی کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ (6)

سکھوں کی علیحدہ حیثیت اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے

کا مطالبہ

شیخ عبدالماجد نے اقبال اور احمدیت میں ایک اور نکتہ آفرینی کی ہے کہ علامہ اقبال نے انٹینس مین کے لیڈنگ آرٹیکل کا جواب ایک خط کی صورت میں 10 جون 1935ء کو شائع کرایا اس میں کہا کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں بنیادی اختلاف کا انتظامی طور پر نوٹس لے جیسے کہ سکھوں کو 1919ء تک انتظامی اعتبار سے ایک علیحدہ سیاسی یونٹ نہ سمجھا جاتا تھا مگر بعد میں ان کی طرف سے کسی رسمی عرضداشت کی وصولی کے بغیر انہیں ایسا تصور کیا گیا۔ احمدیوں کو بھی مسلمانوں سے اسی طرح الگ کر دیا جائے۔ شیخ عبدالماجد کا استدلال یہ ہے کہ سکھوں کو تو انتظامی طور پر علیحدہ سیاسی یونٹ قرار دیا گیا تھا مگر احمدیوں کے بارے میں علامہ اقبال کا مطالبہ علیحدہ مذہبی جماعت کا ہے اس لیے سکھوں کی مثال یہاں چسپاں نہیں ہوتی۔ سکھ اپنی عسکری اور سیاسی اہمیت کے تحت علیحدہ قومیت کے حصول کے لئے کوشاں تھے وہ اپنے آپ کو جداگانہ قوم تصور کرتے تھے وہ اپنی قوم کے لئے ہندوؤں سے مذہباً علیحدہ کئے جانے کی نہیں بلکہ جداگانہ انتخابات Separate Electorate اسمبلی کے علیحدہ انتخابات یا علیحدہ نشستوں کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔ مصنف زندہ رود کے مطابق علامہ کا خصوصی اہمیت کا نکتہ یہ تھا کہ 1919ء میں سکھوں کی سیاسی علیحدگی کے نوٹ کی روشنی میں بلاتا خیر احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا جائے۔ (1)

حکومت پنجاب کے نوٹ میں کہا گیا تھا کہ یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی تین الگ انتخابی فہرستیں Electoral Rolls تیار کی جائیں اور جو کوئی اپنے آپ کو سکھ ہندو یا مسلمان کہے اس کو سرکاری طور پر تحقیق کے بغیر اسی مذہب کا حامل سمجھا جائے۔ (2)

شیخ عبدالماجد کا خیال ہے کہ اس نوٹ کے تحت احمدیوں کو غیر مسلم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ علامہ

اقبال کا استدلال یہ تھا کہ انگریزی حکومت نے 1919ء میں سکھوں کو انتظامی لحاظ سے الگ قرار دیا تھا لیکن قادیانیوں کی مسلمانوں سے اس لحاظ سے منفرد حیثیت ہے کہ وہ ختم نبوت کے منکر، اسلام کے اساسی نظریات کے باغی اور اپنے علیحدگی پسندانہ عقائد اور نئی نبوت پر ایمان کے باعث مسلمانوں سے مذہبی اور سماجی سطح پر الگ ہیں لیکن مسلمانوں میں اس لئے شامل رہنا چاہتے ہیں کہ سیاسی فوائد حاصل کریں چونکہ ان کی 1921ء کی مردم شماری کے مطابق کل تعداد 56 ہزار ہے اس لئے وہ مجالس قانون ساز میں ایک نشست بھی نہیں حاصل کر سکتے نہ ہی ان کی نشستیں نئے آئین (1935ء) کے تحت مخصوص کی جاسکتی ہیں اس لئے وہ سیاسی اقلیت کے زمرے میں نہیں آتے یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسی اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ نہیں کرتے وہ پنجاب میں اپنی قلیل تعداد کے باعث چوتھی اقلیت (مسلم، ہندوؤں سکھوں کے بعد) کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے اس لئے حکومت ان کو ان کے الگ مذہبی عقیدے کی بنیاد پر علیحدہ مذہبی اقلیت قرار دے۔ وہ مسلمان نہیں اسلام کے باغی اور عقیدہ ختم نبوت کے منکر ہیں جس کو مانے بغیر مسلمان نہیں کہلا سکتے۔

سکھ اپنے سیاسی مطالبات ہندوؤں سے الگ مذہبی تشخص کی بناء پر پیش کرتے تھے۔ 1921ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی پنجاب میں آبادی 22 لاکھ 94 ہزار تھی جو کل آبادی کا 11 فی صد تھا ان کو پنجاب کونسل میں 13 نشستیں الاٹ کی گئی تھیں جو کل نشستوں کا 19 فی صد تھیں۔ وہ کونسل میں 33 فی صد نشستوں کا مطالبہ کرتے تھے 1919ء کی مونٹ فورڈ اصلاحات کے تحت ان کے جداگانہ حق نیابت separate electorate کو تسلیم کیا جا چکا تھا۔ جس کی بناء پر ان کو پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں 19 فی صد نشستیں ملیں لیکن قادیانیوں کی آبادی اتنی کم تھی کہ وہ نہ تو پنجاب کونسل میں کوئی ایک سیٹ لے سکتے تھے نہ ہی ان کی کوئی نشست مخصوص کی جاسکتی تھی وہ مسلمانوں کے حقوق پر مسلمان بن کر ڈاکہ ڈالتے تھے وہ سکھوں کی طرح کوئی سیاسی سودا بازی نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی علیحدہ سیاسی یا انتظامی یونٹ قرار دیئے جانے کے اہل تھے۔ اس لئے علامہ اقبال نے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں سے الگ قرار دیا جائے اور ان کی طرف

سے کسی مطالبہ کا انتظار نہ کیا جائے جیسا کہ سکھوں کے ساتھ کیا گیا۔ سکھ علیحدہ نمائندگی کے حق کو حاصل کرنے کے باوجود اس پر عمل پیرا نہ تھے کیونکہ وہ اس میں اپنا سیاسی نقصان سمجھتے تھے وہ اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ قوم قرار دیتے تھے اور پنجاب کونسل میں معمولی مسلم اکثریت کو نقصان پہنچانے کے لئے کانگریس سے ساز باز کر کے زائد نمائندگی اور ایک تہائی نشستوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ سکھ خود ہندوؤں سے اپنی علیحدہ حیثیت پر اصرار کرتے تھے لیکن قادیانی مسلمانوں میں شامل رہنا چاہتے تھے کیونکہ وہ تعداد کی کمی کے باعث انتظامی طور پر بھی الگ سیاسی یونٹ قرار پانے کے اہل نہ تھے اس لئے علامہ اقبال نے مطالبہ کیا کہ چونکہ وہ مسلمانوں سے الگ مذہبی اقلیت ہیں اس لئے ان کی اس حیثیت کو سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا جائے۔

بِسْمِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
 مُحَمَّدٌ وَعَلَىٰ آلِهِ وَالْآلِ الْكَرِيمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ
 ہوالہ

ڈاکٹر محمد اقبال اور احمدیہ عمت

(نمبر اول)

سر محمد اقبال صاحب کو کچھ عرصہ سے پیری ذات سے خصوصاً اور جماعت احمدیہ سے عموماً بغض پیدا ہو گیا ہے۔ اور اب انکی حالت یہ ہے کہ یا تو سبھی وہ انہی عقائد کی وجودگی میں جو ہماری جماعت کے اب ہیں جماعت احمدیہ سے تعلق موافقت اور موافقت رکھنا برا نہیں سمجھتے تھے یا اب کچھ عرصہ سے وہ اسکے خلاف غلوٹ و جلوت میں آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ میں ان وجوہ کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جو اس تبدیلی کا سبب ہوئے ہیں۔ جس نے سال ۱۹۰۷ء کے اقبال کو تو علیگندہ کالج میں مسلمان طلبہ کو تعلیم دے رہا تھا کہ ”پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیکہ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ و دینی کہتے ہیں۔“ سہ ماہی میں ایک دوسرے اقبال کی صورت میں بدل دیا جو یہ کہہ رہا ہے کہ

”میرے نزدیک تادیبیت سے بہائیت زیادہ ایسا تدارک ہے کیونکہ بہائیت نے اسلام سے اپنی تلحدگی کا اعلان واضح طور پر کر دیا ہے۔ تادیبیت نے اپنے چہرے سے منافقت کی نقاب کشائی کی ہے۔ بہائیت نے اپنے چہرے پر منافقت کی نقاب کشائی کی ہے۔“

تباہ و برباد کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔“ (زمیندار مئی ۱۹۴۸ء)

یہ سلسلہ کی احمدیہ جماعت آج ہی کے عقائد کے ساتھ صحابہ کا خالص نمونہ تھی لیکن
۳۵۔ یہ احمدیت بہائیت سے بھی بدتر ہے اس بہائیت سے جو صاف لفظوں میں ان کے علم
منسوخ کہتی ہے جو واضح عبدقوں میں یہاں اللہ کو ظہور الہی قرار دیتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
پر انکو فضیلت دیتی ہے گویا ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کے نزدیک اگر ایک شخص رسول کریم کی
رسالت کو منسوخ قرار دیتا۔ قرآن کریم سے بڑھ کر تعلیم لانے کا مدعی ہوتا۔ نمازوں کو تبدیل کر دیتا
اور قبلہ کو بدل دیتا ہے اور نیا کلمہ بناتا اور اپنے لئے خدائی کا دعویٰ کرتا ہے حتیٰ کہ اسکی قبر
پر سجدہ کیا جاتا ہے تو یہی اس کا وجود ایسا بڑا نہیں مگر جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو
خاتم النبیین قرار دیتا۔ اپنی تعلیم کو آخری تعلیم بتاتا قرآن کریم کے ایک ایک لفظ ایک ایک
حرکت کو آخر تک خدا تعالیٰ کی حفاظت میں سمجھتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے ہر حکم پر عمل کرنے
کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے سب روحانی ترقیات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی فرمانبرداری اور غلامی میں محصور سمجھتا ہے وہ بڑا اور بایکاٹ کرنے کے قابل ہے +

دوسرے لفظوں میں سر محمد اقبال صاحبِ سلمانوں سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو منسوخ کرے قرآن کریم کے بعد ایک نئی کتاب لانے کا دعویٰ ہو اپنے لئے خدائی کا مقام تجویز کرے اور اپنے سامنے سجدہ کرنے کو جائز قرار دے جسکے خلیفہ کی بیعت خادم میں صاف لفظوں میں لکھا ہو کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ وہ بانی سلسلہ احمدیہ ہے چنانچہ اپنے آپ کو خادمِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیتے ہیں اور قرآن کریم کی مطاعت کو اپنے لئے ضروری قرار دیتے ہیں اور کہہ بیت اللہ اور کلمہ کو مدارجات سمجھتے ہیں کیونکہ یہاں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بعد قرآن کریم پر چلا کرتے ہیں لیکن احمدی سر محمد اقبال اور انکے ہم نواؤں کو وہ علانی بیمار قرار دیکر انہیں اپنے علاج کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اور انکے ایمان کی گزندوں کو ان پر ظاہر کرتے ہیں۔ بہ بین تغلوت رہ انزکھا ست تا بہ کھا۔

[illegible]

ان فلسفی تحریکات تک سے آگاہ نہیں جسے اس وقت کے معمولی نوشت و خواند والے لوگ آگاہ ہیں۔ سر محمد اقبال کو معلوم ہونا چاہیے کہ بالائی اپنی کتب عام طور پر لوگوں کو نہیں دیتی بلکہ انہیں چھپاتے ہیں۔ وہ ہر ملک میں الگ الگ عقائد کا اظہار کرتے ہیں وہ ہر ملک میں صاف لفظوں میں یہاں اللہ کو خدا کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن اسلامی ممالک میں انکی حیثیت ایک کل ظہور کی جلتی ہے وہ اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے ساتھ ملکر نمازیں پڑھ لیتے ہیں ویسا ہی وضو کرتے ہیں اور اتنی ہی رکعتیں پڑھتے ہیں جتنی کہ مسلمان۔ لیکن الگ طور پر وہ صرف تین نمازوں کے قائل ہیں اور انکے ہاں نماز پڑھنے کا طریق بھی اسلام سے مختلف ہے +

پھر یہ بھی درست نہیں کہ احمدی منافق ہیں اور لوگوں سے اپنے عقائد چھپاتے ہیں۔ اگر احمدی مہانت سے کام لیتے تو آج سر محمد اقبال کو اس قدر اظہار غصہ کی ضرورت ہی کیوں ہوتی احمدی ہندوستان کے ہر گوشہ میں رہتے ہیں۔ دوسرے فرقوں کے لاکھوں کروڑوں مسلمان انکے حالات سے واقف ہیں وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرنے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی نماز کے مطابق نماز پڑھنے والے روزے رکھنے والے حج کرنا اور زکوٰۃ دینے والے ہیں وہ کوئی بات ہے جو احمدی چھپاتے ہیں۔ اور سر محمد اقبال کے پاس ہر کوشا ذریعہ ہے جس سے انہوں نے یہ معلوم کیا کہ احمدیوں کے دل میں کچھ اور ہے مگر ظاہر وہ کچھ اور کرتے ہیں +

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس قدر محتاط تھے کہ جب ایک صحابی نے ایک شخص کو جس نے جنگ میں عین اس وقت کلمہ پڑھا تھا جب وہ اقصیٰ قتل کرنے لگے تھے قتل کر دیا۔ اور غدیر رکھا کہ اس نے دُور سے کلمہ پڑھا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اهل شققت تخلیہ کیا تو نے اس کا دل پھا کر دیکھا ہے لیکن ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب آج دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ قوم جسکے انفرادے افغانستان میں اپنے عقائد چھپانے پھندے کے لیکن جان دیدی۔ ساری کی ساری منافق ہے اور ظاہر کچھ کہہ رہی ہے اور اس کے دل میں کچھ اور ہے +

اگر یہ لازم کئی ایسا شخص لگاتا ہے احمدیوں کے واسطہ نہ پڑا ہوتا تو میرے منہ پر پڑتا لیکن سر محمد اقبال صاحب نہیں کہہ سکتے۔ انکے والد صاحب مرحوم احمدی تھے منہ پر پڑتا لیکن سر محمد اقبال صاحب احمدی ہیں منہ پر پڑتا لیکن سر محمد اقبال صاحب احمدی ہیں

احمدی ہیں۔ اسی طرح انکے خاندان کے اور لئی افراد احمدی ہیں۔ انکے بڑے بھائی صاحب مال ہستی میں
 کئی ماہ انکے پاس رہے ہیں بلکہ ہر وقت انہوں نے یہ اعلان شائع کیا ہے۔ اس وقت بھی سر محمد اقبال
 صاحب کی کوٹھی وہ تعمیر کر رہے تھے کیا سر محمد اقبال صاحب نے انکی رائٹس کے ایام میں انہیں منافقت
 پایا تھا یا خود اپنی زندگی سے زیادہ پاک زندگی انکی پائی تھی انکی گتے جیسے شیخ اعجاز احمد صاحب ایسے
 نیک فوجوان ہیں کہ اگر سر محمد اقبال غور کریں تو یقیناً انہیں ماننا پڑے گا کہ انکی اپنی جوانی اس فوجوان
 کی زندگی سے سینکڑوں سبق لے سکتی ہے پھر ان خواہد کی موجودگی میں ان کا کہنا کہ احمدی منافق ہیں
 اور وہ ظاہر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن دل میں رسول کریم صلی اللہ
 علیہ وسلم کے دین کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں کہاں تک درست ہو سکتا ہے +

میں تمام ان شریف مسلمانوں سے جو اسلام کی محبت رکھتی ہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہند
 دل کو اس صورت حالات پر غور کریں جو ذکر سر محمد اقبال صاحب کے اعلان نے پیدا کر دی ہے اور دیکھیں کہ
 کیا اس قسم کے غیض و غضب کے بھرے ہوئے اعلان مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنائینگے یا خراب کریں گے اور
 سوچیں کہ ایک شخص جو اپنے احمدی بھائی کو بلو کر اس سے اپنی کوٹھی بنواتا ہو دوسرے
 مسلمانوں کو انکے بائیکاٹ کی تعلیم دیتا ہو کہاں تک لوگوں کیلئے راہنما بن سکتا ہو اور
 اسی طرح وہ شخص جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کھلا حملہ کرے یا انکے کو اچھا قرار دیتا ہو اور اپنے ابا
 پر اعتراض کرے یا انکے کو ناقابل معافی قرار دیتا ہے کہاں تک مسلمانوں کا خیر خواہ قرار دیا جاسکتا ہو اور
 سر محمد اقبال اس عمر میں ان امور کی طرف توجہ کرتی کیا ہے ذکر الہی اور احکام اسلام کی بجا آوری کیلئے
 توجہ کرتے اور پریشتر اسکے کہ توبہ کا دروازہ بند جو ناپائے نفس کی اصلاح کرتے تا خدا تعالیٰ ان کو
 موت پہلے صداقت کے سمجھنے کی توفیق دیتا اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے متبع کے طور
 پر اپنے رب کے حضور میں پیش ہو سکتے۔ واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔ والسلام

خاکسار امیر احمد امام جماعت ایچ

مندرجہ بالا منصوص حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایہ اللہ بنعمہ العزیز نے لکھا ہے
 جسے تمام مسلمانوں کو فائدہ کے لئے جیسے تحریک جدید شائع کرتا ہے +
 لکھا ہے کہ ان کو اپنی تحریک جدید میں لکھا ہے

حوالے و حواشی

- (1) حرف اقبال ص: 103 تا 108
- (2) ایضاً: 109
- (3) ایضاً: 118
- (4) زندہ رود حصہ سوم ص: 577
- (5) ایضاً
- (6) حرف اقبال، ص: 134
- (7) سید نذیر نیازی اقبال کے حضور، ص: 5، 7
- (8) i- مرزا محمود احمد نے اپنے خطبہ جمعہ مندرجہ الفضل قادیان، 8 نومبر 1938ء میں کہا اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہیں اتنی غیر محدود ہیں کہ کلی طور پر طے کرنے کا خیال بھی کفر ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی سب طے نہیں کیں بے شک اپنے مقام کی سب کیں اور آپ سب سے آگے ہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا احاطہ کر لیا ہو۔ یہ غلط ہے، اس پر ایک صاحب نے بعض اعتراض کرتے ہوئے مرزا محمود احمد سے بعض سوالات کے جواب طلب کئے وہ سوال اور ان کے جواب درج ذیل ہیں۔
سوال: کیا آنحضور ﷺ کو خدا تعالیٰ کا مکمل قرب حاصل نہیں ہوا؟
جواب: اگر مکمل سے مراد یہ ہے کہ سب انسانوں سے زیادہ تو محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ قرب حاصل ہوا اور اگر مراد یہ ہے کہ اس سے آگے قرب کی راہیں بند ہیں تو یہ غلط ہے۔
سوال: کیا کسی دوسرے انسان کو اس قرب سے جو آپ کو حاصل ہوا بڑھ کر قرب حاصل ہو سکتا ہے۔
جواب: اگر یہ مراد ہے کہ کوئی بندہ ایسا موجود ہے تو جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں اگر یہ مراد ہے کہ خدا نے دوسروں کے لئے زیادہ قرب کی راہ بند کر دی ہے تو غلط ہے۔ اخبار الفضل قادیان، 10 دسمبر، 1938ء
- ii- مرزا محمود احمد نے ایک خطبے میں یہ بھی کہا کہ مکہ مدینہ کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہو گیا ہے۔
(حقیقۃ الرویا)
- iii- قادیانی قرآنی آیت میثاق سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس میں تمام انبیاء سے نبی کریم ﷺ کے

لئے اور حضور نبی کریم ﷺ سے مرزا غلام احمد کے لئے ایمان لانے اور ان کی نصرت کرنے کا عہد لیا گیا ہے۔ پیغام صلح لاہور، 17 اگست 1940ء خطبہ محمد سعید حیدر آبادی، 19، 21 ستمبر 1915ء نیز احمدیہ پاکٹ بک مرتبہ خادم گجراتی

قاضی محمد ظہور اکمل نے مرزا صاحب کی زندگی میں ایک نظم کہی جو اخبار بدر میں 25 اکتوبر 1906ء کو شائع ہوئی اس کے دو شعر ہیں۔

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شان میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیان میں

یہ اشعار شاعر نے خود مرزا غلام احمد قادیانی کو متعدد قادیانیوں کی موجودگی میں پڑھ کر سناے۔ مرزا صاحب نے سن کر جزاک اللہ کہا اور خوشخط لکھی ہوئی اس نظم کو اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ 1944ء میں اس نظم کے ایک شعر پر بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے قاضی اکمل نے الفضل میں لکھا:

”وہ اس نظم کا ایک حصہ ہے جو حضرت مسیح موعود کے حضور میں پڑھی گئی اور خوشخط لکھے ہوئے قطع کی صورت میں پیش کی گئی اور حضور اسے اپنے ساتھ اندر لے گئے اس وقت کسی نے اس شعر پر اعتراض نہ کیا حالانکہ مولوی محمد علی (امیر جماعت احمدیہ لاہور) اور ان کے رفقاء موجود تھے اور جہاں تک حائفہ مدد کرتا ہے باوثوق کہا جاسکتا ہے کہ سن رہے تھے اگر وہ اس سے بوجہ مرور زمانہ انکار کر دیں تو یہ نظم ”بدر“ میں شائع ہوئی۔ اس وقت ”بدر“ کی پوزیشن وہی تھی بلکہ کچھ بڑھ کر جو اس عہد میں الفضل کی ہے مفتی محمد صادق صاحب ایڈیٹر ”بدر“ سے ان لوگوں کے مجاہدہ اور بے تکلفانہ تعلقات تھے وہ خدا کے فضل سے زندہ موجود ہیں ان سے پوچھ لیں اور خود کہہ دیں کہ آیا آپ میں سے کسی نے بھی اس پر تارافنگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور حضرت مسیح موعود کا شرف سماعت حاصل کرنے اور جزاک اللہ تعالیٰ کا صلہ پانے اور اس قطع کو اندر خود لے جانے کے بعد کسی کو حق ہی کیا پہنچتا تھا کہ اس پر اعتراض کر کے اپنی کمزوری ایمان اور قلت عرفان کا ثبوت دیتا۔“ (الفضل 22 اگست 1944ء)

قاضی اکمل مزید لکھتے ہیں۔

”یہ شعر خطبہ الہامیہ پڑھ کر حضرت مسیح موعود کے زمانے میں کہا گیا اور ان کو سنا بھی دیا گیا اور چھاپا بھی گیا۔“ (الفضل 22 اگست 1944ء)

ہو سکتا ہے کہ عام قارئین مرزا غلام احمد قادیانی کے خطبہ الہامیہ سے واقف نہ ہوں اس لئے مطبوعہ خطبے کا متعلقہ حصہ درج کیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

”اور جان لو کہ ہمارے نبی ﷺ جیسا کہ پانچویں ہزار میں مبعوث ہوئے ایسا ہی مسیح موعود کی بروزی صورت اختیار کر کے چھٹے ہزار سال کے آخر میں مبعوث ہوئے۔“

مرزا صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ بعثتِ ثانیہ بعثتِ اولیٰ سے کہیں زیادہ طاقتور، کامل اور روشن ہے:

”بلکہ حق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی روحانیت چھٹے ہزار سال کے آخر میں یعنی ان دنوں میں بہ نسبت ان سالوں کے اقویٰ اور اکمل اور اشد ہے بلکہ چودہویں رات کے چاند کی طرح ہے۔“

(روحانی خزائن جلد 16 ص 270-271-272)

قاضی اکمل مشہور اشتراکی مصنف اے آر شبلی، مؤلف کتاب پاکستان کے دیہہ خدا کے والد تھے۔ مرزا ناصر احمد نے ایک تقریر میں کہا کہ مرزا محمود احمد اور جماعت احمدیہ نے ان اشعار کو پسند نہیں کیا۔ ان کا جو مجموعہ کلام شائع ہوا اس میں انہوں نے ان اشعار کو نکال دیا لیکن قادیانیوں کا یہ موقف ہے کہ ایسا مسلح اور مجبوراً کیا گیا ورنہ جماعت کا یہی عقیدہ ہے۔

صاحبزادہ بشیر احمد لکھتے ہیں:

”اب معاملہ صاف ہے۔ اگر نبی کریم کا انکار کفر ہے تو مسیح موعود (مرزا صاحب) کا انکار بھی کفر ہونا چاہیے چونکہ مسیح موعود نبی کریم سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ وہی ہے۔ اور اگر مسیح موعود کا منکر کافر نہیں تو لغو باللہ نبی کریم کا منکر بھی کافر نہیں کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ پہلی بعثت میں تو آپ کا انکار غر ہو مگر دوسری بعثت میں جس میں بقول مسیح موعود آپ کی روحانیت اقویٰ اور اکمل اور اشد ہے آپ کا انکار کفر نہ ہو۔“

(کلمۃ الفصل، مندرجہ رسالہ ریو یو آف ریلی جنسز قادیان ص 146، نمبر 3، جلد 14)

مرزا محمود نے ایک خطبہ میں یہ بھی کہا کہ ایک شخص حضرت محمد ﷺ سے بڑھ سکتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ ابھی تک ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا۔ (امکانی طور پر بھی یہ کلمات کہنا کفر سے کم نہیں۔ مصنف) (الفضل قادیان 13 فروری، 1944ء میں پورا خطبہ درج ہے)۔

vii- مرزا محمود احمد کے ایک قریبی عزیز ڈاکٹر شاہ نواز خان (جو خود بھی قادیانی تھے) نے ایک قادیانی جریدے میں لکھا:

”حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دینی ارتقاء آنحضرت ﷺ سے زیادہ تھا..... اس زمانے میں تمدنی ترقی زیادہ ہوئی ہے اور یہ جزوی فضیلت ہے جو حضرت مسیح موعود کو آنحضرت صلعم پر حاصل ہے۔ نبی کریم کی دینی استعدادوں کا پورا ظہور بوجہ تمدن کے نقص کے نہ ہوا۔ ورنہ قابلیت تھی۔ اب تمدن کی ترقی سے حضرت مسیح موعود کے ذریعے ان کا پورا ظہور ہوا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ کو موقع ملا اور دینی طاقتوں کی نشوونما ہو گئی۔“

(ریویو آف ریلی جنسز، قادیان مئی 1929ء)

(9) حرف اقبال ص: 112

(10) انفضل قادیان، 25 مئی 1935ء

(11) حرف اقبال ص: 115

(12) تاریخ احمدیت جلد ہفتم، ص: 176-181

(13) ایضاً 181 تا 184

(14) بشیر احمد، تحریک احمدیت۔ یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، تحریک پاکستان اور قادیانی، باب 14

(15) انفضل قادیان، 30 اگست 1935ء

(16) طغص خطبہ جمعہ مرزا محمود احمد، 30 مئی 1935ء، ماخوذ از قادیانی مذہب، ص: 30

(17) تاریخ احمدیت، جلد ہفتم، ص: 188

(18) ایضاً: 188-192

(19) مولوی محمد علی، امیر جماعت لاہور تحریک احمدیت، 1930ء ص: 223

(20) Molvi Muhammad Ali, Sir Muhammad Iqbal's Statement regarding Qadianis; Lahore, 1935, Page 6.7

مرزا غلام احمد صاحب نے منافقت سے کام لیا۔ یہی سر فضل حسین 1908ء میں لاہور میں مرزا صاحب سے ملے اور یہی سوال پوچھا تو انہوں نے جواب اشیات میں دیا۔ وہ اپنے پہلے موقف سے روگردانی کر چکے تھے بلکہ پہلے بھی 1904ء میں ان کا یہی موقف تھا۔ دیکھیں مرزا بشیر احمد ایم اے کی کتاب مسئلہ کفر اسلام جس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(21) مرزا صاحب نے بعض حالات میں اس کی وقتی اجازت دی لیکن ان کا اصل مقصد ممانعت تھا۔ اس سلسلے کی بحث مرزا بشیر احمد کی کتاب مسئلہ جنازہ میں موجود ہے۔

(22) قادیانی سید احمد بریلویؒ شہید بالا کوٹ کو مرزا صاحب سے پہلے آنے والا ارباص یا الیاس (ایلیاہ) بتاتے ہیں۔ الفضل قادیان، 3 ستمبر 1938ء۔ سید صاحبؒ نے اس کے بارے میں شاید سوچا بھی نہ ہوگا۔

Molvi Muhammad Ali, Amir Jamat Lahore, Sir Muhammad Iqbal's (23)

Statement regarding Qadianis, Lahore 1935, Page 19

(24) ایضاً، جس زمانے میں پاکستان میں یہ سوال زیر غور تھا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو لاہوری جماعت کے آرگن پیغام صلح نے اپنی 30 مئی 1973ء کی اشاعت میں لکھا:

”ان حالات میں اول تو کسی جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا صحیح نہیں اور اگر اس شوق کو پورا ہی کرنا ہے..... تو کم از کم احمدیوں کے اس گروہ کو اس مستثنیٰ کرنا ضروری ہے جو حضرت خاتم النبیینؐ کے بعد کسی بھی نبی کے آنے کے قائل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہم قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے حق میں ہیں۔ ہمارے نزدیک قادیانی ہو یا نیر قادیانی ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ اس کو غیر مسلم قرار دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔“

(25) ڈاکٹر اللہ بخش، علامہ اقبال مرحوم اور بانی سلسلہ احمدیہ، لاہور ص: 8، بیان محمد یعقوب خان ایڈیٹر لائٹ، پیغام صلح لاہور، 19 نومبر 1935ء

مولوی محمد یعقوب خان صاحب کی بات میں اتنی صداقت تو ہے کہ علامہ اقبال کے مئی 1935ء کے بیان میں مرزا غلام احمد قادیانی اور لاہور جماعت کی طرف روئے سخن نہیں ہے لیکن علامہ نے اس سلسلے میں شیش مین میں جو مراسلہ شائع کرایا اس میں بانی تحریک احمدیت پر اس حوالے سے تنقید کی کہ انہوں نے ملت اسلامیہ کو سزے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ (حرف اقبال ص: 117-118) اسی طرح اس ضمن میں چندت نہرو کے مضامین کا جواب دیتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں: ”بانی احمدیت کا استدلال یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کہ پیغمبر اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے۔ لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ محمد ﷺ کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے مساوی ہے کہ ”محمد ﷺ آخری نبی نہیں میں آخری نبی ہوں“..... ”جب میں بانی احمدیت

کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبر اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔“ (حرف اقبال ص: 127-128) وہ مزید لکھتے ہیں ”تحریک احمدیت دو جماعتوں میں منقسم ہے جو قادیانی اور لاہوری جماعتوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اول الذکر جماعت بانی احمدیت کو نبی تسلیم کرتی ہے آخر الذکر نے اعتقاداً یا مصلحتاً قادیانیت کی شدت کو کم کر کے پیش کرنا مناسب سمجھا۔“ (حرف اقبال ص: 120)

توضیحی نوٹ (الف)

- (1) تجلیات الہیہ ص: 24
- (2) حقیقۃ النبوة ص: 75
- (3) ایضاً ص: 201
- (4) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اجرائے نبوت کے حق میں قادیانیوں کے دلائل کے مسلمان علماء نے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ لیکن قادیانی اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے علماء سلف کی کتابوں کے سیاق و سباق سے کاٹ کر حوالے دیتے رہتے ہیں۔ وہ اجرائے نبوت کی تائید میں ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ خاتم النبیین میں النبیین جمع مذکر سالم ہے اور خاتم کی طرف مضاف ہو کر آخری کے معنی نہیں دیتا۔ انہوں نے اس دلیل کو ایک چیلنج کی حیثیت دے رکھی ہے اور محاورہ عرب سے اس کا ثبوت مانگتے ہیں [دیکھیں اللہ دتہ جالندھری کا رسالہ البرہان، ربوہ، 1950ء] اللہ دتہ جالندھری لکھتے ہیں ”میں آپ (مخالف عالم دین۔ مصنف) کو چیلنج کرتا ہوں کہ آپ اہل عربیہ کا ایک حوالہ پیش کریں جس میں لفظ خاتم کسی روحانی کمالات والی جماعت کی طرف مضاف ہو اور وہ لفظ مرکب کسی شخص کی تعریف میں مذکور ہو اور اس کے معنی بلحاظ زمانہ آخری ہوں، ہرگز آپ اس کا جواب نہیں دے سکتے کیونکہ بلحاظ زمانہ آخری ہونا کوئی کمال نہیں، اور نعمت کا بند ہونا کوئی کمال نہیں، ہاں سب سے افضل ہونا کمال ہے۔“ ص: 12

ہم کسی مذہبی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے لیکن قادیانی مناظرہ بازوں کی تسلی کے لئے اس کا جواب دے رہے ہیں جو اہل علم کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ختم نبوت کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں اب تک ہمیں یہ جواب نہیں ملا۔ یہ جواب انگریزی جریدے مسلم ورلڈ کی جنوری 1936ء کی اشاعت میں قادیانی مبلغ عبدالرحیم نیز

کے استفسار کے ضمن میں شائع ہوا تھا۔ مسلم ورلڈ کا مضمون نگار لکھتا ہے:

”لسان العرب نے اللمیائی، ایک تیسری صدی کے ماہر لغت کی سند پر خاتم القوم۔ خاتمہم و خاتمہم تمام محاورات کی تشریح آخر ہم۔ ان کا آخری کی ہے۔ لسان العرب یا تاج العروس دونوں میں سے کسی نے اس مادے کی کسی شکل کے معنی ”افضل“ یا منتخب نہیں کئے۔ ان ہر دو مستند معاجم کے اخذ کردہ نتیجہ کی تصدیق الرخسری کی ”اساس البلاغۃ“ اور لیان کے نسخہ ”المفصلیات“ میں مزید تحقیق سے بھی ہوتی ہے جن دونوں نے اس لفظ کا ذکر کیا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مشہور عربی شاعر الفرزدق رحمہ اللہ کو خیر الخواتم یا مہروں میں سے بہترین قرار دیتا ہے۔ (نفاکص جریر و الفرزدق نسخہ بیون مطبع لیڈن 1905-07ء جلد اول صفحہ 349 سطر 5) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب الفرزدق نے مہر اور ”افضل“ کے خیال کو ملانا چاہا تو اس نے دونوں لفظوں کو ایک ہی محاورہ میں استمال کیا..... اس طرح عربی علم و ادب اور ماہرین لغت کی شہادت خاتم کے معنی افضل یا منتخب کرنے کی تائید نہیں کرتی۔“

(5) جعفر شاہ پھلواری، مقام سنت، مکتبہ امتیاز براولپنڈی، ص: 47

(6) غلام احمد پروین، ختم نبوت اور تحریک احمدیت، طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور 1974ء، ص 28

توضیحی نوٹ (ب)

- (1) شیخ عبدالمجید، اقبال اور احمدیت، زندہ رود پر تبصرہ، باب جس طرح سکھوں کو علیحدہ سیاسی یونٹ تصور کر لیا گیا..... اقبال، ص 12-311۔ زندہ رود ص 552
- (2) راجیو اے کپور، سکھ سپریشن لندن ص 79، بحوالہ اقبال اور احمدیت ص 312

علامہ اقبال کے بیان پر قادیانی جرائد کے تبصرے

اور پنڈت نہرو کے خطوط

قادیانی جماعت کے اخبار الفضل قادیان اور دیگر رسائل و جرائد میں علامہ اقبال کے بیان پر بہت کچھ لکھا گیا۔ ہم نے ان میں سے ان تحریروں کا انتخاب کیا ہے جو بظاہر معقولیت پر مبنی ہیں۔ قادیانی مضمون نگاروں نے زیادہ تر مذہبی نقطہ نظر سے بحث کی ہے کیونکہ ان کے لئے علامہ اقبال کے بنیادی دلائل کو جھٹلانا ممکن نہ تھا۔ مثلاً ایک قادیانی امیر عالم پٹیا لوی نے الفضل 15 مئی 1935ء کی اشاعت میں ایک مضمون بعنوان ڈاکٹر اقبال کا غیر فلسفیانہ تبصرہ لکھا۔ اس میں وہ علامہ اقبال کے ایک مصرعے کو جو انہوں نے داغ دہلوی کی وفات پر کہا تھا کہ آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے بنیاد بنا کر کہتے ہیں کہ کیا دلی میں داغ کے بعد شاعر نہ ہوئے۔ اس سے وہ نبوت کے جاری ہونے کا روایتی قادیانی استدلال کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک قادیانی حقانی چکوالی ایم اے نے ڈاکٹر اقبال کے بیان پر ایک نظر کے عنوان سے الفضل قادیان میں دو قسطوں 24-25 مئی 1935ء میں ایک مضمون لکھا جس میں کہا کہ مجوسی ثقافت اور اجرائے نبوت کا عقیدہ لازم و ملزوم نہیں جیسا کہ ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے بلکہ مجوسی ثقافت کی امتیازی خصوصیت ختم نبوت کا عقیدہ ہے نہ کہ اجرائے نبوت کا۔ ایسے دیگر مضامین میں کوئی بات جواب طلب دکھائی نہیں دیتی اس لئے ہم الفضل اور ریویو آف ریلی جنز کے دو اداریوں پر بحث کرتے ہیں جن میں جماعت کے موقف کو پیش کیا گیا ہے۔

الفضل کا ادارہ

الفضل 14 مئی 1935ء میں جماعت احمدیہ کو جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کے عنوان سے جو ادارہ شائع ہوا اس میں اخبار نے بہ دلیل پیش کی کہ جماعت احمدیہ کو جداگانہ اقلیت قرار

دینے سے وہ پنجاب کونسل اور مرکزی اسمبلی میں اپنے منتخب نمائندے بھجوا سکیں گے اور ان کی نشستیں محفوظ ہوں گی لیکن یہ دعویٰ بے بنیاد تھا کیونکہ ایکٹ آف 1935ء کے نفاذ کے بعد آئندہ انتخابات میں وہ ایسے سیاسی فوائد حاصل کرنے کے اہل قرار نہیں پاسکتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو ان کی تعداد کم تھی صرف پنجاب کے بعض اضلاع خصوصاً تحصیل بنالہ میں قادیانیوں کی بڑی تعداد تھی جہاں سے انہوں نے 1946ء کے الیکشنوں میں مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلے میں اپنے امیدوار فتح محمد سیال کو مقابلہ کے لئے کھڑا کیا دوسرے ہندوستان کے دوسرے صوبوں یوپی، سی پی وغیرہ میں وہ بری طرح بکھرے ہوئے تھے اور ان کی تعداد بہت ہی کم تھی ووٹ کے اہل افراد کی تعداد اور کم تھی اس لئے وہاں سے کوئی سیٹ حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ نہ کسی سیاسی جماعت سے انتخابی اتحاد ممکن تھا۔ ایسے میں جب تک ان کی مذہبی اور سیاسی حیثیت کا تعین نہ ہو ان کی سیٹ محفوظ نہیں ہو سکتی تھی۔ تقسیم ہند سے قبل 1946ء میں جب عبوری حکومت قائم ہوئی اور اس میں پارسیوں کا ایک نمائندہ شامل کیا گیا تو مرزا محمود نے بہت احتجاج کیا اور کہا کہ ان کی تعداد پارسیوں سے زیادہ ہے۔ انہوں نے کہا تم ایک پارسی لاؤ میں اس کے مقابلے میں ایک احمدی لانا ہوں اس طرح ثابت ہو جائے گا کہ کون اکثریت میں ہے لیکن ان کی بات نہ سنی گئی۔

اس ادارے میں ان کا یہ کہنا کہ جماعت احمدیہ اقلیت قرار پانے سے ڈرتی نہیں، غلط ہے۔ وہ اس مطالبہ سے ہمیشہ خوفزدہ رہی دوسرے ان کا یہ دعویٰ کہ وہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفاد میں ان کا ساتھ دینے کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کا فیصلہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت اور باؤنڈری کمیشن میں ان کے الگ محضر نامہ پیش کرنے سے عیاں ہو گیا۔ جسٹس منیر اپنے ایک مضمون میں سوال کرتے ہیں کہ اگر احمدیوں کو مسلم لیگ کے موقف سے اتفاق تھا اور مسلم لیگ کا کیس بھی جماعت احمدیہ کا ایک ممتاز فرد سر ظفر اللہ پیش کر رہا تھا تو پھر الگ محضر نامہ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی کیونکہ قادیانیوں کی اس روش سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔

ریویو آف ریلی جنرل قادیان کا تبصرہ جون 1935ء

قادیان سے شائع ہونے والے ماہنامے ریویو آف ریلی جنرل نے جون 1935ء کے شمارے میں علامہ اقبال کے بیان پر ایک تبصرہ شائع کیا اس کا عنوان تھا Dr Muhammad Iqbal's

Bitter Attack on The Ahmadyah Community.

ڈاکٹر علامہ اقبال کا احمدیہ جماعت پر سخت حملہ۔ اس مضمون میں مدیر ریویو ملک غلام فرید ایم۔ اے نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر اقبال کا احمدیت پر حملہ زیادہ تر سیاسی وجوہات کی بنا پر ہے۔ وہ لکھتے ہیں ڈاکٹر اقبال اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ 1914ء میں حکیم نور الدین کی وفات سے قبل وہ لاہور کی مقامی جماعت کے مرکز میں باقاعدگی سے جاتے اور جلسوں کی صدارت کرتے تھے اور ان میں تقریریں کرتے تھے۔ وہ اس وقت کی احمدیہ جماعت کے مذہبی رہنماؤں ہے میل جول رکھتے ہوئے ان کی مذہبی سرگرمیوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا یہ کہنا کہ یہ افراد کے ساتھ ان کے تعلقات ذاتی حیثیت میں تھے غلط ہے۔ ہم اس جواب کو درست تسلیم کر لیتے اگر 1931ء میں یہ صورت نظر نہ آتی کہ انہوں نے اس وقت موجودہ امام جماعت احمدیہ مرزا محمود احمد کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی حقیقی معنوں میں ڈکٹیٹر شپ نہ پیش کی ہوتی، اور ان کو اپنے مل تعاون کی پیش کش نہ کی ہوتی اور گول میز کانفرنس میں چوہدری ظفر اللہ خان صاحب جیسے ممتاز مدی کے ساتھ گہرے اتحاد کے ساتھ ہاتھ نہ بٹایا ہوتا۔ ظفر اللہ کو جو خراج تحسین پیش ہوا اس سے انہیں اقبال کے دل میں حسد اور رقابت پیدا ہوئی اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کے رہنما بننے کے لئے شاہیں ہیں۔

انگریزی روزنامہ سٹینٹس مین نے بھی 14 مئی 1935ء کی اشاعت میں ڈاکٹر صاحب کی بات برا منایا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے بوجہ خاتم النبیین ہونے کے شدید وابستگی نے چوہدری ظفر اللہ کے دائرے ہند کی کونسل کے بطور ممبر مقرر ہونے کے بعد ہی جوش مارا ہے۔ قادیانی فرقہ کشمیر کمیٹی کے معرض وجود میں آنے اور چوہدری صاحب کے تقرر سے تیس سال قبل کا

قائم شدہ ہے پنجاب کونسل کے انتخاب کے لئے چوہدری صاحب کے کھڑے ہونے کے موقع پر یا پہلی دفعہ وائسرائے کی کونسل کا ممبر مقرر ہونے پر ڈاکٹر صاحب نے کیوں صدائے احتجاج بلند نہ کی تھی۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ہی امام جماعت احمدیہ کا نام تجویز کیا تھا اور باصرار التجا کی تھی کہ وہ اس پیش کش کو قبول کر لیں۔ اس وقت کشمیر کے مسلمانوں کی خدمت کے لئے ڈاکٹر صاحب کو صرف حضرت ممدوح کی شخصیت ہی قابل نظر آتی تھی اور اب وہ جماعت کو غیر مسلم قرار دیتے ہیں۔ (1)

پنڈت نہرو کے خطوط۔ پہلا خط، اسلامی یک جہتی

علامہ اقبال کے بیانات پر پنڈت جواہر لال نہرو نے تین خطوط ماڈرن ریویو کلکتہ کو لکھے۔ وہ اس وقت الموڑہ جیل میں نظر بند تھے۔ پہلے خط کا عنوان ہے اسلام کی یک جہتی (2) The Solidarity of Islam جو نومبر 1935ء کے ماڈرن ریویو کلکتہ میں شائع ہوا۔

پنڈت جی کہتے ہیں کہ انہوں نے سر محمد اقبال کا اسلام کی یک جہتی پر مضمون انتہائی دلچسپی سے پڑھا۔ سر محمد اقبال کی تحریریں ہمیشہ ان کے لئے باعث کشش رہی ہیں کیونکہ وہ انہیں اس دنیا میں جھانکنے کا موقع دیتی ہیں جسے سمجھنے میں انہیں دشواری ہوتی ہے۔ وہ مذہب کے تاریخی، تمدنی بلکہ فلسفیانہ پہلو میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس مضمون میں سر محمد اقبال کہتے ہیں کہ قادیانیوں نے اسلام کا بنیادی عقیدہ، ختم نبوت ترک کر دیا ہے اور کسی حد تک ابتدائی یہودیت اور قبل از اسلام مجوسی ثقافت کی طرف رجوع کر گئے ہیں، اس لئے اس باغی گروہ کو تخریب کارانہ پروپیگنڈہ کرنے اور کسی بھی صورت میں مسلمان کہلوانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ قادیانی ان کی دلیل نہیں مانتے اور ان کے بیان کو مسترد کرتے ہیں۔

سر محمد اقبال کا مضمون کئی مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ انہیں امید ہے کہ وہ (اقبال) اپنے بعض نکات کو آئندہ تحریروں میں واضح کریں گے کیونکہ ان پر مکمل بحث کی ضرورت ہے۔ پنڈت جی کہتے ہیں کہ وہ اس مضمون کے دلائل کی صحت یا عدم صحت پر اسلامی نقطہ نظر سے

بحث نہیں کر سکتے، یہ علماء کا کام ہے۔ ان کے نزدیک سر محمد اقبال اسلام پر ایک اتھارٹی ہیں اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے نقطہ نظر کی درست نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو ان (پنڈت نہرو) کے خیال میں مصطفیٰ کمال کے زیر اقتدار ترکی کو کسی بھی مفہوم میں ایک اسلامی ملک قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مصران مذہبی مصلحین کے شدید طور پر زیر اثر آگیا ہے جنہوں نے قدیم حقائق کو نیا لباس پہنانے کی کوشش کی ہے۔ ان (پنڈت نہرو) کے خیال میں سر اقبال جدیدیت کے اس رجحان کی تائید نہیں کرتے۔ شام اور فلسطین کے عرب کم و بیش مصر کی فکری رو کی تائید کرتے ہیں اور جزوی طور پر ترکی کی مثال سے متاثر ہیں۔ ایران یقینی طور پر قبل از اسلام مجوسی ثقافت سے تخلیقی تحریک حاصل کر رہا ہے۔ ان تمام ممالک بلکہ مغربی اور وسط ایشیا کے ہر ملک میں قوم پرستانہ تصورات تیزی سے نشوونما پا رہے ہیں اور یہ تصورات خالص اور راسخ العقیدہ مذہبی نقطہ نظر کے خلاف ہیں۔ جیسا کہ سر اقبال ہمیں بتاتے ہیں کہ اسلام نسلی اور جغرافیائی تصورات کی نفی کرتا ہے اور اس کی اساس صرف مذہبی تصور پر ہے، لیکن مغربی ایشیا کے اسلامی ممالک میں اب ہم نسلی و جغرافیائی تصورات کو انتہائی طاقتور صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ ترک تورانی نسل پرنازاں ہیں، ایرانی اپنی قدیم نسلی روایات پر فخر کرتے ہیں، مصری، شامی، فلسطینی، اردنی اور عراقی اس عرب اتحاد کا خواب دیکھ رہے ہیں جس میں مسلمان اور عرب عیسائی شریک ہوں۔ یہ تمام باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ سب قومیں اسلامی یک جہتی کے اس آئیڈیل سے دور چلی گئی ہیں جس کا سر اقبال ذکر کرتے ہیں، تو پھر آج اس اسلامی یک جہتی کا وجود کہاں ہے؟ وسط ایشیا میں نہیں کیونکہ سوویت خطوں میں راسخ الاعتقادی سے دوری بہت زیادہ ہے، چینی خطوں میں اغلباً قوم پرستانہ (تورانی) اور سوویت رجحانات کو بالادستی حاصل ہے۔ افغانستان اور عرب خاص ایشیا میں ہیں اور پھر مصر کے علاوہ شمالی افریقہ میں بہت سے اسلامی ممالک ہیں۔ ان ممالک میں مذہبی یک جہتی کا راسخ العقیدہ تصور کہاں تک موجود ہے، یہ انہیں نہیں معلوم، لیکن رپورٹیں ظاہر کرتی ہیں کہ قوم پرستی کے تصورات ان میں بھی نفوذ کر چکے ہیں اور قوم پرستی اور اسلام کی یک جہتی پہلو بہ پہلو نہیں چل سکتیں۔

سر محمد اقبال کے نقطہ نظر سے عالم اسلام کی یہ صورت حال افسوسناک ہونی چاہیے۔ قادیانی مسئلہ جو ان (اقبال) کے خیال میں اہم ہے ان عالمی واقعات کی روشنی میں غیر اہم ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قادیانی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پنجاب میں کوئی حقیقی رہنما اٹھے۔ لیکن وہ اس بڑے خطرے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ آغا خان ہندوستانی مسلمانوں کے رہنما ہیں۔ کیا وہ اسلام کی اس یک جہتی کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی واضح طور پر سر اقبال نے صراحت کی ہے۔ یہ سوالات ایک غیر مسلم کے لئے بھی با مقصد ہیں کیونکہ ان کا جواب ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی مقاصد کی واضح سمت متعین کرنے میں مضمر ہے اور یہ جواب ان جدید تصورات کے بارے میں ان کے رد عمل کا اظہار بھی ہوگا جس میں ہم میں سے بعض لوگ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسلام کی ایک عالمی برادری کی حیثیت سے ایک عالمی پالیسی ہونی چاہیے تاکہ وہ اسلامی یک جہتی کا تحفظ کر سکے۔ سر اقبال کو ہمیں اس پالیسی کے بارے میں کچھ اشارے دینے چاہیں تاکہ ان قومی، سماجی اور معاشی مسائل کو حل کیا جاسکے جن کا ہر ملک اور ہر گروہ کو سامنا ہے۔

اپنے مضمون میں سر اقبال نے جو واحد اشارہ دیا ہے وہ منفی نوعیت کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہبی مصلحین کو دبا دیا جائے۔ وہ راسخ العقیدہ ہندوؤں سے اتفاق کرتے ہیں کہ مذہبی اصلاح میں سماجی اصلاح شامل کر دی جائے۔ وہ ایک عارضی تجویز پیش کرتے ہیں کہ دیہاتی اور شہری مسلمانوں میں تفریق ختم کر دی جائے کیونکہ یہ پنجاب میں اسلامی وحدت کے خلاف ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کچھ مسلمان کاشتکار ہیں، کچھ بڑے زمیندار ہیں جو زمین کے کرایہ پر زندگی گزارتے ہیں، کچھ پیشہ ور افراد ہیں جو شہروں میں رہتے ہیں یا بینکار یا صنعتکار یا مزدور ہیں، کچھ لوگوں کے پاس زندگی کی وافر آسائشات ہیں جبکہ بہت سے بھوکے مرتے ہیں۔ غالباً یہ حقیقت ایسے ہی رہے گی اور اسلامی وحدت کو متاثر نہیں کرے گی۔ حال ہی میں قائم ہونے والی ہولی کونسل آف انڈیا نے مسلم لیڈرز، جس کے سر اقبال ایک رکن ہیں، کا غالباً مقصد یہی ہے کہ وہ اسلام کی وحدت اور یک

جہتی کو فروغ دے ایک بیرونی شخص کے لئے یہ بڑی عجیب بات ہے کہ برطانوی دارالامراء کے عیسائی ارکان اسلام کی ترقی اور یک جہتی میں اتنی دلچسپی رکھتے ہوں۔ لیکن اس کونسل کے قیام کے بعد کلیرج ہوٹل لندن میں جو لنچ دیا گیا اس موقع پر آغا خان نے اینگلو۔مسلم اتحاد کے تصور کو منکشف کیا۔ غالباً یہ دواکائیاں مل کر ایک وسیع تر وحدت کی تعمیر کریں گی۔ یہ سب کچھ الجھا ہوا ہے۔ میری خواہش ہے کہ سراقبال اس پر روشنی ڈالیں۔ (4)

پنڈت نہرو کا دوسرا خط، 'ہزہائی نس آغا خان'

پنڈت نہرو نے ڈسٹرکٹ جیل الموڑہ سے مارڈرن ریویو کلکتہ کو دوسرا خط 21 اگست 1935ء کو لکھا جو نومبر 1935 کے شمارے میں ص 505-507 پر شائع ہوا۔ یہ خط ہزہائی نس آغا خان کے بارے میں ہے جو اسماعیلی فرقے کے روحانی پیشوا تھے اور جنہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور سیاسی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔

پنڈت نہرو کہتے ہیں کہ سراقبال کا اسلامی یک جہتی کے لئے استدلال اور ان (اقبال) کا تقسیم پسندانہ رجحانات پر احتجاج ان کے لئے باعث حیرت ہے کہ ان کے درمیان خط فاصل کہاں کھینچا جائے۔ ہزہائی نس آغا خان کو ہندوستانی مسلمانوں کا ایک ممتاز رہنما سمجھا جاتا ہے اور حکومت ان کو اسی لئے عزت بخشی ہے۔ جب راسخ العقیدہ مسلمان رہنما مشکل میں ہوتے ہیں تو وہ آغا خان کے پناہ دینے والے پروں تلے پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سراقبال بھی ان کے سیاسی جھنڈے تلے مارچ کرتے ہیں۔ راسخ العقیدہ اسلام کے تحت سیاست، عمرانیات اور معاشیات کو مذہب سے بمشکل ہی جدا کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے ایک عام آدمی یہی خیال کرتا ہے کہ آغا خان مذہبی عقائد کی یک جہتی کے مثالی نمائندے ہیں۔ وہ (پنڈت جی) نہیں جانتے کہ کیا حقیقت ایسا ہی ہے اور وہ اس سلسلے میں اعلیٰ دانش مندی جانب سے آگہی کا خیر مقدم کریں گے۔ ان کے ایک عرصے سے اس بارے میں مبہم تصورات ہیں کہ آیا آغا خان راسخ العقیدہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر آغا خان کی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں نے حیرت انگیز

طریقے سے اپنی ذات میں نہایت متضاد صفات کو خوش اسلوبی سے یکجا کیا ہوا ہے۔ وہ انتہائی متضاد اور باہمی طور پر ہم آہنگ نہ ہونے والی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ ایک وسیع اور مالدار فرقے کے روحانی پیشوا ہیں۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ ان کے پیروکار انہیں تقریباً خدائی صفات کا حامل سمجھتے ہیں، ان کو بھاری نذرانے دیتے ہیں اور ان کی آمدنی کا بڑا حصہ روحانی برکات اور آخرت کی سزا کی معافی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات دلچسپی کا باعث ہے کہ دنیا کی یہ قدیم رسوم آج بھی شدت سے جاری ہیں۔ لیکن حقیقتاً غیر معمولی بات یہ ہے کہ یہ روحانی پیشوا جو ان رسوم کی ہمت افزائی کرتے ہیں جدیدوں کے جدید ہیں، مغربی اطوار کے مطابق انتہائی متمدن ہیں، گھر دوڑ کے میدان کے شہزادے ہیں اور لندن اور پیرس میں رہ کر انتہائی خوش باش رہتے ہیں۔ ایک غیر معمولی شخصیت ہی یہ دو برا بوجھ کامیابی سے اٹھا سکتی ہے۔ آغا خان یہ سب کچھ نہایت آسانی سے کرتے ہیں بلکہ اس میں بہت سی عوامی اور سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کی لیڈر شپ بھی شامل کر دیتے ہیں۔ یہ حیرت انگیز بازی گری ہے، چاہے کوئی آغا خان سے اختلاف کرے لیکن اس سلسلے میں وہ ان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن سراقبال کا اسلام کی یک جہتی پر بیان پڑھنے کے بعد جو سوال انہیں پریشان کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس یکجہتی سے کس طرح مناسبت رکھتا ہے۔ اس بات کا جواز ہو سکتا ہے کہ اپنے پیروکاروں کی رقوم ریس پر صرف کی جائیں کیونکہ یہ ایک چھوٹا معاملہ ہے لیکن آیا آغا خان کا فرقہ اسلامی یکجہتی میں شامل ہے یا نہیں۔

پنڈت نہرو کہتے ہیں کہ یہاں انہیں خاصے عرصے قبل پڑھا ہوا مارک ٹوین کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ وہ (مارک ٹوین) بمبئی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک دن اس کا ہندوستانی ملازم شدید ہیجان کے عالم میں تیزی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا اور کہا کہ خدا ان سے ملنے آرہا ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہو گیا اور جیسے ہی حیرت سے سنبھلا اس نے دیکھا کہ خدا آغا خان کی خوبصورت انسانی شکل و صورت میں آیا ہے۔

پنڈت جی کہتے ہیں یہ مارک ٹوین کے ملازم کی احقانہ غلطی تھی، آغا خان کو اس کا ذمہ دار قرار

نہیں دیا جاسکتا۔ جہاں تک ان کی معلومات کا تعلق ہے وہ (آغا خان) الوہیت کے مدعی نہیں ہیں۔ لیکن ایسے احمقوں کی کثیر تعداد موجود ہے جو انہیں خدائی یا نیم خدائی صفات کی حامل سمجھتی ہے۔ اسماعیلی فرقے کے بعض لوگ انہیں اوتار یا خدائی تجسیم قرار دیتے ہیں۔ انہیں (پنڈت جی کو) اس بات پر کوئی شکایت نہیں، لیکن یہ سب کچھ اسلام کی ایک جہتی سے کس طرح مناسبت رکھتا ہے؟

ایک امریکی سیاح الیگزینڈر پاول کی کتاب The Last Home of Mystery کے حوالے سے پنڈت جی لکھتے ہیں کہ آغا خان جس پانی سے غسل کرتے ہیں اسے محفوظ کر کے سونے کے عوض بیچا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ پاول نے اس سلسلے میں خیالی رنگ آمیزی کی ہو، لیکن یہ کہانی پرانی ہے اور اس کی تردید نہیں کی گئی، لیکن وہ دوبارہ حیران ہیں کہ یہ سب اسلام کی یکجہتی اور جمہوریت کو فروغ دیتا ہے۔

ایک اور واقعہ ان کے ذہن میں آتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے یونانیوں کو ملک سے باہر نکال کے ترکی میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا تھا۔ اس نے جو نیا خلیفہ مقرر کیا تھا اس سے اس کا سلوک لاپرواہی پر مبنی تھا، جس پر احتجاج ہوا۔ سید امیر علی اور آغا خان نے ترک وزیراعظم عصمت پاشا کے نام ایک خط میں انتہائی نرم لہجے میں خلیفہ کے اختیارات کے مسئلے پر احتجاج کیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا، اس میں برطانوی سازش کی بو آئی اور اس نے اچانک برطانیہ، آغا خان، خلیفہ اور قسطنطنیہ کے بعض صحافیوں پر شدید تنقید شروع کر دی۔ اس نے آغا خان سے نرمی کا سلوک نہیں کیا اور برطانیہ اور حکمران طبقوں کے ساتھ ان کے طویل اور قریبی تعلقات کے حوالے سے غیر منصفانہ استنباط کیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ جب ترکی اور انگلستان کی جنگ چھڑی تو آغا خان سابق خلیفہ کے مذہبی فرمان پر عمل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اس نے اس پر بھی زور دیا کہ آغا خان سچے مسلمان نہیں ہیں یا راسخ العقیدہ تو کسی طور نہیں ہیں کیونکہ کیا ان کا تعلق ایک زندیق فرقے سے نہیں ہے؟ یہ اور بہت کچھ اس نے کہا، اس کا مقصد تھا کہ آغا خان کو بدنام کیا جائے اور انہیں برطانوی خارجہ پالیسی میں شریک بنایا جائے، اور آغا خان کے احتجاج کو بہانہ بنا کر اتار ترک

نے قدیم خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کو مشکل ہی سے اسلام پر اتھارٹی کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس نے جان بوجھ کر اسلام کے کئی اصولوں سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ اس کے محرکات خالصتاً سیاسی تھے لیکن اس کی تنقید بظاہر زوردار تھی۔

پنڈت نہرو نے اس کے بعد ایک اور واقعہ نیوٹنٹس مین اخبار سے نقل کیا ہے جس میں آغا خان کے گھوڑے بہرام کے ڈربی ریس جیتنے کے بعد ایک خریداران سے اس گھوڑے کے لئے ایک سادہ چیک دیتا ہے تو آغا خاں اسے فردخت نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا وہ چاہتے ہیں کہ جب پیرانہ سالی میں وہ اپنی وئیل چیئر پر جا رہے ہوں گے تو ڈربی ریس جیتنے والے اس گھوڑے کو ساتھ جاتا دیکھ کر کہیں کہ وہ ایک مسرت بخش دن تھا۔

پنڈت جی کہتے ہیں کہ انہیں افسوس ہے کہ وہ آغا خاں سے کبھی نہیں ملے۔ انہوں نے ان کو صرف ایک دفعہ عدم تعاون کے دنوں میں خلافت ہاؤس (بمبئی) کے اجلاس میں دیکھا تھا۔ وہ ان سے زیادہ دور نہیں تھے لیکن اس پر کشش اور غیر معمولی شخصیت کو ایک نگاہ دیکھنے سے تسکین نہیں ہوتی اور انہوں نے اکثر یہ جاننا چاہا ہے کہ وہ کن عجیب و غریب صفات کے حامل ہیں جن کے ذریعے وہ مختلف کردار انتہائی کامیابی سے ادا کرتے ہیں۔ وہ تیرھویں صدی کو بیسویں صدی سے ملا دیتے ہیں، مکہ اور نیو مارکیٹ کو یکجا کر دیتے ہیں، اس دنیا اور اس دنیا کو ایک کر دیتے ہیں اور روحانیت، ریس، سیاست اور انبساط کو اکٹھا کر دیتے ہیں۔ اسلام کا دائرہ واقعی وسیع ہوگا جس میں یہ اتحاد اور یک جہتی شامل ہیں۔ لیکن سراقبال کے بیان پر نظر ڈالنے کے بعد وہ دوبارہ اس شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں (اقبال کو) تقلید نہ کرنے والوں کے ساتھ کوئی محبت نہیں۔ وہ (اقبال) راسخ الاعتقادی کے سیدھے اور تنگ راستے پر یقین رکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جو اس راستے سے بھٹک جاتے ہیں انہیں اپنے آپ کو فوراً ان کے انداز فکر سے علیحدہ کر لینا چاہیے۔ وہ اس شک اور مشکل کو کیسے دور کریں۔ کیا سراقبال اس معصے کو حل کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔ (5)

پنڈت نہرو کا تیسرا خط 'تمام مذاہب کے راسخ الاعتقاد پیروکار متحد ہو جاؤ!'

پنڈت نہرو کا تیسرا خط ماڈرن ریویو کلکتہ کی دسمبر 1935ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس خط میں پنڈت جی نے ایک جلوس کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے جب وہ بنارس میں اپنی کار پر جا رہے تھے۔ اس جلوس میں کٹر برہمن اور مولوی شامل تھے اور ہندو مسلم ایکتا (اتحاد) کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ مشترکہ ایجنسی ٹیشن شارڈا ایکٹ کے خلاف تھا یعنی 14 سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادی کا حق اور حکومت کا اس کی اجازت نہ دینا جو دھرم یا مذہب کے خلاف قرار دیا جا رہا تھا۔

پنڈت نہرو کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ دیوداس گاندھی اور بنارس کے چند ہندو دوست تھے۔ جہوم نے ان کو دیکھا اور پہچان لیا لیکن نہ خوش آمدید کہا اور نہ تعریفی نعرے لگائے۔ وہ کہتے ہیں نہ تو ہماری داڑھیاں تھیں نہ ہم نے مذہبی نشان لگا رکھے تھے، اس لئے ہمارے خلاف مخالفانہ نعرے لگائے گئے۔ ٹاؤن ہال کے قریب کسی نے جلوس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ ایک نوجوان نے کچھ پٹانے چھوڑے۔ ان کی آواز سن کر مظاہرین نے خیال کیا کہ پولیس یا فوج نے گولی چلا دی ہے۔ اس کے بعد وہ میزبانی سے منتشر ہو گئے۔ شارڈا ایکٹ کو ختم کرانے میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کے بعد بچپن کی شادیاں جاری رہیں۔

اس واقعے سے پنڈت نہرو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی مناقشت، مذہبی اختلافات کی بناء پر اتنی نہیں جتنی اقتصادی اور بیروزگاری کے خاتمے کی تگ و دو کی وجہ سے ہے۔ اس لئے دونوں مذاہب، ہندومت اور اسلام کے قدامت پسند لوگ یعنی پنڈت اور ملا اس تحریک کا جس کا مقصد معاشرتی، اقتصادی یا سیاسی اصلاح ہو مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو جاتے ہیں اور دونوں طبقے ہر اس شخص کو جو موجودہ نظام میں کسی تبدیلی یا اصلاح کا خواہش مند ہو، اپنا حقیقی دشمن سمجھتے ہیں۔

پنڈت نہرو نے قوم پرستی اور اس عہد (1930ء کی دہائی) میں اسلامی ممالک میں ابھرنے والی نیشنلزم پر مبنی تحریکات کی مثال دے کر یہ تاثر دیا ہے کہ ملی استحکام اور وحدت اسلامی کا تصور ختم

ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اسماعیلی فرقے کے عقائد اور اعمال اس یک جہتی کے منافی ہیں، اگر قادیانی اس جرم میں شریک ہیں تو اسماعیلی ان سے بڑھ کر ہیں۔

علامہ اقبال نے بڑے احسن انداز اور مثبت دلائل سے پنڈت جی کے سوالات کا جواب دیا ہے۔ اپنے جواب کے آخر میں علامہ نے روزنامہ اشار الہ آباد کے حوالے سے سر آغا خان کا بیان مطبوعہ 21 مارچ 1934ء نقل کیا ہے جس کے مطابق اسماعیلی فرقے کے عقائد وہی ہیں جو مسلمانوں کے معتقدات ہیں اور ان سے وحدت ملی میں رخنہ نہیں پڑتا۔

علامہ اقبال کا بنیادی نقطہ نظر

علامہ اقبال نے پنڈت نہرو کے ماڈرن ریو یو کلکتہ میں لکھے گئے خطوط کے جواب میں 22 جنوری 1936ء کو ایک تفصیلی مضمون اسلام اینڈ احمد ازم کے عنوان سے لکھا۔ اس سلسلے میں سید نذیر نیازی نے علامہ کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے بڑی نفیس بحث کی ہے۔ ہم اسے انہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

حضرت علامہ [اقبال] جماعت احمدیہ کے مخصوص عقائد پر تبصرہ فرماتے تو بمقابلہ امت اس کی سیاسی روش زیر بحث آتی۔ کسی سیاسی جماعت، کسی مذہبی فرقے یا ارباب سیاست میں سے کسی کی طرف اشارہ کرتے تو اس نقطہ نظر کے ماتحت جو انہوں نے ارض پاک و ہند کی سیاست میں مسلمانوں کی شرکت، ان کے طرز عمل اور مستقبل کے بارے میں قائم کیا۔ ہمیں معلوم ہے اس نقطہ نظر کا تعلق اسلام سے تھا، محض اختلاف مذہب و ملت، یا کسی وقتی اور مقامی مفاد و مصلحت سے نہیں تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ ارض پاک و ہند میں دو آزاد ریاستیں قائم ہوں ایک ہندو، دوسری اسلامی۔ یہ دوسری، یعنی اسلامی ریاست اس لیے کہ بہ حیثیت ایک اجتماع اسلام نے نوع انسانی کے حفظ و استحکام اور مسلسل نشوونما کے لئے ایک مخصوص نقطہ نظر اختیار کیا۔ اسلام کی بصیرت یہ ہے کہ نوع انسانی کا مستقبل جو اسبابا ایک ہے اس عالمگیر معاشرے کے قیام و استحکام سے وابستہ ہے جس کا وظیفہ یہ ہے کہ بطور ایک سیاسی اجتماعی تنظیم کے ان احوال و ظروف پر نظر رکھے جو تہذیب و ترقی کے

مساعد ہیں اور جن کے بغیر ناممکن ہے کہ فرد ہو یا جماعت اس کا قدم مراتب حیات میں آگے بڑھ سکے۔ لہذا حضرت علامہ کا ارشاد تھا کہ مسلمان اگر اس نکتے کو سمجھ گئے ہیں کہ امت ایک سیاسی اجتماعی ہیئت ہے، اگر انہیں معلوم ہے کہ دین عبارت ہے اس نظام حیات سے جو اس عالمگیر معاشرے کا مقوم اور صورت گر ہے لہذا امت اس کی تمہید، تودہ و خطرے ہیں جن کا سد باب ہوتے رہنا چاہیئے، ایک اصولی کہ امت کی اساس جس عقیدے پر قائم ہے اس کی تعبیر و تاویل میں کسی ایسی روش کو راہ نہ ملے جس سے اس کی وحدت میں فرق آئے، یا جس سے اس کی مرکزیت اور جمعیت میں خلل پیدا ہو، بالفاظ دیگر امت میں امت در امت یا نئی نئی گروہ بندیوں کا جواز نکلتا رہے۔ ایسا ہوا تو یہ امر امت کے دوام و استحکام کے منافی ہوگا۔ دوسرا خطرہ عمنی ہے اور وہ یہ کہ بطور ایک نظام حیات اسلام عبارت ہے جس ہمہ گیری اور کلیت سے، علی حالہ قائم رہے۔ ایسا نہ ہو ہم اسے محض ایک نظام اعمال و عقائد میں محدود کر دیں، حالانکہ اعمال و عقائد ہی وہ اساس ہے جس پر اسلام نے دین کی عمارت تیار کی اور دین کی غرض و غایت جیسا کہ ہمیں معلوم ہے یہ ہے کہ زندگی کی ساری وسعتوں کو ہر پہلو اور ہر جہت سے سمیٹتے ہوئے ایک مخصوص و متعین نصب العین پر مرکوز کر دے جس کا حصول ظاہر ہے بجز ایک ہمہ گیر جدوجہد کے ممکن نہیں۔ چنانچہ یہی جدوجہد ہے جسے ہم اقامت دین سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کی ہمہ گیری اور کلیت میں فرق آگیا، یا یوں کہیئے کہ اس نے اجزائے حیات کی شیرازہ بندی جس تعمیری مقصد کے لئے کی، قائم نہیں رہی تو اس کی وحدت لازماً اس شہوت سے بدل جائے گی جسے دین و دنیا یا اصطلاحاً ریاست اور کلیسا کی تفریق کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ امر بھی اسلامی تعلیمات کے منافی ہوگا۔ یہ دو خطرے تھے، ایک اندرونی، دوسرا بیرونی جن میں ایک طرف حضرت علامہ کا روئے سخن ان حضرات سے تھا، علماء ہوں یا غیر علماء جو دانستہ یا نادانستہ، یا کسی عارضی مصلحت کے خیال سے وطنی قومیت کا رستہ اختیار کرتے ہوئے دین کو مذہب کا مترادف قرار دے رہے تھے، دوسری جانب جماعت احمدیہ سے جسے مان لینا چاہیئے کہ امت کی وحدت، مرکزیت اور جمعیت کا عمل ختم رسالت کی بدولت ہمیشہ کے لئے مکمل ہو گیا۔ امت اسلامیہ میں کہ نوع انسانی کی

آخری گروہ بندی ہے اب کسی گروہ بندی کی خواہ اس کے لئے کوئی بھی عذر پیش کیا جائے گنجائش نہیں۔ گنجائش پیدا کی گئی تو یہ ایک نئی امت کی تمہید ہوگی جس سے نہ صرف امت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، وہ اس فریضے کی ادائیگی سے قاصر رہے گی جس کے لئے اس کی تشکیل ہوئی، بلکہ ہم یہ سمجھنے سے بھی قاصر رہیں گے کہ بہ حیثیت ایک دین اسلام کی دعوت کیا ہے [اور اس کا] مقصود و منہاج کیا ہے۔] حضرت علامہ چاہتے تھے جماعت احمدیہ اور نہیں تو اسی تفریق ہی سے سبق حاصل کرے جو محض 'خلافت' کے نزاع میں چند سال پہلے خود اس کی صفوں میں رونما ہو چکا ہے۔ وہ سمجھ لے احمدیت کی تعلیمات میں اس امر کی گنجائش موجود ہے کہ اس کے اندر بھی کوئی ایسی گروہ بندی ظہور کرے جس سے اس کی موجودہ گروہ بندی کا خاتمہ ہو جائے۔ پھر اگر پاکستان کی جدوجہد محض اس لئے کی گئی کہ وہ سیاسی اجتماعی ہیئت قائم ہو جسے ہم اسلامی ریاست سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کی ہستی جس متحد الخیال اور متحد العمل معاشرے سے وابستہ ہے اس میں نہ تو مذہب اور سیاست میں امتیاز کی گنجائش ہے، نہ باہم گرفتاریاں اور متضارب گروہ بندیوں۔ نہ کسی ایسی نئی گروہ بندی کی جو امت سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے باوجود اساساً اس کی نفی کر دے۔ (6)

پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی حمایت میں تین خطوط کیوں لکھے؟

پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی حمایت میں نومبر۔ دسمبر 1935ء کے مآذرن ریویو میں جو تین خطوط لکھے ان کے کئی محرکات تھے جن میں ایک بڑا محرک پروفیسر کوپ لینڈ نے بیان کیا ہے۔ پروفیسر آیان کوپ لینڈ (Ian Coupland) مونٹا یونیورسٹی آسٹریلیا میں پروفیسر تھے۔ رسالہ Pacific Affairs جلد 54 شمارہ نمبر 2 برائے دسمبر 1981ء میں ان کا ایک تحقیقی مقالہ Political Mobilization in Kashmir 1931-34 کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کے تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1934ء کے لگ بھگ کشمیر کمیٹی جیسے ادارے ختم ہو گئے تھے۔ قادیانیوں نے اپنی نئی تنظیم آل انڈیا کشمیر ایسوسی ایشن بنائی جس نے کشمیر میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ شیخ عبداللہ نے احمدیوں سے روابط مضبوط سے مضبوط تر کئے اور انڈین نیشنل کانگریس

سے تعلقات پیدا کیے۔ مرزا نمودے متورے پر سمیر میں چلائی جانے والی سول نافرمانی کی تحریک (1934ء) کو ختم کر دیا گیا کیونکہ قادیانیوں کو ڈر تھا کہ اس تحریک کی حمایت سے وہ برطانوی ہمدردیاں کھودیں گے۔ کانگریس کشمیر میں شیخ عبداللہ کی سرگرمیوں میں 1931ء سے دلچسپی رکھتی تھی اگرچہ اس کی ہمدردیاں ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ تھیں۔ کانگریسی لیڈروں میں پنڈت نہرو شیخ عبداللہ کی سیاسی بصیرت کے قائل تھے۔ جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس نومبر 1934ء کے خاتمے کے بعد شیخ عبداللہ نے لاہور آکر پنڈت نہرو اور کانگریسی رہنماؤں سے روابط پیدا کیے اور نیشنلسٹ خیالات اپنانے کا اعلان کیا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز بھی ان کے ہمنوا بن گئے اور انہوں نے سری نگر سے اخبار ہمدرد جاری کیا تاکہ ان خیالات کا پرچار کیا جاسکے۔ مسلم کانفرنس کے چوتھے اجلاس اکتوبر 1935ء کے بعد متحدہ قومیت کے علمبردار کشمیری ہندو شیخ عبداللہ کے بہت قریب ہو گئے، یہاں تک کہ سردار بدھ سنگھ، لالہ گردھاری لال آنند، درگا پرشاد دھر، پنڈت کاشی ناتھ، پنڈت شیا م لال صراف، جے این زٹشی وغیرہ شیخ صاحب کے خصوصی کارکن اور ہمنوا بن گئے۔ انہوں نے بڑے زور شور سے قوم پرستانہ نظریات اور متحدہ قومیت کا پرچار شروع کر دیا۔ ہندوؤں کا تعاون اتنا بڑھا کہ 8 جون 1936ء کو انہوں نے قوم پرست مسلمانوں کے ساتھ مل کر یوم ذمہ دار اسمبلی منایا۔ آخر کار مسلم کانفرنس نیشنل کانفرنس بن گئی۔

پنڈت نہرو نے 1935ء کے آخر میں احمدیوں کے دفاع میں ماڈرن ریویو کلکتہ کو تین خطوط لکھ کر ڈاکٹر اقبال اور دوسرے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے اعتراضات کا جواب دیا۔ اس سے قادیانیوں اور شیخ عبداللہ دونوں کو تقویت ملی جن کا طویل عرصے سے گٹھ جوڑ تھا۔ قادیانیوں کی کشمیر میں گرتی ہوئی سیاسی ساکھ سنبھل گئی اور ان کو اپنی نئی جماعت کشمیر ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے تبلیغی سرگرمیاں تیز کرنے کا موقع ملا دوسرے شیخ عبداللہ نے کھل کر کانگریس کی پالیسی اپنانے کا اعلان کیا۔ اخبار الفضل قادیان کشمیر میں بڑی تعداد میں تقسیم ہوتا تھا۔ اس میں پنڈت نہرو کی بہت تعریف کی جا رہی تھی کیونکہ انہوں نے احمدیوں کی وکالت کی تھی۔ 29 مئی 1936ء کو پنڈت نہرو کا لاہور

سٹیشن پر ایک قادیانی تنظیم نیشنل لیگ نے زبردست استقبال کیا اور ان کے حق میں فخر وطن، فخر قوم کے نعرے لگائے اس طرح 1936ء کے وسط میں قادیانی اور شیخ عبداللہ جو ایک ہی کشتی کے سوار تھے کانگریس کی گود میں چلے گئے۔

ایان کوپ لینڈ لکھتا ہے کہ اس کے بعد پنڈت نہرو نے احمدیوں کی حمایت ترک کر دی جیسا کہ ان کے ڈاکٹر اقبال کے ساتھ خطوط کے تبادلے سے ظاہر ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا شیخ عبداللہ کے ساتھ تعلقات پر کوئی اثر نہ پڑا جیسا کہ پنڈت نہرو کے علامہ اقبال کے نام خط مرقومہ 18 جون 1936ء اور علامہ اقبال کے جواب (21 جون 1936ء) سے ظاہر ہوتا ہے۔ اپنے خط میں علامہ اقبال نے احمدیوں کو اسلام اور ہندوستان کے غدار کہا۔

پنڈت نہرو کا دوسرا مقصد مسلمانوں کی قادیانیت مخالف تحریک کا رخ اسماعیلیت کی طرف موڑنا تھا۔ ہندو پریس آغا خان کے خلاف وقتاً فوقتاً مضامین شائع کرتا رہتا تھا۔ 1928ء کے بعد یہ سلسلہ تیز کر دیا گیا کیونکہ دسمبر 1928ء میں نہرو رپورٹ کے خلاف ایک آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس کی صدارت کے لئے آغا خان کو فرانس سے آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ گول میز کانفرنسوں کے دوران بھی آغا خان نے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ کیا اور ان کی نمائندگی کی۔ کانگریس ان کے خلاف تھی، نہرو ان کی سیاسی حیثیت کو مجروح کرنا اور مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد میں ان کی مساعی میں روڑا اٹکانا چاہتے تھے۔ اسماعیلی مسلم لیگ کی مالی امداد بھی کرتے تھے جو 1930ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں میں انتشار کا شکار تھی۔ آغا خان نے 21 مارچ 1934ء کے اخبار سٹار، الہ آباد میں اسلام کے بنیادی عقائد کو تسلیم کرنے سے متعلق ایک بیان شائع کروا کر اپنے خلاف اٹھنے والی مخالفت کو دبا دیا۔ چاہے یہ بیان تقیہ کی بناء پر ہی ہو جو اسماعیلیت میں جائز ہے، بہر حال اس کا مثبت اثر ہوا۔

پنڈت نہرو اشتراکیت کے حامی تھے اس لیے انہوں نے طنزیہ انداز میں ہندوستان کے تمام رائج العقیدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہونے کا مشورہ دیا تا کہ وہ متحد ہو کر معاشی اور سماجی اصلاح

کے پروگرام کو ناکام بنادیں۔ ان کا خیال تھا کہ ذاتی مفاد کے لیے ہندو برہمن اور مسلمان ملا آپس میں متحد ہو جاتے ہیں، ویسے ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ایسے اتحاد کو غیر مستحکم، منفی اور اشتراکیت اور متحدہ قومیت کی روح کے منافی سمجھتے تھے۔

پنڈت نہرو نے اسلامی ممالک میں ابھرنے والی 1930ء کی دہائی کی قوم پرستانہ تحریکات کی سیاسی اہمیت پر زور دیا اور ان کو اس ملی وحدت اور اسلامی استحکام کے منافی قرار دیا جس کا علامہ اقبال پر چار کر رہے تھے۔ ان کی تنقید اس عہد کی اسلامی دنیا کے تناظر میں کسی قدر قیمت کی حامل سمجھی جاسکتی تھی لیکن حالات کے تغیر کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ علامہ اقبال نے قادیانیت کا جس انداز سے فکری محاسبہ کیا اور جن حقائق کی نشاندہی کی ان کی صداقت اب تک قائم ہے اور ان ہی کے مطالبے کو 1974ء میں عملی شکل دی گئی۔

بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں:

”ان مضامین کے لکھنے کے مختلف محرکات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان دنوں ہندوستان (قبل تقسیم) میں سیاسی ہلچل تھی نئے آئین کے تحت انتخابات کی تیاریاں ہر طرف ہو رہی تھیں۔ مسلم لیگ کا نیا دور شروع ہو رہا تھا بد قسمتی سے مسلمانوں میں ہر جگہ انتشار نمایاں تھا۔ قادیانی جماعت نے کانگریس سے گفت و شنید شروع کر رکھی تھی تاکہ مستقبل کے ہندوستان میں انہیں کوئی مخصوص مقام حاصل ہو سکے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ اقبال نے اپنے ایک خط بنام پروفیسر الیاس برنی (مولف قادیانی مذہب) مورخہ 27 جون 1936ء میں لکھا۔

”آپ نے مرزا محمود کا تازہ بیان پڑھا ہو گا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ پیغمبر قوموں کو آزادی دلانے کے لیے آتے ہیں نہ کہ غلامی سکھانے کے لئے۔ اس بناء پر اپنے پیروؤں کو سیاست میں حصہ لینے کی تاکید کی ہے۔ (اقبال نامہ حصہ اول ص 8-417)

پنڈت نہرو کا خیال ہو گا کہ قادیانیوں کی حمایت سے وہ مسلمانوں کے انتشار میں اضافہ کر سکیں گے۔ (7)

پنڈت نہرو کے دیگر مقاصد کی علامہ اقبال نے اپنے جواب میں وضاحت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ قادیانی اور پنڈت جی دونوں مسلمانان ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے خصوصاً وہ نہیں چاہتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساس خود مختاری پیدا ہو۔ وہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کو بھی پسند نہیں کرتے۔

پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی حمایت کر کے ان کو احساس دلایا کہ کانگریس جیسی قوم پرست اور سیکولر نظریے کی حامی جماعت کے جدوجہد کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت میں وہ اپنے عقیدے کا پرچار کر سکتے ہیں اور امن و آزادی کے ساتھ رہ سکتے ہیں، جہاں راسخ العقیدہ مسلمانوں کا غلبہ ہو وہاں ان کے عقیدے، دینی نظریات اور وجود کو مسلسل خطرات درپیش رہیں گے اس طرح ان کی اقتصادی ترقی اور سیاسی مفادات متاثر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قادیانی 1936ء کے بعد کانگریس کے ہمنوا، متحدہ ہندوستان کے حامی اور تحریک پاکستان کے مخالف رہے اور قیام پاکستان کے بعد سیکولر اور سوشلسٹ عناصر سے مل کر ملک عزیز کی نظریاتی اساس، سلامتی اور یک جہتی کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔

عبدالمجید سالک کا نقطہ نظر

عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

”[علامہ اقبال کے مضامین] پر خدا جانے پنڈت جواہر لال نہرو کو کیا سوجھی، انھوں نے ”ماڈرن ریویو“ (کلکتہ) میں تین مضامین ”مسلمان اور احمدیت“ کے موضوع پر گھسیٹ ڈالے۔ چوں کہ ان مضامین میں بے خبری اور جہالت فقرے فقرے سے ظاہر تھی اور اصل مقصد محض فتنہ خیزی اور افتراق انگیزی تھا، اس لیے علامہ اقبال نے پنڈت جی کے جواب میں ایک جامع مانع مضمون لکھا، جس میں اس مسئلے کا فلسفیانہ تجزیہ کر کے نہایت فاضلانہ انداز میں پنڈت نہرو کے ایک ایک فقرے کا جواب دیا۔ اس کے بعد پنڈت جی خاموش ہو گئے۔ ان مضامین کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے انتہائی اشتعال اور ناراضی کی حالت میں بھی بانی احمدیت، امام جماعت احمدیہ

اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا۔ بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہایت متین و سنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں میں علامہ نے بعض ایسے نکات پیش کیے ہیں جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا۔“ (ذکر اقبال، ص 211)

یہ کہنا کہ پنڈت جی کے مضامین میں بے خبری اور جہالت فقرے فقرے سے ظاہر تھی، زیادتی ہے۔ پنڈت جی نے اپنے خیال میں جو مناسب سمجھا وہ لکھا، اس کی ایک قدر و قیمت ہے لیکن علامہ اقبال نے نہایت عمدہ طریقے سے ان کے دلائل کو رد کر دیا۔

علامہ اقبال کے مضمون پر قادیانی جریدے ریویو آف ریلی جنز کا تبصرہ (مارچ 1936ء) علامہ اقبال نے پنڈت نہرو کے اعتراضات کے جواب میں جو مضمون لکھا اس کی تردید میں الفضل قادیان نے 20 فروری سے 23 جون 1936ء تک ایک سلسلہ مضامین چودہ قسطوں میں شائع کیا۔ قادیانی پرچے ریویو آف ریلی جنز نے مارچ 1936ء کے شمارے میں ایک طویل مضمون ’ڈاکٹر اقبال اینڈ دی احمدیہ موومنٹ‘ شائع کیا۔ اس مضمون میں مدیر ریویو نے جو اہم باتیں لکھیں ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

علامہ اقبال کا مضمون اخلاص اور دیانت کی بجائے سیاست کے زیر اثر ہے۔ وہ احمدیہ نقطہ نظر کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔ اسماعیلیوں کے جو عقائد ہیں ان کی بنیاد پر وہ اسلامی استحکام میں شریک نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں میں ملی وحدت ہے ہی نہیں۔ اقبال خود ایسا رہنما بننا چاہتے ہیں جس کا انہوں نے ذکر کیا ہے اور یہی احمدیہ جماعت سے جھگڑے کی بنیاد ہے۔ مسیح و مہدی کے بارے میں پیش گوئیاں موجود ہیں ان کا آنا ضروری ہے۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر مسلمانوں نے اسلامی عقائد کے بارے میں دفاعی پوزیشن اختیار کی اور آریوں اور عیسائیوں نے جس زمانے میں اسلام پر اعتراض کئے اس وقت اقبال بچے تھے۔ سرسید، سید امیر علی، خدا بخش، مفتی عبدہ، چراغ علی، شبلی نعمانی وغیرہ نے اسلام کا دفاع کیا لیکن مرزا غلام احمد نے دفاع کے ساتھ ساتھ جارحانہ طرز عمل اختیار کیا۔ خطبات مدراس میں ڈاکٹر اقبال نے اسلام کو درست طور پر پیش نہیں کیا۔

اس کے بعد ریویو ختم نبوت، آمد مسیح اور مرزا صاحب کے دعاوی کے متعلق مذہبی بحث کرتا ہے اور کہتا ہے کہ احمدی برطانیہ کی امن پسندی کے باعث جہاد کے خلاف ہیں اور ہندوستان کو دارالسلام سمجھتے ہیں انہوں نے سیاسی غلامی قبول نہیں کی حکومت انہیں تحفظ اور مذہبی آزادی فراہم کرتی ہے۔ احمدی نئی زمین اور نیا آسمان بنائیں گے۔ (8)

علامہ اقبال کے مضمون 'اسلام اور احمد ازم'، پر سید نذیر نیازی نے بہت عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں پنڈت نہرو نے جو اعتراضات پیش کیے ان کے نتیجے میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی وحدت اور حفظ و استحکام کا دار و مدار کس اصول پر ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر یہ سوال اٹھا کہ آخر مسلمان کون ہے اور کون نہیں؟ یہ سوال مذہبی بھی تھا اور سیاسی بھی۔ اس کے جواب کے لئے مذہب اور سیاست دونوں پر نظر رکھنی ضروری تھی اور یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ اسلام بیک وقت دونوں کا جامع ہے مگر لوگ اس کا جواب یا تو سیاسی پہلو سے دیتے یا مذہبی پہلو سے لہذا یہ مسئلہ اور الجھتا چلا گیا۔

شروع شروع میں یہ نزاع صرف پنجاب تک محدود تھا پھر اس کی غیر معمولی اہمیت کے تحت بعض ایسے حقائق کی تشریح ناگزیر ہو گئی جن کا تعلق اس وقت کی سیاست سے ہر لحاظ سے گہرا تھا تو مجبوراً علامہ اقبال کو ایک بیان دینا پڑا اس طرح اس نزاع نے ایک ملی اور قومی مسئلے کی شکل اختیار کر لی۔

اس بیان پر اخبارات و رسائل نے طرح طرح کے سوالات اٹھائے یہ اس لیے تھا کہ علامہ اقبال نے ایک ایسے نزاع کا سلسلہ جو بظاہر مذہبی عقیدے تک محدود تھا سیاست و اجتماع سے علیٰ ہذا اس وقت کی آئینی جدوجہد سے جوڑ دیا تھا جس سے ہندوستان (غیر منقسم) کی ساری ملت متاثر ہوتی تھی۔ انہوں نے اسلام کی ہیئت اجتماعی علیٰ ہذا وحدت امت کی تعبیر ایک ایسے رنگ میں کی تھی جو سر تا پا درست ہی نہیں بلکہ اس اصول قومیت کے بھی منافی تھی جو کانگریس نے مغربی افکار سیاست سے اخذ کیا تھا۔ مگر یہ بات کانگریس کے عزائم، مقاصد اور تدابیر کے سر تا سر خلاف تھی۔ لہذا بیان شائع ہوا تو پنڈت جواہر لال نہرو خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے بھی کچھ دنوں کے بعد ایک بیان

شائع کر دیا جس میں اپنے مخصوص خیالات اور تصورات کے ماتحت حضرت علامہ کے ارشادات پر تنقید کرتے ہوئے مذہب اور سیاست دونوں کو زیر بحث لے آئے۔

حضرت علامہ کے بیان کی اشاعت کے بعد بعض تصریحات کا حقیقی سبب تو وہ نزاع تھا جو بدقسمتی سے مجلس احرار اور جماعت احمدیہ کے درمیان مسئلہ ختم نبوت کے بارے میں جاری تھا۔ لیکن اس نزاع کے دوران میں چونکہ وحدت امت کا مسئلہ بھی زیر بحث آ جاتا تھا لہذا اس امر کی تشریح لازم آتی تھی کہ اسلام کا نقطہ نظر سیاست و اجتماع اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں کیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بحثیں محض علمی اور فلسفیانہ تھیں۔ لیکن اُن کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جس سے اس وقت کی عملی سیاست متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

ہندو اکثریت کا مفاد غالباً اس میں تھا کہ مسلمانوں کے اندر اگر عقیدہ کچھ فرقتے موجود ہیں تو جس طرح بعض مذہبی امور میں ان کا اتحاد و اشتراک ناممکن ہے، بعینہ سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے بھی اگر وہ مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کی وفاداریاں بٹ جائیں تو اس میں از روئے مذہب کیا خرابی ہے۔ کیونکہ مذہب تو نام ہے انسان کے ذاتی عقیدے کا۔ بلکہ اگر یہ نقطہ نظر قبول کر لیا جائے تو وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ اس طرح عین ممکن ہو گا کہ ان میں سے کوئی جماعت، اسلامی اکثریت کے صوبوں میں بھی اپنی جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرنے لگے۔ مثلاً پنجاب ہی میں جہاں تین ملتیں یا تین قومیں۔ ہندو، مسلمان اور سکھ پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں اگر ایک یا دو ملتوں کا اضافہ ہو جائے اور وہ جداگانہ نیابت پر اصرار کریں تو اس پر اعتراض کی کوئی بات ہے، حالانکہ مذہب ہو یا سیاست جس پہلو سے دیکھا جائے مسلمانوں کی وحدت ملی علیٰ ہذا اس ملک میں ان کے مستقبل کے لئے یہ چیز بڑی خطرناک تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی مسئلہ زیر بحث کے ان پہلوؤں کو تو گویا بین السطور میں رکھا لیکن متن میں بڑے علمی انداز میں اور بظاہر سیاسیات سے بے تعلق ہو کر حضرت علامہ کے ارشادات پر تنقید اس طرح کی جس سے بعض اسلامی حقائق بہت بری طرح مجروح ہوتے تھے اور جس کے پیش نظر حضرت علامہ مجبور ہو

گئے کہ ان عمرانی، اخلاقی اور مذہبی حقائق سے پردہ اٹھائیں جن پر گویا بحیثیت ایک نظامِ مدنیّت اسلام کی عمارت کھڑی ہے اور جو اگر غیر واضح رہ جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ بجائے خود ایک سیاست و اجتماع اور ایک مستقل تہذیب ہے، غلط ہے۔

اس پر طرہ یہ کہ پنڈت جی نے اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے باوجود ان مسائل پر جس انداز میں رائے زنی کی تھی وہ بڑا ناگوار تھا اور اس لیے حضرت علامہ کو دلی رنج کے ساتھ پنڈت جی کے جواب میں قلم اٹھانا پڑا۔ میں لاہور ہی میں تھا جب پنڈت جی کا یہ بیان زیر بحث آیا اور تعجب ہوا کہ انہوں نے بطور ایک نظامِ حیات اسلام کو سمجھنے کی کوشش تو کی نہیں برعکس اس کے غلط خیالیوں اور غلط بیانیوں کا ایک طور مار باندھ دیا۔ دراصل پنڈت جی نے بلاوجہ ایک ایسی بحث میں دخل اندازی کی تھی جس کے وہ اہل نہیں تھے۔ ان کی روش بھی طالبِ علمانہ نہیں تھی بلکہ معترضانہ تھی یوں بھی ان کا خطاب ایک طرح سے حضرت علامہ ہی سے تھا اور اس نے حضرت علامہ کے لئے بجز اس کے کہ ان سب حقائق کی تشریح فرمائیں جن کی طرف پنڈت جی نے اشارہ کیا تھا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ پنڈت جی کے بیان کو بے جواب چھوڑ دینا ایک طرح سے اعترافِ شکست تھا جس سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچتا۔ لہذا کچھ دنوں کی رو وکد کے بعد حضرت علامہ نے فیصلہ کیا کہ ایک طویل بیان شائع کریں۔ حالانکہ انہیں آرام کی سخت ضرورت تھی..... یہی بیان ہے جو بعد میں ’اسلام اور احمدیت‘ کے عنوان سے شائع ہوا“ (9)

حضرت تمیمی نے اس مضمون اسلام اینڈ احمدازم کے شائع ہونے کے بعد علامہ اقبال سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ تمیمی صاحب کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا ”قاضیانیت اور اس کے بانی کی مختلف تحریروں اور دعاوی کے پیش نظر ثانی الذکر کی شخصیت نفسیاتی مطالعہ کے لئے بہت موزوں ہے۔ صوفی صاحب (غلام مصطفیٰ تبسم) بولے کہ آپ سے بڑھ کر موصوف کا تجزیہ نفسی کون کر سکے گا، ارشاد ہوا کہ موضوع واقعی دلچسپ ہے لیکن صحت کی خرابی مانع ہے کوئی نوجوان اس کام کے لئے اٹھے تو اس کی ہر ممکن امداد اور رہبری کروں گا۔“

اس کے بعد آپ نے ان نقصانات کو گنایا جو قادیانیت کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں مذاہب عالم کو برداشت کرنے پڑے..... آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ قادیانیت کی تعلیم اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی اور مذہبی ترقی کے کس طرح منافی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات پر آپ نے ظاہر فرمایا کہ قادیانیت کے ارکان اعلیٰ اسلاف صالحین کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں۔

مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور کا ذکر درمیان میں آتا رہا۔ آخر کار میں نے عرض کیا کہ آپ مسئلہ ختم نبوت پر کچھ ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم انہم کی صریح نص قرآنی کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔“ (10)

قادیانیوں نے جس قدر مضامین علامہ اقبال کے مضامین کے جواب میں لکھے ان میں کسی مضمون میں انکے علمی اور ٹھوس دلائل کا رد نہیں ہے۔ ان تبصروں کا انداز معذرت خواہانہ ہے کہیں کہیں علامہ اقبال کی ذات گرامی پر تنقید ہے زیادہ زور مرزا صاحب کی صداقت اور ان کی اسلام کے لئے نام نہاد خدمات پر دیا گیا جو ان کے دعاوی کا ثمر بتایا گیا۔ احمدیہ جماعت کو اس بات سے خوشی اور اطمینان تھا کہ پنڈت نہرو جیسے فاضل اور صدر کانگریس نے اقبال کے مضامین کا جواب دیا ہے۔ قادیانیوں نے پنڈت نہرو کی لاہور آمد پر ان کے حق میں فخر وطن فخر قوم کے نعرے لگائے۔ وہ ان کے خیالات میں اپنی صداقت اور دفاع ڈھونڈتے رہے اور لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ پنڈت نہرو جیسے شخص کے جوابات کے بعد علامہ اقبال کے مضامین کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ لیکن اہل علم حضرات اور تعلیم یافتہ طبقے نے قادیانی تبصروں اور مضامین کو کوئی اہمیت نہ دی اور علامہ اقبال کے مثبت علمی دلائل کی روشنی میں انہیں پہلی بار ختم نبوت کی تمدنی اہمیت اور تحریک قادیانیت کے مذہبی اور سیاسی مضمرات سے کما حقہ شناسائی حاصل ہوئی۔

ایک اہم قادیانی بزرگ نے راقم کو بتایا کہ علامہ اقبال کے ان مضامین کی اشاعت کے وقت وہ قادیان میں تھے۔ جماعت کا ان کے خلاف سخت رد عمل تھا لوگ اقبال کو بہت برا بھلا کہتے تھے۔ بعض قادیانی اکابر کی تجویز تھی کہ ان مضامین کا جواب مشہور قادیانی مناظر یا چوہدری ظفر اللہ دیں

لیکن چوہدری صاحب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہونے کے باعث اس بحث میں الجھنے سے قاصر تھے۔ قادیانیوں نے الزام لگایا کہ اقبال احراری ہو گیا ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں کا لیڈر بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ قادیانی اور لاہوری جماعت کے وہ افراد جن کی علامہ اقبال سے شناسائی تھی ایک مشترکہ وفد تشکیل دے کر ان کے پاس جانا چاہتے تھے، تاکہ ان کو احمدیہ لٹرچر پیش کریں اور اس بات پر قائل کریں کہ اگر وہ ان مضامین سے دستبردار نہیں ہوتے تو کم از کم بعض باتوں کی تشریح کر دیں اور بعض کی تردید میں ایک بیان جاری کریں لیکن اس تجویز پر عمل نہ کیا گیا۔ دراصل قادیانی علامہ اقبال کے مضمون کو اختلافی بنا کر اس کی وقعت کم کرنا چاہتے تھے آخر کار انہوں نے 1950ء کی دہائی میں ایک سازش کی، لیکن ناکام ہوئے۔ اس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال کے مضمون کے خلاف قادیانیوں کا شرانگیزی پروپیگنڈا

1950ء کی دہائی کے اوائل میں قادیانیوں نے الفضل ربوہ میں یہ شرانگیز مہم شروع کی کہ علامہ اقبال کا مضمون Islam and Ahmadism جو پنڈت نہرو کے تین خطوط کے جواب میں ہے انہوں نے تحریر نہیں کیا تھا۔ الفضل نے اس سلسلے میں بعض ادارے تحریر کئے اور داخلی شواہد کی آڑ لے کر یہ دعویٰ کیا کہ یہ علامہ اقبال کا مضمون ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا نے قادیانی دجل و فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے ایسے سامان پیدا کئے کہ ان کا منہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ ہم اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

لاہور کے ایک معزز کشمیری خاندان کے تین تعلیم یافتہ افراد تھے۔ ان کے اسمائے گرامی خواجہ کریم بخش، خواجہ رحیم بخش اور خواجہ امیر بخش تھے۔ ان کی کوشی لالی لاج تھڑیاں بھا بھڑیاں میں تھی جو بازار حکیمان اور سید مٹھا بازار کے درمیان واقع ہے، ان میں سے خواجہ کریم بخش کے صاحبزادے کے۔ اے وحید (خواجہ عبدالوحید) کو تقریباً 30 سال تک علامہ اقبال کی نیاز مندی کا شرف حاصل رہا۔ انہوں نے اپنے شب و روز کا حال بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس کی تلخیص پیش کی

جاتی ہے:

1934ء میں انجمن خدام الدین لاہور نے ایک انگریزی پندرہ روزہ 'اسلام' کا اجراء کیا اور ادارہ نویسی کا کام انہیں سونپا گیا۔ پرچے پر خواجہ محمد رشید وائس کا نام بطور ایڈیٹر چھپتا تھا، جن کا لاہور کے معروف آسٹریلیا خاندان سے تعلق تھا۔ خواجہ وحید چونکہ سرکاری ملازم تھے اس لئے کسی پرچے کے ڈیکلریشن کی درخواست نہ دے سکتے تھے۔ وہ پندرہ روزہ اسلام کے لیے اہم ملی مسائل پر علامہ اقبال کے بیانات حاصل کرتے رہتے تھے۔ وہ جریدہ اسلام کے اداروں کے لئے اکثر اوقات علامہ اقبال سے ہدایات بھی لیتے تھے۔ کبھی کبھی خواجہ وحید یہ چاہتے تھے کہ وہ علامہ سے ان مسائل پر ڈکٹیشن لیں جو اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں حل طلب تھے۔ 1930ء کی دہائی میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قادیانی مسئلہ پریشان کن صورت اختیار کئے ہوئے تھا اور علامہ اقبال اس بحث میں پوری طرح شامل ہو گئے تھے۔ ان کے بیانات اور خطوط مشہور اخبارات میں چھپ رہے تھے۔ اب علامہ نے سوچا کہ اس مسئلہ پر ایک جامع مضمون لکھا جائے اور یہ رائے دی کہ خواجہ وحید اس کو ایک ہی قسط میں رسالہ اسلام میں شائع کریں۔ خواجہ وحید لکھتے ہیں علامہ نے انہیں اپنا مسودہ دیا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں اس کو ٹائپ کروں۔ میں نے وہ مسودہ ٹائپ کر دیا۔ یہ مضمون تقریباً 25 فلسکیپ کاغذوں پر مشتمل تھا۔ وہ جب اسے ٹائپ کر کے علامہ کے پاس لے گئے تو انہوں نے ان کا قلم لے کر اس میں درستی کی۔ ہر صفحہ تصحیحات سے بھرا ہوا تھا۔ بعض اوقات انہوں نے پورے کا پورا صفحہ کاٹ دیا اور اسے دوبارہ یا تو حاشیہ میں یا صفحے کی پشت پر لکھا۔ خواجہ وحید لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس تصحیح شدہ مسودہ کو از سر نو ٹائپ کیا جو 'اسلام' 22 جنوری 1936ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون نے ملک میں بڑی ہلچل پیدا کی۔ اصل ٹائپ شدہ مسودہ جس کی علامہ اقبال نے تصحیح کی تھی اور جس پر دستخط کئے تھے تقریباً 20 سال تک ان (خواجہ وحید) کے پاس ہی رہا۔

1950ء کی دہائی میں خواجہ وحید نے کراچی سے پندرہ روزہ الاسلام شائع کرنا شروع کیا۔ اس

وقت قادیانی پر چے روزنامہ الفضل ربوہ نے بعض قسط وار ادارے شائع کئے جن میں دعویٰ کیا گیا کہ مضمون 'اسلام اینڈ احمد ازم، علامہ اقبال نے نہیں لکھا تھا اور بعض داخلی شواہد کی بناء پر کہا گیا کہ وہ ایسا مضمون لکھ ہی نہ سکتے تھے۔

خوبہ وحید نے الاسلام کے پہلے صفحے پر ایک مضمون شائع کیا اور بتایا کہ زیر بحث مضمون کا اصل ناسپ شدہ مسودہ ابھی تک ان کے پاس ہے اور اس کے آخری صفحے کی فوٹو گراف چھاپ دی جس کے آخر میں علامہ اقبال کے دستخط تھے اور لکھا تھا:-

”میں انجمن خدام الدین لاہور کو اجازت دیتا ہوں کہ درج بالا مضمون ایک پمفلٹ کی صورت میں مفت تقسیم کے لئے شائع کر دے“ محمد اقبال 7 جنوری 1936ء۔ اس پر دوبارہ ہل چل مچی۔ بعض پبلک تنظیمیں اس کو محفوظ کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے اسے اقبال اکادمی کو دے دیا جہاں دیگر اہم مسودات کے ساتھ یہ مسودہ نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔ (11)

علامہ اقبال کے مضامین پر اہل علم کی آراء ملک محمد جعفر خان:

ملک محمد جعفر خان، بھٹو دور حکومت میں اقلیتی امور کے وزیر رہے۔ وہ نہات سلجھے ہوئے شخص تھے۔ ان کے خاندان کے بعض افراد احمدی تھے۔ ملک محمد جعفر خان نے احمدیت ترک کر دی اور ایک کتاب احمدیہ تحریک لکھی جس میں اس تحریک کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ احمدیہ تحریک خالص مذہبی مسئلہ نہیں بلکہ ایک سیاسی اور معاشرتی سوال ہے سب سے معقول چیز جو احمدیت کی نسبت لکھی گئی وہ علامہ اقبال کے وہ مضامین و خطوط ہیں جو انہوں نے عرصہ ہوا پنڈت نہرو کے ساتھ ایک سیاسی نوعیت کی بحث کے دوران لکھے۔ ملک صاحب کہتے ہیں کہ احمدی جماعت کے دو طبقے ہیں ایک مرزا صاحب کا خاندان ہے جو خلافت کے نام پر برسر اقتدار چلا آ رہا ہے دوسرے احمدی مولوی ہیں جو معاشی مجبور یوں کا شکار ہیں ان میں تنخواہ دار مبلغ منافقت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ربوہ آزادی اور مذہب کی سوچ میں حائل ہے۔ ایک نظام کو

عارضی طور پر تنظیمی پابندیوں سے قائم رکھا جاسکتا ہے لیکن بالآخر اس کا ختم ہونا مقدر ہے۔ (12)

خاندانی اقتدار اور وجاہت قائم کرنا مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کا لازمی جزو تھا۔ (13) مرزا صاحب وہ پہلے نبی ہیں جن کی پیغمبری پیغام سے خالی ہے۔ (14) ان کا سارا مشن اپنی ذات تک محدود تھا۔ جو کچھ انہوں نے لکھا اس مشن کو سامنے رکھ کر لکھا۔ انہوں نے اپنی ذاتی ضرورت کو قوی ضرورت کے طور پر پیش کیا۔

عبدالحمید سالک:

حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں (قادیانیت کے خلاف مضامین۔ معنف) میں علامہ اقبال نے بعض ایسے نکات پیش کئے ہیں جن کا جواب ابھی تک کسی سے نہیں ہوا ہے۔ (15)

مرحوم مولانا عبدالقدوس ہاشمی:

مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد میں لائبریرین تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور نہایت عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ دیندار اور متقی شخص تھے۔ راقم ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور ان سے علمی استفادہ کرتا تھا۔ ایک ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ وہ حیدر آباد دکن ہی میں تھے جب علامہ اقبال کے قادیانیت کے خلاف مضامین اخبارات میں آئے۔ انہوں نے ان کا بغور مطالعہ کیا اور یہ رائے قائم کی کہ علامہ اقبال نے احمدیت کی حقیقی نوعیت اور اس کی سیاسی روح کو درست سمجھا ہے اور اسے مربوط اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے، اس لئے قادیانیوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ان مضامین کی اشاعت کے بعد انہوں نے قادیانیوں کے جوابات ان کے رسائل و جرائد میں دیکھے جو ان کے پاس باقاعدگی سے آتے تھے۔ مولانا ہاشمی نے مولانا الیاس برنی کے ساتھ حیدر آباد دکن میں کام کیا تھا۔ انہوں نے مولانا برنی کی کتاب قادیانی مذہب کی تالیف میں حصہ لیا جس کا ذکر کتاب میں موجود ہے۔ مولانا ہاشمی نے کہا کہ انہوں نے ہندو پریس میں علامہ کے مضامین پر تبصرے پڑھے۔ پنڈت نہرو کے خطوط چھپنے پر تو قادیانی بہت خوش تھے مگر

علامہ اقبال کا جواب آنے کے بعد وہ قدرے سرد پڑ گئے اور برہم ہوئے۔ اس وقت (1935-36) سے لے کر اب تک (1969) انہیں کوئی ایسا مضمون دکھائی نہیں دیا جس میں علامہ اقبال کے محکم دلائل کی دانشمندانہ انداز سے تردید کی گئی ہو۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ ان کا خیال ہے پھر فرمایا، نہیں انہیں یقین ہے کہ اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکے گا، ویسے قادیانی ہر بات کا اوٹ پٹا نگ جواب دینے اور خلط بحث میں ید طولی رکھتے ہیں۔ اور جب کبھی پاکستان میں قادیانی غیر مسلم اقلیت قرار پا گئے تو ان مضامین کی صداقت پر مہر ثبت ہو جائے گی۔ شاید قادیانیوں کو پھر کوئی جواب دینے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ (16)

میاں محمد شفیع (م۔ش)

مشہور صحافی اور علامہ اقبال کے نیازمند میاں محمد شفیع (م۔ش) نے اپنے ایک مضمون علامہ اقبال کے آخری ایام میں پنڈت نہرو کے خطوط کے جواب میں تحریر کردہ مضمون کے متعلق درج ذیل تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

علامہ اقبال کی عظمت کا تاج ان کا وہ واضح اور روشن بیان ہے جو ایک ایسے مسئلہ کے بارے میں جاری کیا گیا جس نے ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف احمدیہ جماعت میں نہ ختم ہونے والی ایک تلخ بحث کا آغاز کر رکھا تھا۔ یہ ختم نبوت کے بنیادی عقیدے کی حقیقی اہمیت کے متعلق وضاحت تھی یعنی حضرت محمد ﷺ خدا کے فرستادہ نبیوں میں آخری نبی ہیں۔ یہ موقع پنڈت نہرو کے ماڈرن ریویو میں شائع شدہ ایک مضمون نے فراہم کر دیا جس میں انہوں نے احمدیت کی مخالفت کو فرقہ وارانہ تنگ نظری پر محمول کیا تھا۔ ایک مشہور ہندوستانی رہنما کے قلم سے نکلے اس مضمون نے مجلس احرار اور احمدیہ مبلغوں کے درمیان تلخ بحث پیدا کر دی تھی اور تمام ملکی فضا بے چینی کا شکار تھی۔ علامہ اقبال نے پہلی دفعہ کوئی جارحانہ فقرہ اور غیر شایان شان تاثر دیئے بغیر نہایت سادہ لیکن زور دار زبان میں ہندوستان جیسے ملک میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد کسی نئے نبی کی آمد سے پیدا ہونے والے تہذیبی، روحانی اور سیاسی مضمرات کو تفصیل سے واضح کیا جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا تھا۔ جو

کچھ احرار اور رائج العقیدہ مسلمان پوری زندگی کے جہاد کے نتیجے میں حاصل نہ کر سکے وہ سب کچھ علامہ اقبال کے ایک درخشاں بیان سے حاصل ہو گیا۔ میں یہ بات لازمی طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ اب تک میں نے کسی کو ارثر سے ایک بھی ایسا بیان نہیں دیکھا جو تسلی بخش طور پر ان مناسب سوالات کے جوابات فراہم کرتا ہو جو علامہ اقبال نے اٹھائے اور کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ایک شخص کو خدا کی حاصل کردہ وحی پر مبنی نبی نبوت کی حضرت نبی کریم ﷺ کی نبوت کے بعد ضرورت کیوں پیش آئی جب کہ وحی محمدی ﷺ قرآن کریم میں موجود ہے اور قرآن ہر زمانے کے لیے انسانیت کو رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ (17)

میاں محمد شفیع (م۔ش) ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں کہ احرار مسئلہ شہید گنج میں پسپا ہو چکے تھے۔ اور سر ظفر اللہ وائسرائے کنسل کے نمبر بن گئے تھے یہ دور احمدیوں کی تاریخ میں کامرانیوں اور پھلنے پھولنے کا دور تھا لیکن اس دور میں حضرت علامہ اقبال کے احمدیت اور قادیانیت پر معرکہ لاء بیان نے احمدیت کے فروغ کے خلاف بند باندھ دیا۔ حضرت علامہ اقبال نے مسئلہ ختم نبوت کی ایسی عالمانہ تاریخی اور دینی نقطہ نگاہ سے تشریح کی کہ ایک عام مسلمان کو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ توحید کے ساتھ ختم رسالت کا عقیدہ کیوں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ احمدیوں کے خلاف جو تحریک مولوی محمد حسین بٹالوی سے شروع ہو کر احرار کے منظم ہاتھوں تک پہنچی تھی اور جس کے زور شور سے جاری رہنے کے باوصف احمدیت فروغ پذیر تھی اس کو اقبال نے جس طرح تاریخ کی روشنی میں پیش کر کے عقل و فہم رکھنے والے مسلمانوں کے لئے غور و فکر کا سامان بہم پہنچایا میرے خیال کے مطابق اس نے احمدیت کے فروغ کی لہر کے سامنے بند باندھ دیا تھا۔ اقبال نے نہایت سنجیدگی اور تحقیقی نقطہ نظر سے بانی سلسلہ احمدیت کے دعویٰ کا جائزہ لے کر دانشوروں کو دعوت فکر دی۔ ان کا نقطہ نگاہ اور موقف آج بھی احمدی دانشوروں اور مفکرین کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ (18)

انجمن حمایت اسلام سے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کا اخراج

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ (1872-1936ء) کلانور گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ 5 فروری

1892ء کو مرزا غلام احمد قادیانی سے بیعت کی۔ 1897ء میں ایل ایم ایس کا امتحان پاس کیا، پنجاب کے مختلف علاقوں میں بطور ڈاکٹر کام کرتے رہے 1915ء میں لاہور میں پریکٹس شروع کی۔ لاہور جماعت کے مرکز برائڈرتھ روڈ کے قریب ان کی ڈسپنسری تھی۔ انہوں نے مختلف اسلامی انجمنوں میں کام کیا، انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے ممبر تھے۔ سر شفیع لیگ کے ممبر رہے۔ 1931ء میں جب کشمیر کمیٹی بنی تو ڈاکٹر صاحب اور محمد یعقوب خان ایڈیٹر لائٹ لاہور اس کے ممبروں میں شامل تھے۔ 1933ء میں جب مرزا محمود نے کمیٹی سے استعفیٰ دیا اور علامہ اقبال اس کے عارضی صدر بنے تو مرزا یعقوب بیگ نے ان کو دوبارہ صدر بنانے اور کمیٹی میں قادیانیوں کا عمل دخل قائم رکھنے کے لئے کئی سازشوں میں حصہ لیا انہوں نے گذشتہ اختلافات بھلا کر مرزا محمود اور قادیانی جماعت کا بھر پور ساتھ دیا یہی طرز عمل یعقوب خان ایڈیٹر لائٹ کا تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک طویل بیان بھی اخبارات میں شائع کرایا۔ علامہ اقبال ان کی سرگرمیوں سے آگاہ تھے۔

1936ء میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے انہوں نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور استعفیٰ واپس لینے کے لئے یہ شرط رکھی کہ انجمن مرزائیوں کے متعلق اپنے موقف کی وضاحت کرے۔ مولوی محمد علی نے 20 جنوری 1936ء کو انجمن کے سیکریٹری جنرل کے نام ایک خط لکھا جس میں لاہوری احمدیوں کے ممبر رہنے کا جواز پیش کیا۔ (19) مرزا یعقوب بیگ نے بھی ایک درد مندانہ اپیل شائع کی۔

علامہ اقبال کی تحریک پر انجمن حمایت اسلام لاہور نے 2 فروری 1936ء کو ایک قرارداد منظور کی جس کی رو سے احمدیوں کو انجمن کی رکنیت سے خارج کر دیا گیا اور آئندہ کے لئے بھی ان کے ممبر بننے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

جنرل کونسل کے اجلاس کے دوران یعقوب بیگ نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی۔ مولوی غلام محی الدین قصوری کے دو تین مرتبہ ٹوکنے کے باوجود بولتے رہے۔ قادیانی یہ کہتے ہیں کہ اس رنج میں وہ فالج کے حملے کا شکار ہو کر 12 فروری 1936ء کو وفات پا گئے۔ ہفت روزہ لائٹ لاہور نے 16 فروری 1936ء کی اشاعت میں ان کو شہید کا مرتبہ دیا۔ (20) لیکن اس واقعے سے قبل ہی وہ

بیمار چلے آرہے تھے اور اسی بیماری سے وفات پائی۔

چونکہ وہ علامہ اقبال کے قریبی دوست رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور کو ایک خط لکھا جس میں کہا:

ابھی اخبار انقلاب میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت رنج ہوا۔ وہ شرافت کا پیکر مجسم تھے اور فطرتاً ہی نوع انسان کے ہمدرد۔ خدا تعالیٰ ان پر رحمت کرے۔ مجھے معلوم نہیں ان کے صاحبزادے کہاں ہیں آپ ازراہ عنایت میرا پیغام ہمدردی ان تک پہنچا دیں میں کئی روز سے نزلہ کی وجہ سے صاحب فراش ہوں ورنہ اس مقصد کے لئے خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

والسلام محمد اقبال (21)

اقبال دشمنی کے دیگر انداز

قادیانیوں کے اقبال دشمن کردار کے متنوع پہلوؤں میں ایک ان کے خلاف شاعری کا سہارا لینا ہے اور دوسرا ان کے فلسفے اور پیغام کی وقعت کو کم کرنا ہے۔ الفضل قادیان اور پیغام صلح لاہور میں تلاش کرنے پر ان موضوعات پر کافی مواد مل سکتا ہے۔ تنگ دامنوں کے باعث ہم ایک نظم اور مختصر مواد بطور نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اقبال شناسوں کو چاہیے کہ وہ قادیانی اخبارات و رسائل کو کھنگال کر تمام مواد ایک جگہ جمع کریں اور اس کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ لیں۔

اقبال کے خلاف نظم

حسن رہتاسی قادیانیوں کے ایک 'نامور' شاعر تھے، اپنے نسیم سیفی اور ثاقب زیدی کی طرح۔ بعض قادیانی ان کو اقبال کا ہم پلہ شاعر سمجھتے ہیں اور بعض انہیں عوامی شاعر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ 'کلام حسن' شائع ہو چکا ہے جس میں چیدہ چیدہ نظمیں قطعے وغیرہ ہیں۔ ہم ان قادیانیوں کے خیال سے متفق ہیں جو ان کو عوامی شاعر کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے صابن کی ٹکیہ اور بیوی کی انگلیہ پر بھی مزاحیہ نظمیں کہی ہیں۔

۱۹۳۵ء میں جب علامہ اقبال کے قادیانیت کے خلاف مضامین پر تعلیم یافتہ طبقہ ان کو خراج عقیدت پیش کر رہا تھا تو قادیان میں چکی داڑھی اور منشی چہروں والی ایک کمیپ ان کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھی، اس زمانے میں حسن رہتاسی نے یہ نظم کہی۔ (۲۲)

اقبال و حسن

قاتل و سفاک یا خونخوار باش	رہزن و قزاق و غلط آزار باش
مے پرست و میخور میخور باش	بے حیا و بے وفا غدار باش
دربدر آوارہ و بے کار باش	رخت فتنہ پوش و در بازار باش
قوم چوں بیدار باشد تو بخسپ	چوں غنجد قوم تو بیدار باش
کار بند تشقہ و زناں شو	زرد پوش و خالص سردار باش
کاذب و کذاب باش و مغتری	حیلہ ساز و حیلہ جو مکار باش
پر حذر شو از صف کرپانیاں	باشریفاں بر سر پیکار باش
گر بیفتد مسجد، پروا مکن	تو بفکر درہم و دینار باش
تا نشست کونسلے آمد بدست	غور کن در مشتری ہوشیار باش
زیں مہمات عظیمہ فرصح	عزم بیت اللہ کن و زوار باش
از خدا ہم از نبی بیزار باش	در ہمہ اوصاف برخوردار باش
چوں شوی کامل بہر نوع کمال	بر جہاد قادیاں، تیار باش
تا توانی با جماعت	یار باش
رونی ہنگامہ	احرار باش

(اقبال)

حسن رہتاسی

عطیہ بھوپال بہ سراقبال

واہ! کیا شان ہے تیری بھوپال
اور بھی ہو بلند جاہ و جلال
تا دم زیت پائیں گے تجھ سے
پانصد ماہوار سر اقبال

قادیانی کہتے ہیں مغربی اقوام کو دجال اور یا جوج ماجوج سب سے پہلے مرزا غلام احمد نے کہا
علامہ اقبال نے بھی اپنے شعر میں یہی کہا ہے۔

کھل گئے یا جوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف ینسلون

2- علامہ اقبال فرماتے ہیں:

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روم کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

وہ کون سے قدسی تھے جن سے علامہ اقبال نے غلبہ و فتح اسلام کا پیغام پھر سے سنا۔ قادیانی دعویٰ
کرتے ہیں کہ کیا حضرت اقدس (مرزا صاحب) اور جماعت احمدیہ کے علاوہ کوئی اور تحریک اس
زمانے میں اٹھی جس نے نہ صرف غلبہ و فتح دین کا یقین اپنے پیروؤں میں پیدا کیا بلکہ ان ہی کی
مساعی سے دنیا میں عالمگیر سطح پر فتح اسلام کے دروازے کھل گئے۔ (23)

3- علامہ اقبال کا شعر ہے

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

قادیانی منطق کی رو سے یہ شان جلالی اور جمالی کے ظہور کی اصطلاحیں کیا تحریک احمدیت سے

مخصوص نہیں۔ سب لوگ حضرت اقدس اور جماعت احمدیہ کے اس نظریے سے کہ اب زمانہ اسلام کی روحانی تلوار اور اخلاقی قوت کا ہے سراسر منکر ہو رہے تھے۔ پھر جائے غور ہے کہ علامہ اقبال نے اسلام اور ملت کی شانِ جلالی کی بجائے شانِ جمالی کے ظہور کے نظریہ و یقین کو کہاں سے لیا تھا۔ (24)

الفضل قادیان لکھتا ہے:

مرزا صاحب اپنے ایک الہام لولاک لما خلقت الافلاک کی تشریح اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں یوں کرتے ہیں ”برایک عظیم الشان مصلح کے وقت روحانی طور پر نیا آسمان اور نئی زمین بنائی جاتی ہے یعنی ملائکہ کو اس کے مقاصد کی خدمت میں لگادیا جاتا ہے اور زمین پر مستعد طبعیتیں پیدا کی جاتی ہیں پس یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔

حال ہی (1935) میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا اردو منظوم کلام بالِ جبریل کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں سے چند اشعار اس نظریہ کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

پھر کہتے ہیں:

جہاں تمام ہے میراثِ مردِ مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتہِ لولاک

ع جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

The Solidarity of Islam

Some time back I read with great interest an article by Sir Mohammad Iqbal on the *Solidarity of Islam*.² Sir Mohammad's writings always attract me, for they give me some insight into a world which I find difficult to understand. So far as religion and the religious outlook are concerned, I live in the outer darkness, but, in spite of this deficiency in me, I am sufficiently interested in the historical, cultural and even the philosophical aspects of religion.

In his article Sir Mohammad dealt with the issue created between the *Qadianis* and the orthodox Muslims and considered this as 'extremely important' and affecting the integrity of the parent community. The *Qadianis*, according to him, had discarded the basic idea of Islam—the finality of prophethood—and had reverted to some extent to early Judaism and the pre-Islamic Magian culture. He was therefore of opinion that this 'rebellious group' should not be allowed to carry on its subversive propaganda, and, in any event, should not be permitted to masquerade as Muslims. *Qadiani* leaders did not accept Sir Mohammad's argument and vigorously repelled some of his statements.

Sir Mohammad's article raises a host of issues and makes one furiously to think in many directions. I hope that he will develop some of his points in future writings, for they deserve a full discussion. For the moment I am concerned with one aspect of his argument only. It would be impertinent of me to discuss the validity or otherwise of this argument from the point of view of Islam. That is a matter for erudite Muslims. For me Sir Mohammad is an authority on Islam worthy of respect and I must assume that he represents the orthodox viewpoint correctly.

If that is so, I presume that Turkey under the Ataturk Kemal has certainly ceased to be an Islamic country in any sense of the word. Egypt has been powerfully influenced by religious reformers who have tried to put new garments on the ancient truths, and, I imagine, that Sir Mohammad does not approve of this modernist tendency. The

1. Almera District Jail, 20 August 1935. Published in *Modern Review*, November 1935, pp. 504-505.

2. Iqbal published in 1934 the article called *Qadianis and the Orthodox Muslim*. The religious movement of *Qadianism* was started in 1889 by Mirza Ghulam Ahmed who claimed to be the "promised Prophet of every nation".

Arabs of Syria and Palestine more or less follow Egyptian thought-currents and are partly influenced by Turkey's example. Iran is definitely looking for its cultural inspiration to pre-Islamic Magian days. In all these countries, indeed in every country of western and middle Asia, nationalist ideas are rapidly growing, usually at the expense of the pure and orthodox religious outlook. Islam, as Sir Mohammad tells us, repudiates the race idea (and of course the geographical idea) and founds itself on the religious idea alone. But in the Islamic countries of western Asia we find today the race and geographical ideas all-powerful. The Turk takes pride in the Turanian race; the Iranian in his own ancient racial traditions; the Egyptian and Syrian (as well as the people of Palestine, Trans-Jordan and Iraq) dream of Arab unity in which the Muslim and Christian Arabs will share.

All this clearly shows that these nations have fallen away from the ideal of Islamic solidarity which Sir Mohammad lays down. Where then does this solidarity exist at present? Not in Central Asia, for in the Soviet parts the breakaway from orthodoxy is far greater; in the Chinese parts the predominant currents are probably nationalist (Turanian) and Soviet. Afghanistan and Arabia proper remain in Asia, and then there are a number of Islamic countries in North Africa, apart from Egypt. How far this orthodox outlook of religious solidarity is prevalent there, I do not know, but reports indicate that nationalistic ideas have penetrated even there. And nationalism and the solidarity of Islam do not fit in side by side. Each weakens the other.

From Sir Mohammad's viewpoint this situation in the Islamic world must be a deplorable one. The question of the *Qadianis*, important as he considers it, sinks into relative insignificance before these world happenings. He stresses the need of a real leader to rise in the Punjab apparently to combat the 'Qadiani menace'. But what lead does he give in regard to the wider menace? The Aga Khan, we are told, is the leader of Indian Muslims. Does he stand for this solidarity of Islam as defined by Sir Mohammad Iqbal?

These questions are relevant even for a non-Muslim; for on the answer to them depends the political, social and economic orientation of Indian Muslims and their reactions to modern ideas and thought-currents, in which some of us are interested. Islam being a world community, its policy must also be a world policy if it is to preserve that sense of solidarity. Sir Mohammad should give us some hint of this policy to meet the nationalist, social and economic problems that confront each country and group.

The only hint he gives in the article is a negative one: that religious reformers should be put down. In this, he tells us, he cordially agrees with the orthodox Hindus, and religious reform is supposed to include all social reform. He makes a provisional suggestion also that the distinction of rural and urban Muslims be abolished, as this interferes with the unity of Islam in the Punjab. Presumably the fact that some Muslims cultivate the fields, some are big landlords and live on rent, some are professional people living in cities, or bankers, or artisans or captains of industry, or labourers, some have an abundance of good things of life while most others starve, will still remain and will not interfere with Islamic unity.

Perhaps it is the object of the recently-formed "Council of Peers and Moslem Leaders", of which Sir Mohanmad Iqbal is a member, to further this unity and the solidarity of Islam. To an outsider it seems a little odd that Christian members of the British House of Lords should be so interested in the progress and solidarity of Islam. But at the lunch at Claridge's in London that followed the formation of this Council, the Aga Khan, we are told, "developed the theme of Anglo-Moslem unity." Perhaps the two unities lead into one another, and build up a wider and more embracing unity. It is all very confusing. I wish Sir Mohammad would explain and enlighten us.

10. His Highness the Aga Khan¹

Sir Mohanmad Iqbal's earnest plea for the solidarity of Islam and his protest against fissiparous tendencies led me to wonder as to where the line should be drawn. His Highness the Aga Khan is today considered the outstanding leader of the Indian Muslims. The government treats him and honours him as such, orthodox Muslim leaders, whenever in trouble or faced with difficulty, seek refuge under his sheltering wings. Even Sir Mohammad might, so to speak, be said to march under his political banner. From the point of view of orthodox Islam and its unity of conception, politics, sociology and economics can hardly be separated from religion. One would think therefore that the Aga

1. Almora District Jail, 21 August 1935. Published in *Modern Review*, November 1935, pp. 505-507.

Pandit Nehru's Letters

Khan was the ideal representative of this unity and solidarity of religious belief.

Whether this is so I do not know and I should welcome wiser people to inform me. I have long had a vague kind of idea, however, that he hardly belongs to the inner orthodox fold, and I have admired him for the truly wonderful way in which he manages to combine, and gracefully carry in his own person, the most contradictory qualities, and to take part in multifarious activities which appear to be mutually antagonistic and irreconcilable. He is the head and spiritual leader of a widespread and wealthy sect and, I am told, that almost divine attributes are assigned to him by his devoted followers. He is said to derive a vast ecclesiastical revenue from the faithful, and one of his sources of income is supposed to be the granting of spiritual favours and indulgences. It is interesting to find these old-world practices being continued today in an intensive form. But the really remarkable fact is that the spiritual head who supports and encourages these practices is a modern of moderns, highly cultured in western ways, a prince of the turf, most at home in London and Paris. Only a remarkable personality could successfully carry this double burden. The Aga Khan not only does so with supreme ease, but he adds to it many public and political activities as well as the leadership of the Indian Muslims. That is an astonishing feat which, even though one may disagree with the Aga Khan, fills one with admiration for him.

But the question that is troubling me, as a result of reading Sir Mohammad Iqbal's statement on the solidarity of Islam, is how all this fits in with that solidarity. It may be perfectly justifiable to spend the money of the faithful on racing; that, after all, is a minor matter. But is the Aga Khan's sect a partner in that Islamic solidarity or not? I remember reading long ago Mark Twain's account of a visit paid by the Aga Khan to him in Bombay. Mark Twain's Indian servant burst into his hotel room one day in a state of extreme excitement and announced that God had come to pay a call on him. Many pray to God daily—and Mark Twain was a religious type of man—and each one of us, according to his early teaching or mental and spiritual development, has his own conception of God. But the best of us are apt to be taken aback by a sudden visitation of the Almighty. Mark Twain, after he had recovered from his initial surprise, discovered that God had come to him in the handsome and corporeal shape of the Aga Khan.

This characterization of the Aga Khan as God was no doubt a foolish error of Mark Twain's servant—and the Aga Khan cannot be held responsible for it. So far as I know, he does not claim divinity. But

there seem to be a large number of foolish persons about who ascribe certain divine or semi-divine attributes to him. Some of the propagandists of the sect describe him as an avatar or incarnation of the divinity. They have every right to do so if they believe in it. I have absolutely no complaint. But how does all this fit in with the solidarity of Islam?

A story that has long fascinated me is the account of the Aga Khan giving chits or notes of introduction for the archangel Gabriel to his followers, or some of them. This, so the tale runs, is to ensure their comfort and happiness in the next world. I cannot vouch for the truth of this story, but I do hope that it is based on fact. There is little of romance left in this drab and dreary world, and to correspond with an archangel is a captivating idea. It seems to bring heaven nearer, and even our life here down below assumes a rosier hue.

Then there is another story, not so attractive, but nevertheless extraordinary enough. I had heard of it previously and lately I read an account in a book by an American traveller. Colonel E. Alexander Powell, in his *The Last Home of Mystery*, referring to the Aga Khan says:

His sanctity is so great, indeed, in the eyes of his followers, that the water in which he bathes is carefully conserved and sold annually to the representatives of the various Mohammedan sects at a ceremony held once each year at Aga Khan Hall in Bombay. The price paid for this holy water is the Aga Khan's weight in gold, the scales used for the weighing ceremony being adjusted to the fraction of an ounce troy. As the Aga Khan is a plump little man, the price paid for his used bath water is a high one.

Colonel Powell has probably added some journalistic and fancy touches of his own to this account. But the story is an old and oft-repeated one and, to my knowledge, has never been contradicted. If the Aga Khan can find a profitable use for his bath water and at the same time serve and exalt faith, surely it is no one's business to object. Tastes differ and it takes all sorts to make this world of ours. But again I am led to wonder if all this furthers the solidarity and 'democracy of Islam'.

Another incident comes to my mind. It was after the War when Kemal Pasha had driven out the Greeks and established himself firmly in power in Turkey. His casual treatment of the new Caliph, appointed by him, drew forth a protest²—a very polite protest—from the Aga

2. Along with Sayeed Amir Ali, the Aga Khan wrote a letter to Ismet Pasha, Prime Minister of Turkey, protesting against the threatened attacks on the powers of the Caliph. The letter was condemned as British propaganda.

Pandit Nehru's Letters

Khan and Mr. Amir Ali.³ Kemal Pasha scented an English conspiracy and suddenly started a fierce attack on England, the Aga Khan, the Caliph and some Constantinople journalists. He was not very polite to the Aga Khan and drew all manner of unjust inferences from his long and intimate association with the British Government and the ruling classes. He pointed out that the Aga Khan had not been keen on following the previous Caliph's religious mandate when war had broken out between Turkey and England. He even stressed that the Aga Khan was no true Muslim, or at any rate, not an orthodox one, for did he not belong to a heretical sect? All this and much more he said, keen on gaining his end, which was to discredit the Aga Khan and make him out to be an accomplice of British foreign policy. And making the Aga Khan's move a pretext, the Ataturk put an end to the ancient Khilafat.

Kemal Pasha can hardly be said to be an authority on Islam, for he has deliberately broken away from many of its tenets. His motives were purely political, but his criticisms were not wholly without apparent force.

As I write this, another aspect of the Aga Khan's many-sided personality comes up before me. It is given in an intimate, every day account and is thus all the more valuable and revealing. It appears in the *London Bystander* and I have come across it in a quotation in the *New Statesman*. This tells us that,

Although the Aga Khan loves the good things of life—he is a great gourmet and has his own cook—there is a very considerable spiritual side to his life. It is hard to pin him down exactly on this point. But he will admit to a strong feeling of the battle between good and evil. At any rate, he is a wonderfully good sportsman, and when Jack Joel offered him a blank cheque the other day for Bahram he refused because he said he wanted in his decrepit old age to be wheeled alongside his Derby winner and say, 'Well, that was a jolly day!'

Much to my regret I have never met the Aga Khan. Only once have I seen him. This was in the early noncooperation days at a Khilafat meeting in Bombay, where I sat not far from him on the platform. But this glimpse of an attractive and remarkable personality was hardly satisfying, and I have often wanted to find out what curious quality he possesses which enables him to fill with distinction so many and such varied roles, combining the thirteenth century with the

(1849-1928), member, Bengal Legislative Council, 1878, judge, Calcutta High Court, 1890; appointed to the judicial committee of the Privy Council, 1909.

twentieth, Mecca and Newmarket, this world and the next, spirituality and racing, politics and pleasure. Wide indeed must be the range of Islam to include all this in its unity and solidarity.

But looking at Sir Mohammad Iqbal's statement I am again led to doubt, for Sir Mohammad seems to have little love for the non-conformists. He believes in the straight and narrow path of true orthodoxy and those who stray from this must forthwith remove themselves from his ken. How then am I to remove this doubt and difficulty? Will Sir Mohammad help in solving the riddle?

11. Orthodox of All Religions, Unite!

Some years ago I happened to be in Benares and as I was driving through the narrow city streets, my car was held up by a crowd. A procession was passing through and, apart from the processionists, there were many sightseers and little boys intent on sharing in the fun. Crowds interest me and I got down from the car to find out what was afoot. The procession was certainly an interesting one and it had certain unique features. We saw Brahmans, the most orthodox of their kind, with all manner of caste-marks proudly displayed on their foreheads, marching shoulder to shoulder with bearded *moulties*, the priests from the *ghats* fraternized with the *mullahs* from the mosques, and one of the standards they carried in triumph bore the flaming device: 'Hindu Mussalman Ekta Ki Jai'—Victory to Hindu-Muslim Unity! Very gratifying, we thought. But still what was all this about?

We soon found out from their cries and the many other standards they carried. This was a joint protest by the orthodox of both religions against the Sarda Act (or perhaps it was a Bill at the time) which prohibited marriages of girls under fourteen. The pious and the holy of both faiths had joined ranks and hands to declare that they would not submit to this outrage on their deepest convictions and most cherished rights. Were they going to be bullied by the threats of so-called reformers into giving up their right to marry child-wives?

1. Alkness District Jail, 25 August 1935. Published in *Alkness District Jail*, December 1935, pp. 625-631.

Never! Law or no law they would continue to marry little immature girls—for was not post-puberty marriage a sin?—and thus enhance the glory of religion. Had not a noted Vaidya (physician) of Benares stated that in order to proclaim his adherence to the ancient *dharma* and his abhorrence of new-fangled notions like the Sarda Act, he, even he, although he was round about sixty years of age, would marry afresh a girl under the prescribed legal age? Faith and religion had built up their great structures on the sacrifice of their votaries. Surely the movement against the Sarda Act would not lack its martyrs.

We mixed with the crowd and marched along for some distance by the side of the procession. Devadas Gandhi was with me and some Benares friends and soon we were recognized by the processionists. They did not welcome us or shower greetings on us, and I am afraid we did not encourage them to do so. Our looks and attire separated us from the ranks of the faithful—we had neither beards nor caste-marks—and we carried on an irreverent and somewhat aggressive commentary on the procession and its sponsors. Offensive slogans were hurled at us and there was some jostling about. Just then the procession arrived at the Town Hall and for some reason or other started stone throwing. A bright young person thereupon pulled some crackers and this had an extraordinary effect on the serried ranks of the orthodox. Evidently thinking that the police or the military had opened fire, they dispersed and vanished with exceeding rapidity. A few crackers were enough to put the procession to flight, but not even a cracker was required to make the British Government in India surrender on this issue. A little shouting, in which oddly enough the Muslims took the leading share, was enough to kill and bury the Sarda Act. It was feeble enough at birth with all manner of provisions which hindered its enforcement and then it gave six months' grace which resulted in a very spate of child marriages. And then, after the six months were over? Nothing happened; child marriages continued as before and government and magistrates looked the other way while the Sarda Act was torn to shreds and cast to the dogs. In some instances the person who ventured to bring a breach to a court, himself got into trouble for his pains and was fined. True, in one instance a Punjab villager who had given his ten-year daughter in marriage and deliberately broken the provisions of the Sarda Act despite warning was sentenced to one month's imprisonment. But this error on the part of the magistrate was soon rectified by the Punjab Government who hastened to send a telegram ordering the release of the offender against the Act. (This case has been taken from Miss E.F. Rathbone's interesting little book, *Child Marriage*.)

Pandit Nehru's Letters

Khan was the ideal representative of this unity and solidarity of religious belief.

Whether this is so I do not know and I should welcome wiser people to inform me. I have long had a vague kind of idea, however, that he hardly belongs to the inner orthodox fold, and I have admired him for the truly wonderful way in which he manages to combine, and gracefully carry in his own person, the most contradictory qualities, and to take part in multifarious activities which appear to be mutually antagonistic and irreconcilable. He is the head and spiritual leader of a widespread and wealthy sect and, I am told, that almost divine attributes are assigned to him by his devoted followers. He is said to derive a vast ecclesiastical revenue from the faithful, and one of his sources of income is supposed to be the granting of spiritual favours and indulgences. It is interesting to find these old-world practices being continued today in an intensive form. But the really remarkable fact is that the spiritual head who supports and encourages these practices is a modern of moderns, highly cultured in western ways, a prince of the turf, most at home in London and Paris. Only a remarkable personality could successfully carry this double burden. The Aga Khan not only does so with supreme ease, but he adds to it many public and political activities as well as the leadership of the Indian Muslims. That is an astonishing feat which, even though one may disagree with the Aga Khan, fills one with admiration for him.

But the question that is troubling me, as a result of reading Sir Mohammad Iqbal's statement on the solidarity of Islam, is how all this fits in with that solidarity. It may be perfectly justifiable to spend the money of the faithful on racing; that, after all, is a minor matter. But is the Aga Khan's sect a partner in that Islamic solidarity or not? I remember reading long ago Mark Twain's account of a visit paid by the Aga Khan to him in Bombay. Mark Twain's Indian servant burst into his hotel room one day in a state of extreme excitement and announced that God had come to pay a call on him. Many pray to God daily—and Mark Twain was a religious type of man—and each one of us, according to his early teaching or mental and spiritual development, has his own conception of God. But the best of us are apt to be taken aback by a sudden visitation of the Almighty. Mark Twain, after he had recovered from his initial surprise, discovered that God had come to him in the handsome and corporeal shape of the Aga Khan.

This characterization of the Aga Khan as God was no doubt a foolish error of Mark Twain's servant—and the Aga Khan cannot be held responsible for it. So far as I know, he does not claim divinity. But

there seem to be a large number of foolish persons about who ascribe certain divine or semi-divine attributes to him. Some of the propagandists of the sect describe him as an avatar or incarnation of the divinity. They have every right to do so if they believe in it. I have absolutely no complaint. But how does all this fit in with the solidarity of Islam?

A story that has long fascinated me is the account of the Aga Khan giving chits or notes of introduction for the archangel Gabriel to his followers, or some of them. This, so the tale runs, is to ensure their comfort and happiness in the next world. I cannot vouch for the truth of this story, but I do hope that it is based on fact. There is little of romance left in this drab and dreary world, and to correspond with an archangel is a captivating idea. It seems to bring heaven nearer, and even our life here down below assumes a rosier hue.

Then there is another story, not so attractive, but nevertheless extraordinary enough. I had heard of it previously and lately I read an account in a book by an American traveller. Colonel E. Alexander Powell, in his *The Last House of Mystery*, referring to the Aga Khan says:

His sanctity is so great, indeed, in the eyes of his followers, that the water in which he bathes is carefully conserved and sold annually to the representatives of the various Mohammedan sects at a ceremony held once each year at Aga Khan Hall in Bombay. The price paid for this holy water is the Aga Khan's weight in gold, the scales used for the weighing ceremony being adjusted to the fraction of an ounce troy. As the Aga Khan is a plump little man, the price paid for his used bath water is a high one.

Colonel Powell has probably added some journalistic and fancy touches of his own to this account. But the story is an old and oft-repeated one and, to my knowledge, has never been contradicted. If the Aga Khan can find a profitable use for his bath water and at the same time serve and exalt faith, surely it is no one's business to object. Tastes differ and it takes all sorts to make this world of ours. But again I am led to wonder if all this furthers the solidarity and 'democracy of Islam'.

Another incident comes to my mind. It was after the War when Keenal Pasha had driven out the Greeks and established himself firmly in power in Turkey. His casual treatment of the new Caliph, appointed by him, drew forth a protest²—a very polite protest—from the Aga

2. Along with Sayeed Amir Ali, the Aga Khan wrote a letter to Ismet Pasha, Prime Minister of Turkey, protesting against the threatened attacks on the powers of the Caliph. The letter was condemned as British propaganda.

Pandit Nehru's Letters

Khan and Mr. Amir Ali.³ Kemal Pasha scented an English conspiracy and suddenly started a fierce attack on England, the Aga Khan, the Caliph and some Constantinople journalists. He was not very polite to the Aga Khan and drew all manner of unjust inferences from his long and intimate association with the British Government and the ruling classes. He pointed out that the Aga Khan had not been keen on following the previous Caliph's religious mandate when war had broken out between Turkey and England. He even stressed that the Aga Khan was no true Muslim, or at any rate, not an orthodox one, for did he not belong to a heretical sect? All this and much more he said, keen on gaining his end, which was to discredit the Aga Khan and make him out to be an accomplice of British foreign policy. And making the Aga Khan's move a pretext, the Ataturk put an end to the ancient Khilafat.

Kemal Pasha can hardly be said to be an authority on Islam, for he has deliberately broken away from many of its tenets. His motives were purely political, but his criticisms were not wholly without apparent force.

As I write this, another aspect of the Aga Khan's many-sided personality comes up before me. It is given in an intimate, every day account and is thus all the more valuable and revealing. It appears in the *London Bystander* and I have come across it in a quotation in the *New Statesman*. This tells us that,

Although the Aga Khan loves the good things of life—he is a great gourmet and has his own cook—there is a very considerable spiritual side to his life. It is hard to pin him down exactly on this point. But he will admit to a strong feeling of the battle between good and evil. At any rate, he is a wonderfully good sportsman, and when Jack Joel offered him a blank cheque the other day for Bahram he refused because he said he wanted in his decrepit old age to be wheeled alongside his Derby winner and say, 'Well, that was a jolly day!'

Much to my regret I have never met the Aga Khan. Only once have I seen him. This was in the early noncooperation days at a Khilafat meeting in Bombay, where I sat not far from him on the platform. But this glimpse of an attractive and remarkable personality was hardly satisfying, and I have often wanted to find out what curious quality he possesses which enables him to fill with distinction so many and such varied roles, combining the thirteenth century with the

(1849-1928); member, Bengal Legislative Council, 1878, judge, Calcutta High Court, 1890; appointed to the judicial committee of the Privy Council, 1909.

twentieth, Mecca and Newmarket, this world and the next, spirituality and racing, politics and pleasure. Wide indeed must be the range of Islam to include all this in its unity and solidarity.

But looking at Sir Mohammad Iqbal's statement I am again led to doubt, for Sir Mohammad seems to have little love for the non-conformists. He believes in the straight and narrow path of true orthodoxy and those who stray from this must forthwith remove themselves from his ken. How then am I to remove this doubt and difficulty? Will Sir Mohammad help in solving the riddle?

11. Orthodox of All Religions, Unite!

Some years ago I happened to be in Benares and as I was driving through the narrow city streets, my car was held up by a crowd. A procession was passing through and, apart from the processionists, there were many sightseers and little boys intent on sharing in the fun. Crowds interest me and I got down from the car to find out what was afoot. The procession was certainly an interesting one and it had certain unique features. We saw Brahmans, the most orthodox of their kind, with all manner of caste-marks proudly displayed on their foreheads, marching shoulder to shoulder with bearded *moulvies*; the priests from the *ghats* fraternized with the *mullahs* from the mosques, and one of the standards they carried in triumph bore the flaming device: 'Hindu Muslim Ekta Ki Jai'—Victory to Hindu-Muslim Unity! Very gratifying, we thought. But still what was all this about?

We soon found out from their cries and the many other standards they carried. This was a joint protest by the orthodox of both religions against the Sarda Act (or perhaps it was a Bill at the time) which prohibited marriages of girls under fourteen. The pious and the holy of both faiths had joined ranks and hands to declare that they would not submit to this outrage on their deepest convictions and most cherished rights. Were they going to be bullied by the threats of so-called reformers into giving up their right to marry child-wives?

1. Almor District Jail, 25 August 1935. Published in *Al-Balagh*, December 1935, pp. 625-631.

Never! Law or no law they would continue to marry little immature girls—for was not post-puberty marriage a sin?—and thus enhance the glory of religion. Had not a noted *Vaidya* (physician) of Benares stated that in order to proclaim his adherence to the ancient *dharma* and his abhorrence of new-fangled notions like the Sarda Act, he, even he, although he was round about sixty years of age, would marry afresh a girl under the prescribed legal age? Faith and religion had built up their great structures on the sacrifice of their votaries. Surely the movement against the Sarda Act would not lack its martyrs.

We mixed with the crowd and marched along for some distance by the side of the procession. Devadas Gandhi was with me and some Benares friends and soon we were recognized by the processionists. They did not welcome us or shower greetings on us, and I am afraid we did not encourage them to do so. Our looks and attire separated us from the ranks of the faithful—we had neither beards nor caste-marks—and we carried on an irreverent and somewhat aggressive commentary on the procession and its sponsors. Offensive slogans were hurled at us and there was some jostling about. Just then the procession arrived at the Town Hall and for some reason or other started stone throwing. A bright young person thereupon pulled some crackers and this had an extraordinary effect on the serried ranks of the orthodox. Evidently thinking that the police or the military had opened fire, they dispersed and vanished with exceeding rapidity. A few crackers were enough to put the procession to flight, but not even a cracker was required to make the British Government in India surrender on this issue. A little shouting, in which oddly enough the Muslims took the leading share, was enough to kill and bury the Sarda Act. It was feeble enough at birth with all manner of provisions which hindered its enforcement and then it gave six months' grace which resulted in a very spate of child marriages. And then, after the six months were over? Nothing happened; child marriages continued as before and government and magistrates looked the other way while the Sarda Act was torn to shreds and cast to the dogs. In some instances the person who ventured to bring a breach to a court, himself got into trouble for his pains and was fined. True, in one instance a Punjab villager who had given his ten-year daughter in marriage and deliberately broken the provisions of the Sarda Act despite warning was sentenced to one month's imprisonment. But this error on the part of the magistrate was soon rectified by the Punjab Government who hastened to send a telegram ordering the release of the offender against the Act. (This case has been taken from Miss E.F. Rathbone's interesting little book, *Child Marriage*.)

In Iqbal's Company for Thirty Years

by: K.A Waheed

In the year 1934, the Anjuman Khuddam-ud-Din of Lahore launched an English fortnightly journal, 'Islam', the editorial work of which was entrusted to me. The declared editor of 'Islam' was Khwaja Muhammad Rashid Wyne, a scion of the well-known Australia family of Lahore. Being a Government servant, I could not apply for the declaration of a paper. For publication in 'Islam' I used to obtain Sir Mohammad Iqbal's statements on the burning topics of the day. I also used to seek his advice very frequently on problems which I wanted to discuss in the editorial columns of this journal. Sometimes he wanted me to take down dictation from him on an important political matter then engaging the public mind. In the 1930's the Qadiani movement was agitating the mind of Muslim India, and Sir Mohammad Iqbal was in the thick of this controversy. Statements and letters were appearing from his pen in the leading English dailies like the 'Statesman'. He now began to write an exhaustive essay on this problem and suggested that I should publish it in 'Islam' in a single instalment. He gave his manuscript to

In the early 1950's I was publishing another English fortnightly, 'Al-Islam', at Karachi. At that time the Qadiani daily 'Al-Fazl' of Rawalpindi published a series of editorials claiming that the article 'Islam and Ahmadism' was not written by Sir Mohammad Iqbal, and on the basis of internal evidence claimed that it could not have been written by him.

I published a front-page article in 'Al-Islam' saying that the original typescript of the article in question was still in my possession, and I published a photograph of the last page of the script at the end of which the following words appeared:

"I authorise the Anjuman Khuddam-ud-Din, Lahore to publish the above in the form of a pamphlet for free circulation."

Mohammad Iqbal
7-1-1936

This again caused a great stir and some public organisations wanted to have it in their safe custody. I gave it to the Iqbal Academy and it is ever since in safe custody with the National Museum at Karachi, where all the valuable documents of the Academy are kept.

me and wanted me to typewrite it myself. I did so. The article covered some twenty-five foolscap pages. When I took this typescript to him he corrected it using my pen for the purpose. Every page was full of corrections made by him. In some cases he had scored out a whole page and written it afresh either in the margin or on the reverse of the sheet. I made out a fresh copy of the long, corrected article which was published in a single special issue of 'Islam' dated Jan. 22, 1936. It caused a lot of stir in the country. The original typescript, which had been corrected and signed by the author, remained in my possession for almost twenty years.

Last days of the sage

by: Mian Mohammad Shafi

His crowning act of glory, of course, was his brilliant statement on an issue which for over 50 years had caused an unending acrimonious debate between orthodox Muslims, on the one hand, and the Ahmadiyya community, on the other, about the real significance of the fundamental doctrine of the Finality of Prophethood as enshrined in the person of the last of the Prophets of Allah. The occasion was provided by an article by Pandit Nehru in the 'Modern Review' in which he dubbed opposition to Ahmadiyyat as a manifestation of narrow Muslim communalism. This article by a well-known Indian leader synchronised with a bitter controversy between the leaders of the Majlis-i-Ahrar and the missionaries of the Ahmadias. The whole atmosphere in the country was reeking with uneasiness. Allama Iqbal for the first time, without using a single offensive phrase and unworthy impression, in simple but forceful language, explained, at length the cultural, spiritual and political implications of the advent of a prophet after Mohammad (peace be on him) in a country like India where people were held under bondage by a foreign rule. What the Ahrars and other orthodox Muslim theologians could not achieve during their life-long crusade was accomplished by Iqbal in one lucid statement. I must say that I have not so far seen a single statement from any quarter which satisfactorily answers the relevant questions, raised by Allama Iqbal about why anyone need claim to be a prophet receiving revelation from God after Mohammad (peace be on him) whose revelations from Allah are enshrined in the Holy Quran which is the guidance for mankind for all times to come.

اسلام و اہل حق سے نفرت اور دنیا و مافیہ کی اصل

ایمان و کفر کے محرم اقبال کا نظریہ قابل عمل ہے

مکتبہ امیر لال خیر و کی دیکھتے ہیں

[illegible][illegible]

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو
 ۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی
 ۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی
 ۴۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی
 ۵۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی
 ۶۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی
 ۷۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی
 ۸۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی
 ۹۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی
 ۱۰۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

وہ ہے۔ جہاں تک کہ آپس کے قریبی
 قریبیوں اور
 قریبیوں کے "دوست" ہیں۔

[illegible][illegible]

۱۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔
 ۲۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔
 ۳۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔
 ۴۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔
 ۵۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔
 ۶۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔
 ۷۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔
 ۸۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔
 ۹۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔
 ۱۰۔ اہل حق کے لئے جو کچھ ہے اسے اہل باطل کے لئے بھی ہے۔

کے لئے درود و دعا کی ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی
 سے زیادہ جامع اور نوازش ہے۔ اس کی
 جو چیز ہے۔ اس کی یہ خاصیت ہے کہ تو اس
 کے متعلق جو کوئی اور معلومات ادا کیے
 ہوتے ہیں ان میں سے ایک ہے۔ اس کی یہ
 خاصیت ہے کہ تو اس کی یہ خاصیت ہے کہ تو اس
 کی یہ خاصیت ہے کہ تو اس کی یہ خاصیت ہے کہ تو اس

میرزا محمد علی خان، وزیر دارالخلافہ، نے
 ۱۸۵۷ء میں، میرزا محمد علی خان، وزیر دارالخلافہ، نے
 ۱۸۵۷ء میں، میرزا محمد علی خان، وزیر دارالخلافہ، نے

[illegible]

داد عطیت آنی به سزا کفر و کفر کفر
که عفت ندی سزا کفر و کفر کفر
شهر ناک و ناک زشت ناک و ناک

دانی دیکھ کر اس سے اوقات نہایت نکالی
ہے اس لئے اس کے لئے کہ تھیں اور اس
کو ہے۔ کہ وہ تھیں اور اس کے لئے
ہیں کہ تھیں اور اس کے لئے
خلاف ہے۔ کہ وہ تھیں اور اس کے لئے
تھیں اور اس کے لئے کہ وہ تھیں اور اس کے لئے

سب گشت آنرا در دستان کاروان
 بیاورم پس که در پیکر کس
 نخواهد ماند که این می گشت
 قافله در خدمت پادشاه گشت
 عادت انظار می نمود به
 در آن پیکر دستار پیکر

وَأَمَّا الْفِرْعَوْنُ فَقَدْ كَذَّبَ بِآيَاتِنَا فَذُرْنَاهُ لِيُعَذِّبَهُ اللَّهُ وَيَسْخَرَنَّ لَهُ أَهْلُ الْمَدَائِنِ
مَتَّعْنَاهُ ثَلَاثِينَ نَفْسًا يُجَارِيهِ سَيُّدُهُ فَزَكَّاهُ مَا يَزِيدُهُ إِلَّا جَهَنَّمَ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ يُنْفَكُ عَنْهُ فَأُولَئِكَ ذُو النُّصْرَةِ الَّذِينَ فِي الْأَرْضِ

سے ہے کیا مرزا کا یہ کہ اس کے خلاف
 مسلمانوں نے اس کا قاتل بنایا ہے اور
 یہ کہ ایک ایسا شخص ملے گا
 جس کے اخلاق کو مرزا نے
 سب سے زیادہ کی نفی ہے اس سے
 مختلف ہے کیونکہ اس میں
 خون اور اس کا سبب ایک

۱۰۰ سال است که اینده اندیشه است
 از آن که شکل گرفته است از آن
 که هستی را به یکدیگر می بیند
 از آن که هستی را به یکدیگر می بیند
 از آن که هستی را به یکدیگر می بیند
 از آن که هستی را به یکدیگر می بیند

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

حوالے و حواشی

- (1) اس تنقیدی مضمون کا خلاصہ ملک صلاح الدین احمد نے اصحاب احمد جلد یا زود ہم، قادیان، دسمبر 1962ء ص 283-286 پر دیا ہے۔
- (2) ماڈرن ریویو پبلکلتہ خط مرقومہ 20 اگست 1935ء مطبوعہ نومبر 1935ء ص 504-505
- (3) Peers انگلستان کے طبقہ امراء کے رکن
- (4) خط کا خلاصہ اور ترجمہ مصنف نے کیا ہے اصل انگریزی خط کتاب میں درج ہے۔
- (5) خط کا خلاصہ اور ترجمہ مصنف نے کیا ہے۔ اصل انگریزی متن کتاب میں درج ہے۔
- (6) سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، ص: 457-459
- (7) بشیر احمد ڈار، اقبال اور احمدیت، ص: 69
- (8) تلخیص و ترجمہ از مصنف
- (9) بشیر احمد ڈار، حوالہ سابق، ص: 73
- (10) ایضاً، ص: 115 ابواللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ملفوظات اقبال ص: 193
- (11) The Pakistan Times, 9 November, 1977
- (12) ملک محمد جعفر خان، احمدیہ تحریک سندھ سا گرا کا دی، لاہور، جنوری 1958ء، ص: 12-14
- (13) ایضاً، ص: 27
- (14) ایضاً، ص: 39
- (15) ذکر اقبال، ص: 211
- (16) راقم نے اپنی یادداشت اور بعض منتشر نوٹس کی مدد سے یہ تحریر اپنے الفاظ میں مرتب کی ہے۔
- (17) Mian Muhammad Shafi, The Last Days of the Sage, The Pakistan Times, 9 Nov, 1977
- (18) نوائے وقت لاہور، 21 اگست 1987ء
- (19) مولوی محمد علی کی توجہ جب ان کی مرزا صاحب کے زمانے کی تحریرات کی طرف مبذول کرائی گئی جس میں انہوں نے مرزا غلام احمد کو ہندوستان کا مقدس نبی وغیرہ کہا تھا تو انہوں نے جواب دیا ”اگر آپ احمدیہ

جماعت لاہور کے متعلق کوئی فتویٰ دینا چاہتے ہیں تو جماعت کے مطبوعہ عقائد آپ کے سامنے ہیں۔ تیس سال قبل کی میری ذاتی تحریرات سے انکا کوئی تعلق نہیں۔ ان عقائد پر جو فتویٰ دینا چاہیں دیں۔ اگر ذاتی طور پر مجھ پر فتویٰ کا سوال ہے تو ایسا کفر کا فتویٰ، جس کو تیس سال قبل کی تحریروں سے سہارا دینے کی ضرورت ہو، شاید ہی مفید ثابت ہو۔“ اخبار پیغام صلح۔ 3 فروری 1936ء۔

مولوی محمد علی کے جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر الیاس برنی لکھتے ہیں ”گویا کنایہ مولوی محمد علی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ تیس سال قبل خود مرزا غلام احمد قادیانی کی حیات اور صحبت میں ان کے جو عقائد تھے اور جن کو وہ شائع بھی کرتے تھے تکفیر کا موجب ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس دوران میں ان کے عقائد بالکل بدل گئے“ قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ ص: 59

مولوی محمد علی نے بعد میں ایک دور قہ میری تحریر میں لفظ نبی کا استعمال بھی شائع کیا اور اپنے سابقہ موقف کی وضاحت کی۔

(20) محمد حنیف شاہد، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، لاہور 1976ء ص 134

(21) آئینہ صدق و صفا، سوانح ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، تالیف۔ مرزا مسعود بیگ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

1964ء ص 90

(22) الفضل، قادیان، 29 فروری 1936ء

(23) الفضل، قادیان، 9 جون 1935ء

(24) علامہ اقبال مرحوم اور بانی سلسلہ احمدیہ، ڈاکٹر اللہ بخش، احمدیہ انجمن لاہور ص 9

(25) الفضل، قادیان، 25 مارچ 1935ء

علامہ اقبال کے آخری دو سال

کشمیر کمیٹی کی صدارت کے زمانے 1931-1932ء کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کے دوسرے خلیفہ مرزا محمود احمد علی سیاست میں آچکے تھے یوں تو وہ اس سے پہلے ہی سیاست میں دلچسپی لے رہے تھے لیکن ایک نیم سیاسی تنظیم آل انڈیا نیشنل لیگ کے قیام کے بعد انہوں نے سیاست میں مکمل حصہ لینا شروع کر دیا۔

نیشنل لیگ کا قیام

25 جنوری 1935ء کو مرزا محمود احمد نے اپنی سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل لیگ قائم کر دی۔ اسے ایک محدود سیاسی پلیٹ فارم کہا گیا جو سالہا سال تک جماعت کی اہم قومی اور سیاسی ضروریات پوری کرتا رہا اس کا مرکزی دفتر لاہور میں تھا۔ اس کے پہلے صدر شیخ بشیر احمد ایڈوکیٹ تھے جو تقسیم کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج بنے اور جنہوں نے 1947ء میں باونڈری کمیشن کے سامنے قادیانیوں کا الگ محضر نامہ پیش کیا۔ نیشنل لیگ کی ایک نیم فوجی تنظیم احمدیہ کورز تھی۔ جماعت احمدیہ کے وہ افراد جن پر قانونی لحاظ سے کوئی رکاوٹ نہ تھی انہیں ہدایت کی گئی کہ ان جماعتوں میں شامل ہو جائیں۔ (1) پنڈت جواہر لال نہرو کے قادیانی بڑے مداح تھے کیونکہ انہوں نے علامہ اقبال کے مضامین کا رد لکھا تھا۔ 29 مئی 1936ء کو وہ لاہور تشریف لائے تو نیشنل لیگ کے قادیانی رضا کاروں نے ان کا شاندار استقبال کیا صدر نیشنل لیگ نے ان کے گلے میں ہار ڈالا۔ جواہر لال زندہ باد فخر قوم فخر وطن زندہ باد اور خوش آمدید کے نعرے لگائے۔ (2) لاہور جماعت کے اخبار پیغام صلح نے لکھا کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ خلیفہ قادیان کانگریس کے اشد ترین مخالف تھے۔ کانگریس کے مقابلے میں انہوں نے حکومت کی بھرپور امداد کی اور کار خاص کی خدمات انجام دیں آج وہ کانگریس کے انتہا پسند اور اشتراکی خیالات رکھنے والے صدر کے استقبال میں حصہ لے رہے ہیں۔ قادیانیوں نے تبلیغ کے

بجائے سیاست میں بھونڈے طریقے سے حصہ لینا شروع کر دیا ہے (3) مرزا محمود احمد جلسہ سالانہ (1935) کے خطبے میں کانگریس سے تعاون اور مستقبل میں اس میں شمولیت کا اعلان کرنے والے تھے لیکن بعض انگریز ہمدردوں اور سر ظفر اللہ نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کریں کسی اور وقت یہ اعلان کریں۔ پنڈت نہرو کے استقبال کے بعد قادیانیوں نے کانگریس میں شمولیت کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ قادیانیوں کا کانگریس سے تعاون خود کانگریس کے لئے ”مسرت آمیز حیرانی کا باعث تھا۔“ (4) کہ وہ جماعت جو ہمیشہ آزادی کی تحریکوں کے خلاف صف آراء رہی کیسے ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔ نیشنل لیگ کے پنڈت نہرو کا استقبال کرنے کے سلسلے میں مرزا محمود احمد سے کئی سوالات پوچھے گئے۔ ان کا جواب تھا چونکہ پنڈت جی نے ڈاکٹر اقبال کے ان مضامین کا رد لکھا جو انہوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دئے جانے کے لئے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراضات اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور ان کے گزشتہ رویے کے خلاف ہے“ (5) اس لئے یہ شاندار استقبال کیا گیا۔

پنجاب مسلم لیگ کے خلاف قادیانی پروپیگنڈا

10 اپریل 1936ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے ایکٹ آف 1935ء کے تحت ہونے والے انتخابات کے لئے مرکزی اور صوبائی بورڈ قائم کرنے کا اعلان کیا۔ 19 اپریل کو سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو شروع کی۔ قادیانی اس پارٹی کے حامی تھے اور اس کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ (6) سر فضل حسین کی تحریک پر پارٹی کے لئے 50 ہزار روپے چندہ جمع ہوا جس میں 3 ہزار روپے سر ظفر اللہ نے دیے۔

29 اپریل 1936ء کو پنجاب مسلم لیگ صوبائی بورڈ کی تشکیل کے لئے محمد علی جناح لاہور تشریف لائے لیکن سر فضل حسین نے زور دار الفاظ میں ان کو متنبہ کیا کہ بمبے کا وکیل پنجاب کی سیاست میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ جناح صاحب نے ان سے ملاقات کی لیکن انہوں نے مسلم لیگ بورڈ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ ملک برکت علی کی کوششوں سے جناح صاحب علامہ

اقبال سے ملے اور انہوں نے پنجاب پارلیمنٹری بورڈ کا صدر بننا منظور کر لیا۔ اس بورڈ میں مجلس احرار اور مولانا ظفر علی خان کی اتحاد ملت پارٹی نے بھی شمولیت پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

قادیانیوں نے سرفضل حسین کے ایماء پر مسلم لیگ بورڈ اور جناح صاحب کے خلاف پروپیگنڈا مہم کا آغاز کر دیا۔ مرزا محمود نے ایک ہندو سیکولر اور قوم پرست انگریزی اخبار پیپل لاہور کے 50 ہزار روپے کے حصص خرید رکھے تھے۔ اس کا مینیجنگ ایڈیٹر لالہ فیروز چند تھا اور ڈاکٹر گوپی چند بھارگواس کا ایڈیٹر تھا۔ اخبار مسلم لیگ بورڈ اور جناح صاحب کے خلاف شذرات اور ادارے شائع کرتا تھا۔ قادیانی اخبارات و رسائل خصوصاً الفضل قادیان اس زہریلے مواد کو نقل کر کے مسلم لیگ اور محمد علی جناح کے خلاف پروپیگنڈا کرتے تھے۔

مجلس احرار نے جب بورڈ میں شمولیت پر رضامندی ظاہر کی تو قادیانیوں نے مسلم لیگ کو متنبہ کیا کہ احرار کے ساتھ کوئی اشتراک عمل نہ کیا جائے (7) احرار یونی نٹ پارٹی اور سرفضل حسین کے پہلے ہی سے مخالف تھے وہ شہید گنج کے مسئلہ پر اپنی سیاسی ساکھ کھو چکے تھے قادیانیوں نے احرار کو بدنام کرنے کے لئے پورے ہندوستان میں ان کے خلاف مہم چلائی۔ اخبار الفضل نے جناح صاحب کو خبردار کیا کہ وہ احرار سے کوئی سمجھوتہ نہ کریں ان سے کسی قسم کا اشتراک پنجاب مسلم لیگ کے رہے سبھ وقار کو خاک میں ملا دے گا۔ اخبار نے جناح صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا کہ کاش وہ پنجاب کی مقامی سیاست میں مداخلت کرنے سے پرہیز کرتے تاکہ پراگندہ مسلمانوں کا شیرازہ اور زیادہ بکھرنے نہ پاتا (8) ”الفضل“ نے جناح صاحب سے پرزور انداز میں کہا کہ وہ پنجاب میں علیحدہ مسلم لیگ پارٹی نہ بنائیں بلکہ یونی نٹ پارٹی سے تعاون کریں۔ (9) اخبار نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ احرار۔ لیگ اشتراک کو ناکام بنائیں کیونکہ یہ ان کے لئے ہرگز مفید ثابت نہ ہوگا اس لئے وہ اس کے خلاف آواز اٹھائیں اور اپنی بیزاری کا اعلان کریں۔ (10) مولانا ظفر علی خان کی اتحاد ملت پارٹی جو انہوں نے مسجد شہید گنج کی تحریک (1935ء کے زمانے میں بنائی تھی در پردہ یونینسٹوں کی حلیف تھی اور احرار کی مخالف تھی۔ اس لئے الفضل نے ان کو براہ راست تنقید کا نشانہ نہ بنایا اور اپنی پوری پروپیگنڈا مہم جناح صاحب اور مسلم لیگ پر مرکوز کر دی۔ وہ علامہ اقبال کی ان

سیاسی مساعی کو جو وہ مسلم لیگ کی تنظیم اور اس کو موثر جماعت بنانے کے لئے کر رہے تھے کے سخت خلاف تھے۔

اخبار پمپل لاہور کے حوالے سے افضل مسٹر جناح کا عجیب و غریب گروہ کے عنوان سے لکھتا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ سر فضل حسین کی پارٹی (یونی نسٹ) غیر فرقہ وارانہ ہے اور وہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں کو ان کی پارٹی میں شامل ہو کر اس پر اثر ڈالنے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی اس کے برعکس مسٹر جناح کی پارٹی خالصتاً فرقہ وارانہ پارٹی ہوگی اس میں اگر کوئی خوبی بھی جاسکتی ہے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسٹر جناح اس پارٹی میں موجود ہوں گے۔

آگے چل کر اخبار لکھتا ہے:

مسٹر جناح کی خالص اسلامی پارٹی انتخابات میں کس طرح کام کرے گی اگر مسٹر جناح نے اپنی اعلیٰ شخصیت کو خاص غرض کے لئے استعمال کرنا چاہا ہے تو وہ یہی ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے لئے ہر قسم کی تائید کا بندوبست کیا جائے اقوام کے درمیان توازن رکھنے کے متعلق وائسرائے کے اعلان سے اختلاف میں مسٹر جناح نے سر فضل حسین کے مقابلے میں بھی زیادہ تیزی اور شدت سے کام کئے ہیں اس بناء پر مسٹر جناح اور ان کے ساتھی توقع رکھتے ہیں کہ مسلم ووٹر سمجھیں گے کہ مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے بہتر ضامن مسٹر جناح ہی ہو سکتے ہیں یا ان کا پارلیمنٹری بورڈ۔ مسٹر جناح اپنے حق میں مسلم ووٹروں کے سامنے اس کے سوا کچھ پیش نہیں کر سکتے۔ ہم مسٹر جناح کی مساعی کے متعلق کوئی کلمہ خیر کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور ہمیں قطعاً شبہ نہیں کہ ان کی پارٹی خود اپنی لغویت کے بوجھ کی وجہ سے ٹوٹ جائے گی اگر پارٹی اپنے بانی کے تصور کے مطابق متحدہ حیثیت میں کام نہ کرے تو اس پر ہم سے بڑھ کر کوئی خوش نہ ہوگا۔ (11)

محمد علی جناح صاحب 29 اپریل کو لاہور تشریف لائے یہاں چند روز ٹھہرے اور علامہ اقبال کو مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل کا کام سونپ کر راولپنڈی چلے گئے جہاں کچھ روز قیام کے بعد کشمیر روانہ ہو گئے۔ اخبار افضل جناح صاحب کے دورے کو ناکام بتاتا ہے اور لکھتا ہے۔

”مسٹر جناح لاہور سے کامیاب گئے یا ناکام ان کا دورہ ناکام ہوا ہے کوئی قابل ذکر لیڈران

کونٹیشن پر الوداع کہنے نہ آیا“ (12) ایک اور ادارے میں اخبار پنجاب میں مسٹر جناح کی ناکامی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ دورہ ہر طرح سے ناکام تھا صرف اقبال نے جناح کی حمایت کا اعلان کیا ہے اور اس کی سکیم کا خیر مقدم کیا ہے۔ (13)

12 مئی 1936ء کو میاں عبدالعزیز کے مکان بیرون کی دروازہ لاہور میں پنجاب مسلم لیگ کی تنظیم نوکے لئے ایک اجلاس بلایا گیا جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی اس میں علامہ اقبال کو صدر اور ملک برکت علی کو سکریٹری چنا گیا۔

21 مئی کو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کا اعلان کر دیا گیا اس میں احرار کے چار اور اتحاد ملت کے تین افراد شامل تھے۔ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے قیام کے اعلان پر افضل نے اپنے تبصرے میں کہا ”احرار سر فضل حسین کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ دیانندار کارکن ہیں اور ان کے ہاتھوں کٹہ پتلی نہیں بنے اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں سر ظفر اللہ خان کے تقرر کی مخالفت نہیں کی۔ احرار اتحاد پارٹی میں اس لئے شامل نہیں ہوئے کہ احمدی جنہوں نے پنجاب کونسل میں بھی یونینسٹ پارٹی کی نہایت اعلیٰ خدمات دیکھی ہیں اس کے رکن ہیں اور وہ لیگ میں بھی اس وقت تک شامل نہیں ہوں گے جب تک احمدی اس کے ممبر ہیں لیکن سر فضل حسین بخوبی جانتے ہیں کہ ایک قادیانی احرار کے سارے کے سارے گروہ سے بہتر ہے۔ مسٹر جناح کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ سابقہ واقعات سے سبق حاصل کرتے ہوئے احرار کو اپنے سیاسی دائرہ سے دور رکھیں ورنہ انہیں بھی امن میں رہنا نصیب نہ ہوگا۔“ (14)

مرزا محمود احمد کی سودے بازی

مرزا محمود احمد نے مسٹر محمد علی جناح کو ایک خط لکھا کہ اگر احمدیوں کو مسلم لیگ میں شامل نہ کیا گیا تو وہ کانگریس کے ساتھ مل جائیں گے۔

محمد علی جناح نے یہ خط علامہ اقبال کو بھیجوا دیا۔ نذیر نیازی اس خط پر علامہ اقبال کی مندرجہ ذیل رائے کا ذکر کرتے ہیں۔

ارشاد ہوا: جناح نے مرزا محمود احمد (مرزا بشیر الدین محمود، خلیفہ قادیان) کا خط مجھے بھیج دیا ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں: ہماری جماعت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر آپ نے ہمیں لیگ میں شامل نہ کیا تو مجبوراً کانگریس میں شمولیت کرنا پڑے گی۔

میں نے عرض کیا: آپ کی کیا رائے ہے؟

فرمایا رائے کا کیا سوال ہے، لیگ میں شامل ہوں یا کانگریس میں، ہم ان کی شمولیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جو جی چاہے کریں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ مرزا صاحب کے نزدیک ہم مسلمان، مسلمان ہیں یا نہیں اور انہیں بھی اسلام کا دعویٰ ہے تو پھر لیگ یا کانگریس میں شرکت اور عدم شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں بہر حال لیگ میں شامل ہونا چاہئے۔ لیکن مرزا صاحب تو لیگ اور کانگریس سے سزا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یا تو بہ حیثیت ایک جماعت وہ مسلمانوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں یا ہمیں مسلمان ہی نہیں سمجھتے.....

میں نے کہا لاہوری جماعت کے بارے میں کیا رائے ہے؟ یہ جماعت تو ہماری تکفیر نہیں کرتی۔

فرمایا: یہ ٹھیک ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک اس کا جرم یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو مسلمان بلکہ بہتر مسلمان سمجھتی ہے جو مسلمانوں کی تکفیر کر رہے ہیں۔ (15)

محمد علی جناح نے جو اس وقت کشمیر میں تھے 8 جون 1936ء کو مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا لاہور میں اجلاس طلب کیا۔ قادیانی اور یونی نسٹ پارٹی کے اراکین اس اجلاس کو ناکام بنانے کی سر توڑ کوشش کرنے لگے۔ یونی نسٹ عناصر اور ان کے حامی اخبارات نے ان کے خلاف ناشائستہ الفاظ استعمال کئے اور اجلاس سے پہلے ان کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کرنے کا پروگرام بنایا۔ مرزا محمود اپنی نیم فوجی تنظیم نیشنل کور کے ممبروں کو اس استقبال میں شامل کرنے پر تیار تھے تاکہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو اور مظاہرہ زور دار ہو لیکن علامہ اقبال کی ذات والا صفات اور ان کے نیاز مندوں کی اخلاقی قوت سے مرعوب ہو کر یونی نسٹ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ مرکزی بورڈ کا جب اجلاس جاری تھا تو یونی نسٹ پارٹی کی ہدایت کے مطابق مولانا ظفر علی خان نے اپنے دوستوں کے ساتھ بورڈ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ احرار کے چار نمائندے اجلاس میں موجود رہے لیکن

بعد میں وہ بھی بورڈ کو چھوڑ گئے۔ (16)

احرار کے اصرار پر پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے حلف نامے میں یہ شق شامل کی گئی 'میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر قادیانیوں کو دیگر مسلمانوں سے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کے لئے انتہائی کوشش کروں گا۔' (17)

اقبال اور مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں یونی نٹ پارٹی کے اشارے پر بورڈ سے علیحدہ ہوئے حالانکہ علامہ اقبال کو یقین تھا کہ احرار اور اتحاد ملت دوبارہ مسلم لیگ سے مل جائیں گی۔ انہوں نے اس سلسلے میں قائد اعظم کو 23 مئی 1936ء کو ایک خط بھی لکھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ ظفر علی خاں کے رویے سے مطمئن نہیں تھے۔

علامہ اقبال نے مولانا ظفر علی خاں اور ان کی اتحاد ملت پارٹی کے سر فضل حسین کی یونی نٹ پارٹی اور قادیانیوں سے اشتراک پر ایکس شاعر کے قلمی نام سے چند نظمیں کم ٹومی اور لا الہ اللہ فرنگی وغیرہ لکھیں جو مسلم لیگی اخبار احسان میں شائع ہوئیں۔ (18) ان کا انداز ویسا ہی ہے جیسا مولانا ظفر علی خاں کی ایک زمانے میں قادیان کے خلاف نظموں کا ہوتا تھا، وہی تکیے محاورات، طنزیہ اشارے اور گھٹتہ تراکیب استعمال کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں قادیان کے سیاسی کردار کو بڑی عمدگی سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

9 جولائی 1936ء کو سر فضل حسین وفات پا گئے۔ وہ قادیانیوں کے حسن اعظم تھے جن کی سرپرستی میں ظفر اللہ نے سیاست میں مقام پیدا کیا اور وائسرائے کی کونسل کے ممبر بنے لیکن ان کی محسن کشی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے ان کی نماز نہ پڑھی جیسا کہ ظفر اللہ نے قائد اعظم کی نماز جنازہ نہ پڑھ کر محسن کشی اور احسان فراونی کا ارتکاب کیا تھا۔ ان کے جنازے کے ساتھ جو غیر مسلم ہندو اور سکھ گئے تھے قائد ابی ان کے ساتھ علیحدہ کھڑے رہے۔ دراصل یہی ان کا مقام تھا اور ہے۔

انتخابات میں مسلم لیگ دودھ نہیں بیٹھیں راجہ علفنر علی کامیاب ہو کر یونینسٹوں کے ساتھ مل گئے اور ملک برکت علی باقی رہ گئے۔

صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست پر مرزا محمود نے یہ تبصرہ کیا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری مخالفت بہت عام ہو گئی تھی حتیٰ کہ مسلم لیگ جس کے اجلاس بعض دفعہ نہ ہو سکتے تھے اور وہ مجھ سے روپیہ لے کر اجلاس کرتی تھی اسے بھی زکام ہوا۔ اور اس کی پنجاب شاخ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ احمدی اس کے ممبر نہیں ہو سکتے۔ یہ کفرانِ نعمت کی انتہا تھی لیکن اس کی وجہ یہی تھی کہ اس وقت ہمارے خلاف لوگوں میں اتنا جوش تھا کہ انہوں نے خیال کیا کہ اگر ہم نے احمدیوں کو شامل رکھا تو لوگ ہمیں ووٹ نہیں دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی اور پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کی ایک ہی نشست ہے گویا وہ بھی ہمارے برابر ہیں جو یقیناً ہماری فتح ہے۔ ہماری جماعت تو مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگر ایک ہی ضلع میں ہوں تو ہم دو ممبریاں بھی لے سکتے ہیں مگر ہم پھیلے ہوئے ہیں اس لئے ایک ممبری کا حصول بھی ہمارے لئے ناممکن ہے پس ایک نشست کا حاصل کر لینا بھی ہماری بڑی فتح ہے لیکن ان (مسلم لیگ) کا صرف ایک نشست حاصل کر لینا ان کی سخت شکست ہے۔ بہر حال اس وقت تک ہم مسلمانوں کا ایک حصہ سمجھے جاتے تھے مگر مسلمانوں نے گذشتہ قتنہ سے مرعوب ہو کر ہمیں اس طرح الگ کرنے کی کوشش کی جس طرح دودھ سے مکھی نکال دی جاتی ہے۔“ (19)

کانگریس میں شمولیت کے لئے قادیانیوں کی تنگ و دو

1937ء کے انتخابات میں کانگریس کو کامیابی حاصل ہوئی اور یوپی، مدراس، بمبئی وغیرہ میں کانگریسی وزارتیں بن گئیں مرزا محمود نے اپنے خطبوں میں کانگریسی لیڈروں سے روابط بڑھانے اور کانگریس میں باقاعدہ شمولیت کے کئی اشارے دیئے۔ الفضل نے کانگریسی وزارتوں کے قیام پر اظہارِ مسرت کیا اور مسلم لیگ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ (20) مرزا محمود نے قادیانی تنظیم نیشنل لیگ کے اجلاس میں کانگریس کی قومی خدمات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے عمل

اور رواداری سے مسلمانوں سے خیر خواہی ثابت کر کے انہیں مطمئن کرے۔ (21)

نیشنل لیگ کے ایک اجلاس میں نیشنل کورز کے رضا کاروں کے سپاس نامے کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ پہلے سے سیاست میں حصہ لے رہے ہیں۔ پیغام صلح نے کہا کہ یہ درست ہے لیکن اپنی جماعت کے سیاسی کارناموں کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے ان خفیہ سرگرمیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے جو قادیانی جماعت (کانگریس کے) سول نافرمانی 1930ء کے ایام میں حکومت کی امداد میں ان کے خلاف انجام دیتی رہی۔ (22) اخبار نے بار بار قادیان جماعت کی سیاسی روش اور کانگریس کی حمایت کی پالیسی پر تنقید کی اور کہا جماعت قادیان سیاسی مشاغل میں منہمک ہے۔ قادیان میں کوریں اور فوجیں تیار ہو رہی ہیں، ظاہر اور پوشیدہ سیاسی کاروائیاں جاری ہیں، قادیانی نیشنل لیگ کے جلسے منعقد ہو رہے ہیں۔ خلیفہ کے پراسرار سفر جاری ہیں۔ (23)

اخبار نے 13 اکتوبر 1937ء کو قادیانی نیشنل لیگ کے ایک اجلاس کی کاروائی کی روداد شائع کی جس میں مرزا محمود نے ایک سیاسی تقریر کی تھی۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ مرزا محمود اپنے قادیانی پیروکاروں کی اندھی عقیدت کا خراج وصول کر رہا ہے۔ وہ تبلیغ کے نام پر روپیہ اکٹھا کر کے اسے بے دریغ ضائع کر رہا ہے۔ اس کی تقریر مایوس کن اور اس کی معلومات سطحی اور محدود اور خیالات مضحکہ خیز ہیں جلسے کے اختتام پر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کو بار بار یہ شعر پڑھتے سنا۔

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے

کردار بے سوز گفتار وای (24)

پیغام صلح 'قادیان کے سیاسی مناظر' کے عنوان سے اپنے ادارے میں لکھتا ہے کہ 3 نومبر 1937ء کو قادیان میں میراٹھ (مرزا محمود کے ماموں۔ مصنف) کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں دو پارٹیوں میں کانگریس میں شمولیت پر مباحثہ ہوا۔ حق میں تین میں سے دو جھوٹے فیصلہ دیا پیغام صلح نے اس جلسہ پر اپنے تبصرے میں کہا "سیاسی سودوں کے دوران جماعت احمدیہ کے طلبہ اور نوجوانوں کے اس قسم کے سیاسی مناظرے قیمت بڑھانے کا موجب ہو سکتے

ہیں۔“ (25)

پیغام صلح نے ایک اور ادارے ’قادیانی اور کانگریس‘ میں لکھا کہ مرزا محمود احمد خلیفہ قادیان آج تک اپنے خطبوں میں برطانوی حکومت کی عملی حمایت اور کانگریس کی تمام تحریکوں کو ناکام کرنے کا ذکر کرتے رہے اس کے لئے انہوں نے کار خاص کے علاوہ لاکھوں روپے خرچ کئے ان کا کہنا تھا کہ حکومت مخالف تحریکوں میں ان کے لیکچرار جاتے۔ ان کے تین ہزار والیٹر یہ کام کرتے رہے انہوں نے حکومت کی اندھی اور غیر مشروط وفاداری اور کانگریس کی مخالفت میں سر توڑ کوشش کی لیکن آج ان کی حمایت کر رہے ہیں۔ ہم (پیغام صلح) اس وقت چوکنے ہو گئے تھے جب قادیانی نیشنل لیگ نے پنڈت نہرو کو لاہور سٹیشن پر سلامی دی۔ شروع اکتوبر 1937ء میں خلیفہ صاحب لاہور آئے، نیشنل لیگ نے ایڈریس پیش کیا جواب میں انہوں نے کانگریس کی تعریف کی۔ بعض ہندو اخباروں نے اس وقت ہی قادیانیوں کی کانگریس میں شمولیت کا اعلان کر دیا تھا۔ (26)

پیغام صلح ایک اور ادارے میں لکھتا ہے:

اگر قادیانی جماعت کانگریس میں شامل ہو گئی تو دلچسپ مناظر دیکھنے میں آئیں گے۔ قصر خلافت پر سہ رنکا کانگریسی جھنڈا لہرائے گا بندے ماترم کا گیت گایا جائے گا قادیانی نیشنل لیگ کی کوریں کانگریسی لیڈروں کی آئے دن سلامی اتارا کریں گی۔ کانگریس کے حکم کی تعمیل میں وہ مارے مارے پھریں گے اس طرح ممکن ہے قیادت و خلافت کے خدائی اجارہ داروں کی رضا کاری کا تماشا بھی دنیا دیکھ لے۔ (27)

26 نومبر 1937ء کو دو کانگریسی لیڈر لاڈورانی زتشی اور گیانی اندر جیت سنگھ قادیان گئے شیخ بشیر احمد صدر نیشنل لیگ کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا۔ (28) جس میں انہوں نے تقریر کی اس کے علاوہ لاڈورانی زتشی کی صدارت میں ایک مباحثہ ہوا جس میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوا کہ قادیانی جماعت کانگریس میں شامل ہو جائے اور یہ موقف قیام پاکستان تک قائم رہا۔ (29) افضل قادیان نے مسلم لیگ پر تنقید جاری رکھی ضمنی انتخابات میں کانگریس کی کامیابی پر اظہار مسرت کیا اور مسلم لیگ کی مذمت کی۔ (30)

18 فروری 1938ء کو اخبار زمیندار لاہور نے اطلاع دی کہ قادیانیوں نے پنجاب مسلم لیگ کے خلاف ایک شکایت بھیجی ہے کہ مرزائی جماعت کو صوبائی لیگ والے کا فر سمجھتے ہیں اور لیگ کا ممبر نہیں بناتے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سر محمد اقبال، صدر صوبائی مسلم لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ چونکہ مرزائی صرف اپنے آپ کو مسلمان اور دوسرے مسلمانوں کو کافر گردانتے ہیں اس لئے انہیں لیگ کا ممبر اس وقت تک بننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی جب تک وہ دوسرے مسلمانوں کو مسلمان نہ مانیں۔

پیغام صلح لاہور نے زمیندار کی اس خبر پر معاصر احسان لاہور کے 19 فروری 1938ء کے تبصرہ کا ذکر کیا جس میں کہا گیا تھا کہ قادیانی ایسا کیوں نہیں کرتے اگر وہ لیگ کا ممبر بننا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد پیغام صلح اپنا نقطہ نظر بیان کرتا ہے۔

”قادیانی حضرات کا یہ فرض ہے کہ پنجاب کی مسلم لیگ اور سر محمد اقبال کے طرز عمل اور روزنامہ احسان کے اعتراض کا کوئی جواب ہے تو پیش کریں۔ بات معقول ہے اگر قادیانی حضرات باقی کلمہ گو مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے تو پھر دوسروں سے اس کی توقع کیوں رکھتے ہیں اور ان کافر مسلمانوں کی انجمنوں اور جماعتوں میں گھسنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔“ (31) واضح رہے کہ مسلم لیگ نے پنجاب پارلیمنٹری بورڈ میں یہ قرارداد منظور کرائی تھی کہ مسلم لیگ کے نمائندے اگر اسمبلی میں کامیاب ہوں گے تو ان کا مقصد مرزائیت کا استیصال ہوگا۔ اس کے بعد پنجاب کی نئی قائم ہونے والی مسلم سنوڈ سنٹس فیڈریشن نے بھی یہ اصول قائم کیا کہ کوئی مرزائی اس کا رکن نہیں ہو سکتا۔ (32) نہایت نامساعد سیاسی حالات اور اپنی علالت کے دوران علامہ اقبال نے مسلم لیگ کی قیادت کا فریضہ انجام دیا انہوں نے مختلف سیاسی مسائل پر محمد علی جناح کو 18 ماہ کے عرصے میں 13 خطوط لکھے۔ محمد شریف طوسی نے ان خطوط کو 1943ء میں شائع کر دیا ان خطوط میں علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت، محمد علی جناح کی قیادت پر اعتماد، لیگ کی تشکیل کے مسائل اور ان کی مساعی جملہ کی جھلک موجود ہے۔ آخر کار 1947ء میں مصور پاکستان کا خواب عظیم قائد کی آنکھ محنت سے شرمندہ تعبیر ہوا۔

- (19) فاروق قادیان جلد 23 نمبر 43 مورخہ 11 نومبر 1938ء
- (20) پیغام صلح لاہور 8 اکتوبر 1937ء
- (21) الفضل قادیان 10 اکتوبر 1937ء
- (22) پیغام صلح لاہور 12 اکتوبر 1937ء
- (23) پیغام صلح لاہور 15 اکتوبر 1937ء
- (24) پیغام صلح لاہور، 13 اکتوبر 1937ء
- (25) پیغام صلح، لاہور، 8 نومبر 1937ء
- (26) پیغام صلح لاہور، 17 نومبر 1937ء
- (27) پیغام صلح لاہور، 12 نومبر 1937ء
- (28) پیغام صلح لاہور، 30 نومبر 1937ء
- (29) غلام بنی مسلم، قیام پاکستان کے لئے انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کی جدوجہد لاہور، ص 18
- (30) پیغام صلح لاہور 17 نومبر 1937ء
- (31) پیغام صلح لاہور 21 فروری 1938ء
- (32) پیغام صلح لاہور 21 اکتوبر 1938ء

سر ظفر اللہ کی آئینی سکیم (1940)

شیخ عبدالماجد نے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے ہر اہم واقعہ کو قادیانیوں کے کھاتے میں ڈالنے اور تاریخی حقائق مسخ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی انہوں نے واضح حقائق کو توڑ مروڑ کر سر ظفر اللہ اور مرزا محمود کو سیاسی معاملات میں کریڈٹ دینے کی کوشش کی ہے اور ان کو عظیم سیاسی مدبر کے طور پر پیش کیا ہے چاہے ان کا عمومی کردار منفی ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل وہ ہندوستان میں آئینی ارتقا کی تاریخ سے ناواقف ہیں انہوں نے ادھر ادھر سے سطریں جوڑ کر عجیب و غریب خیال آفرینیاں کی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے اوائل مارچ 1940ء میں مرتب کی گئی ظفر اللہ کی ایک آئینی تجویز کو قرار داد لاہور بلکہ گزشتہ نصف صدی میں پیش کی جانے والی تمام دستوری سکیموں سے اعلیٰ تر قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں ”سرسید سے لے کر قرار داد لاہور تک دو صد بیانات پر ان (سر ظفر اللہ) کا ڈرافٹ یعنی Separation Scheme فوقیت رکھتا ہے۔ کیا یہ تمام خصوصیات اقبال سمیت دو صد حضرات کے بیانات میں سے کسی کے بیان میں یک جائی طور پر پائی جاتی ہیں، ہرگز نہیں۔“ (1)

وہ مزید لکھتے ہیں۔

”اس مضمون میں جو حضرات قائد اعظم کے معاون تھے ان میں سے بعض کو بجا طور پر تاریخ میں قائد کے ساتھ لائق اکرام مقام دیا گیا ہے مگر جس شخصیت (ظفر اللہ) کا بیان علامہ اقبال سمیت سب بیانات پر ہماری اور فضیلت کا حامل ہے، اسے ہلکی نظر انداز کر دینا تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔“ (2)

سر ظفر اللہ کی سکیم اور ولی خان

ظفر اللہ کی علیحدگی کی سکیم Separation Scheme کا چرچا 1981ء کے آخر میں ہوا جب

بزرگ سیاست دان ولی خان نے ہفت روزہ چٹان لاہور کو دیئے گئے ایک انٹرویو (مطبوعہ 21 دسمبر 1981ء) میں الزام لگایا کہ انگریزوں نے قرارداد لاہور کے لئے اس مذہبی طبقے (قادیانیوں) کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ”جو انگریز ہی کا خود کاشتہ پودا تھا“ اور جو بظاہر مسلم سوسائٹی کا ایک حصہ تھا مگر درپردہ اسلام کی قوت عمل اور مسلمانوں کے ملی اقتدار کا سخت مخالف تھا اسے انگریزوں نے اسی کام کے لئے تیار کیا تھا کہ وہ اسلام کے گھر میں نقب لگا کر مسلمانوں کی اجتماعی رسوائی کا سامان فراہم کرے۔ اس پولیٹیکل تنظیم (جماعت احمدیہ۔ مصنف) کو انگریز کی طرف سے ہر طرح کی اعانت حاصل تھی یہ اس کی پرانی نمک خوار تنظیم تھی اس تنظیم کا لیڈر مسٹر ظفر اللہ خان آگے بڑھا اور اس نے گورنمنٹ برطانیہ کی ذہنی پریشانی دور کر دی۔ اس نے برصغیر کی تقسیم کا ”قابل عمل“ فارمولا تیار کیا اس نے مسودہ وائسرائے لارڈ لٹلتھمو کے سپرد کر دیا۔ وائسرائے نے اس مسودہ پر غور کیا اور اپنی سفارشات کے ہمراہ حکومت برطانیہ کے اسسٹنٹ سکرٹری کو روانہ کر دیا اس مسودے پر ان کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ مسٹر ظفر اللہ نے حکومت برطانیہ سے درخواست کی کہ مسلم لیگ اور اس کے قائدین کو اس بات سے آگاہ نہ کیا جائے کہ اس مسودہ کا خالق وہ ہے کیونکہ وہ ایک ایسے اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے جسے مسلمان پسندیدہ نظروں میں دیکھتے اگر مسلمانوں کو اس کا علم ہو گیا کہ اس فارمولا کا خالق وہ ہے تو اس سے نہ صرف یہ کہ مطلوبہ مقاصد حاصل نہ ہوں گے بلکہ مسلمانوں میں ایسا رد عمل پیدا ہوگا جو اس فرقے کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا جبکہ انگریزوں کو اپنے مقاصد کے علاوہ اس نمک خوار فرقے سے بھی دلچسپی ہے..... راقم (ولی خان) کا خیال ہے کہ مسٹر ظفر اللہ خان نے اپنے طرز عمل سے نہ صرف عام مسلمانوں کو دھوکہ دیا بلکہ قائد اعظم اور ان کی جماعت مسلم لیگ سے بھی غداری کی اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید تاریخ کے فیصلے کچھ اور ہوتے بہر حال لارڈ لٹلتھمو نے اس منصوبہ کی ایک نقل قائد اعظم اور مسٹر حیدری (سراکبر) کو بھیج دی لیکن ان دونوں پر ظاہر نہیں کیا کہ اس منصوبہ کا خالق کون ہے؟ یہ خط 12 مارچ 1940ء کو جاری ہوا اور 23 مارچ 1940ء کو لاہور ریزولیشن پاس ہو گیا۔“ (3)

دلی خان نے اپنی کتاب (4) میں بھی یہی الزام دہرایا ہے کہ انگریز نے ظفر اللہ سے ایک آئینی منصوبہ تیار کرایا اور اسے مسلم لیگ کو بھیج دیا تاکہ اسے 23 مارچ 1940ء کے اجلاس میں قرار داد لاہور کے طور پر منظور کرے۔ ان الزامات کو تحقیق نے تاریخی حقائق کی روشنی میں مسترد کر دیا ہے۔ قرار داد لاہور ایک الگ دستاویز ہے اور ظفر اللہ کی سکیم ایک الگ آئینی فارمولا ہے (5) قرار داد ایک طویل گفت و شنید اور بحث مباحثے کے بعد فروری 1940ء میں تیار ہو چکی تھی۔ ظفر اللہ کا مسودہ مارچ کے دوسرے ہفتے میں وائسرائے لارڈ لٹلتھمو نے محمد علی جناح اور اکبر حیدری کی معلومات کے لئے روانہ کیا۔ قرار داد لاہور کے مرتبین میں سے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے دلی خان کے الزامات کی پر زور تردید کی اور تاریخی حقائق پیش کیے۔ (6) خود ظفر اللہ نے دلی خان کے تمام الزامات کو رد کر دیا ہے اس لئے اس بحث میں ہم نہیں پڑتے۔ ہم ظفر اللہ کی سکیم کا جائزہ لیتے ہیں جس کے بارے میں شیخ عبدالماجد کا خیال ہے کہ وہ مسلمانوں کی ان تمام سکیموں سے برتر ہے جو انہوں نے سرسید سے لے کر 1940ء تک پیش کیں۔

سر ظفر اللہ کی سکیم سے پہلے زیر غور سکیمیں

سر ظفر اللہ نے اپنی علیحدگی کی سکیم جس کی وضاحت آگے کی جائے گی مارچ کے اوائل میں تیار کر کے وائسرائے ہند لارڈ لٹلتھمو کو دے دی۔ وہ اس کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ قرار داد لاہور سے 12 روز پیشتر وائسرائے نے اس کی ایک نقل جناب صاحب کو بھجوائی اور 12 مارچ 1940ء کو سیکریٹری آف سٹیٹ لارڈ زیٹ لینڈ کو 32 صفحات پر مشتمل اس سکیم کی کاپی ایک خط کے ساتھ روانہ کی۔ اس کا نام Separation Scheme تھا۔ ظفر اللہ نے اپنے ایک وضاحتی نوٹ میں اس سکیم کی تفصیل بتائی ہے۔ اس نوٹ سے پہلے پاکستان نامنر میں یہ پوری سکیم شائع ہوئی (7) اور اخبار کے مدیر زیڈ اے سلہری مرحوم نے اس پر ایک عمدہ تبصرہ لکھا۔ (8)

ظفر اللہ کی سکیم ہندوستان کے برطانوی دولت مشترکہ میں رہتے ہوئے ایک ڈومنین (Dominion) کی حیثیت سے اس کو خود مختار درجہ دینے کے بارے میں ان مباحث کا حصہ تھی جو

گزشتہ چوتھائی صدی سے جاری تھیں ان میں خیری برادران کی سکیم (1917)، عبدالقادر بلگرامی کا تقسیم ہند کا فارمولا (1920)، سردار گل محمد خان کی ہندوستان کی تقسیم کا خاکہ (1922)، مولانا محمد علی جوہر کی ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کا منصوبہ (1924)، لاجپت رائے کی تجویز (1924)، سر آغا خان (1928)، علامہ اقبال (1930)، چوہدری رحمت علی (1933)، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (1938)، ڈاکٹر عبداللطیف، میاں کفایت علی پنجابی، علی گڑھ کے پروفیسر سید ظفر الحسن اور ڈاکٹر افضل قادری اور سر سکندر حیات کی آئینی تجاویز اور سکیمیں شامل تھیں۔ ان مباحث کا پس منظر یہ تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو ڈومنین سٹیٹس (سٹے ٹیوٹ آف Statute of West Minister ویسٹ منسٹر ٹائپ) کا درجہ دینے کو تیار تھی جیسا کہ دولت مشترکہ کی دیگر ڈومینین آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ کو حاصل تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا تھا کہ ڈومنین (نیم مختار) ہندوستان میں مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے مقابلے میں کیا تحفظات حاصل ہوں گے اور جب تک یہ تحفظات حاصل نہ ہوں گے مسلم لیگ کسی آئینی سکیم کو تسلیم نہیں کرے گی۔ درج بالا سکیمیں ہندو اکثریت کی طرف سے ممکنہ خطرات کے ازالے کے لئے پیش کی جا رہی تھیں۔ بنیادی طور پر یہ تین قسم کی سکیمیں تھیں:-

- 1 پاکستان سکیم
 - 2 مشرقی و مغربی خطوں میں علیحدہ علیحدہ وفاق کی سکیم
 - 3 ڈومنین ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ خود مختاری پر مبنی سکیم (9)
- ظفر اللہ نے ان میں سے بعض سکیموں کا نام لئے بغیر ایک جائزہ پیش کیا انہوں نے کوئی انوکھی، بے مثل یا فوقیت کی حامل تجویز پیش نہیں کی۔ (10) مسلم لیگ کی آئینی کمیٹی اور فارن کمیٹی ایسی سکیموں پر 1939-40ء میں غور کر چکی تھی اور مسلم زعماء سے طویل سلسلہ مذاکرات کے بعد انہوں نے قرارداد لاہور کا ڈرافٹ تیار کر لیا تھا جو بعض ترامیم کے بعد قرار لاہور کی صورت میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں پیش ہوا۔ یہ ظفر اللہ کی سکیم سے مختلف ہے، لہذا ظفر اللہ کہتے ہیں

کہ ان کی علیحدگی کی سکیم قرار داد لاہور سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ علیحدگی سے مراد ڈومنین کے اندر دو وفاق ہیں جو مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ہوں۔

سر ظفر اللہ کی سکیموں کا خلاصہ

سر ظفر اللہ نے چوہدری رحمت علی کی پاکستان سکیم کو یکسر مسترد کر دیا کیونکہ اس میں آبادی کے انتقال اور تبادلوں کا ذکر تھا اور یہ بات ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے مصیبت اور پریشانی کا باعث بن سکتی تھی اس کے علاوہ ان کے خیال میں یہ مسئلہ کا کوئی آئینی حل نہ تھا۔

ظفر اللہ نے دو قسم کی سکیمیں پیش کیں ایک سکیم کو وہ علیحدگی کی سکیم Separation Scheme کہتے ہیں اور دوسری کو آل انڈیا فیڈریشن کا نام دیتے ہیں۔

علیحدگی کی سکیم

- 1 ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں ایک فیڈریشن بنائی جائے جس میں پنجاب سندھ، سرحد، بلوچستان اور قبائلی علاقہ شامل ہوں۔
- 2 ہندوستان کے شمال مشرقی حصے میں ایک فیڈریشن قائم کی جائے جس میں آسام اور بنگال کے صوبے ہوں۔
- 3 اس وقت موجود صوبائی حدود کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔
- 4 باقی ہندوستان میں ایک یا ایک سے زیادہ فیڈریشن ہوں۔
- 5 ان فیڈریشنوں کو اختیار حاصل ہو کہ وہ کشمیر، ریلوے، ڈاک و تار، نشریات، شہری ہوا بازی سے متعلق معاہدات اور میثاق طے کر سکیں اور ہندوستان کے دفاع کے لئے مشترکہ فوج اور دفاعی نظام قائم کریں۔

- 6 شمال مشرقی اور شمال مغربی فیڈریشنوں اور ہندوستان میں قائم دوسری فیڈریشن یا فیڈریشنوں کا تاج برطانیہ سے براہ راست رابطہ ہو دوسرے لفظوں میں ایک کل ہند مرکز All India

Centre نہ ہو بلکہ برطانیہ کا ان سے براہ راست تعلق قائم رہے۔ اس سکیم سے ان کے خیال میں فرقہ وارانہ کشیدگی کم ہوگی اور درج بالا معاہدات Conventions بہت حد تک ہندوستان کا اتحاد قائم رکھ سکیں گے۔ (11)

سر ظفر اللہ کی سکیم کا قرارداد لاہور سے موازنہ

مسلم لیگ کی 23 مارچ 1940ء کی قرارداد سے ظفر اللہ کی علیحدگی کی سکیم کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا کہ۔

1 ظفر اللہ ایک ایسے کل ہند مرکز All India Centre کا ذکر کر رہے ہیں جو غیر مسلم صوبوں کے وفاق یا وفاقوں سے معاہدات کر سکے اور ہندوستان کے مشترکہ دفاع میں حصہ لے۔ قرارداد لاہور میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

2 ظفر اللہ ہندوستانی فیڈریشنوں کے تاج برطانیہ سے تعلقات کو برقرار رکھتے ہیں جب کہ قرارداد لاہور میں ایسے کسی تعلق کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔

3 مسلم لیگ نے قرارداد لاہور کا مسودہ 4 فروری 1940ء کو تیار کر لیا تھا اور ظفر اللہ کی سکیم ایک ماہ بعد 6 مارچ 1940ء کو مرتب کر کے دائرے کو بھجوائی گئی اور اس نے اس کی ایک کاپی محمد علی جناح اور اکبر حیدری کو دی۔

4 قرارداد لاہور میں کہا گیا ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے متصل اکائیوں کی ایسے خطوں کی صورت میں حد بندی کی جائے کہ جن کی تشکیل ضروری علاقائی رد و بدل کے ساتھ اس طرح ہو کہ مسلم آبادی کے اکثریتی علاقوں میں جیسا کہ ہند کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ہے آزاد ملکیتیں بن جائیں ان مملکتوں میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار اور آزاد ملکیتیں بن جائیں ان وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہبی، ثقافتی معاشی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی حفاظت کے لئے ان کے مشورے سے معین و موثر تحفظات مہیا کئے جائیں۔ ظفر اللہ کی سکیم میں ایسی کوئی بات نہیں اس کے باوجود ظفر اللہ کا یہ کہنا ہے کہ قرارداد

لاہور (پاکستان) ان کی درج بالا علیحدگی کی سکیم سے ملتی جلتی تھی اس کو 9 اپریل 1946ء کے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب ارکان کے اجلاس دہلی میں پاکستان کا نام دیا گیا۔ (12) اگر ایسی ہی مماثلت تلاش کرنی ہے تو بعض دوسری سکیموں میں بھی مل جائے گی۔ ظفر اللہ کی سکیم ایک لحاظ سے کا بینہ مشن منصوبہ 1946ء کی گروپنگ سکیم سے زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔

سر ظفر اللہ کی متبادل سکیم

علیحدگی کی سکیم کے بعد ظفر اللہ نے اپنے 32 صفحات پر مشتمل نوٹ میں جو وائسرائے کو ارسال کیا ایک اور سکیم کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک کمزور اور غیر تسلی بخش متبادل سکیم ہے اس کو انہوں نے ڈومنین سٹیشن کی بناء پر آل انڈیا فیڈریشن کے قیام کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ شاید مسلمانوں کو قابل قبول نہ ہو پھر بھی وہ اس کو یکسر مسترد نہیں کریں گے اور اس کی بناء پر کوئی باہمی حل تلاش کر لیں گے۔ انہوں نے اپنے نوٹ کے متن کا تین چوتھائی حصہ اس کو بیان کرنے میں صرف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 1935ء کے ایکٹ میں جو فیڈرل سکیم ہے اس میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس پر بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں نمایاں انقلابی تبدیلیاں کی جائیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایکٹ آف 1935ء میں بڑی تفصیل سے موجود فیڈرل دفعات اور ان کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور وسیع پیمانے پر تحفظات تجویز کئے ہیں مثلاً متحدہ ڈومنین میں صوبوں کے لئے زیادہ سے زیادہ خود مختاری، مرکز کے پاس کم سے کم اختیارات، متحدہ ڈومنین کی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستیں وغیرہ تاکہ یہ مسلمانوں کے لئے متبادل سکیم کے طور پر قابل قبول ہو۔ (13)

سر ظفر اللہ کی سکیم کے قابل اعتراض پہلو

ظفر اللہ اپنی آل انڈیا فیڈریشن سکیم میں دو عجیب و غریب تجاویز پیش کرتے ہیں۔

1 شمال مغربی ہندوستان سے شمال مغربی سرحدی قبائلی علاقوں Tribal Areas کو علیحدہ کر دیا جائے۔

2 نہ صرف ان کو علیحدہ کر دیا جائے بلکہ بلوچستان کو بھی نکال دیا جائے اس کو یا تو سرحد، یا پنجاب یا سندھ سے ملا دیا جائے۔

معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ دو تجاویز کیوں پیش کیں اور ان کا کیا منطقی جواز تھا۔ اس کی انہوں نے نوٹ میں کوئی وضاحت نہیں کی کہ آخر وہ یہ دو عجیب و غریب تجاویز کیوں پیش کر رہے ہیں۔ یہ تجاویز مسلمانوں کو ایک بڑے علاقے سے محروم کرنے کا باعث بن سکتی تھیں۔ پروفیسر اسلم ملک کہتے ہیں کہ شاید ظفر اللہ کو اپنے ذرائع معلوم ہوا ہو گا کہ برطانوی حکومت اس اہم سیاسی دور (1940ء) میں کوئی آزاد بلوچستان ریاست کے منصوبے یا افغان بلوچ آزاد ریاست قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے اور اس کے لئے انہوں نے ایسی تجویز پیش کی دوسری بات یہ ہے کہ قادیانی تقریباً نصف صدی سے افغانستان کے خلاف مذموم پروپیگنڈا اور نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ مرزا غلام احمد کے زمانے (1903ء) میں افغان حکومت نے انگریز کے حامی دو قادیانی جاسوسوں صاحبزادہ عبداللطیف اور عبدالرحمن کو سنگسار کیا تھا جس پر مرزا صاحب نے ایک کتاب تذکرۃ الشہادتین (1903ء) لکھ کر انگریز کی پالیسی کی تعریف اور کابل حکومت کی سخت مذمت کی۔ انگریزوں کی کابل کے ساتھ جنگ (1919ء) میں قادیانیوں نے بھرتی، مالی امداد اور ہر طرح سے حکومت کی مدد کی۔ مرزا محمود 1924ء میں لندن میں تھے تو دو قادیانیوں کو افغان حکومت نے جاسوسی کے الزام میں سنگسار کیا۔ اس واقعے پر انہوں نے لندن میں جلسہ منعقد کیا اور کئی ممالک کو تار بھجوائے۔ 1933ء میں نادر شاہ کے قتل پر قادیانیوں نے ’آہ نادر شاہ کہاں گیا‘ کا قادیانی الہام پیش کر کے افغان حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ اور ایسے دوسرے کئی واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قادیانیوں کو ہمیشہ ہی

افغانوں سے نفرت رہی اسی جذبے کے تحت ظفر اللہ شمال مغربی قبائلی علاقوں کو الگ قرار دے کر اپنے فرقے کے لئے امن و سلامتی اور تحفظ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1924ء میں جب کابل میں دو قادیانیوں کو سنگسار کیا گیا تو کئی قادیانیوں نے اپنے نام بطور رضا کار قادیان بھجوائے اور استدعا کی کہ انہیں تبلیغ کے لئے افغانستان روانہ کیا جائے۔ سر ظفر اللہ ان میں پیش پیش تھے اور مصر تھے کہ ان کو کابل میں احمدیت کی تبلیغ کرنے اور احمدیہ مشن قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ افغان حکومت کے خلاف ان کی نفرت اور غم و غصہ کا اظہار ان کی خود نوشت سوانح تحدیث نعمت اور ان کی تصنیف Servant of God میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ (14) اس لئے انہوں نے اپنی متبادل سکیم میں یہ تجویز پیش کی۔

بلوچستان کو بھی وہ ہندوستان سے کاٹ دینا چاہتے تھے تاکہ وہ یا تو اپنی آزاد ریاست قائم کر لیں یا افغانستان کا حصہ بن جائیں۔ (15) جب کہ مسلم رہنماؤں نے بلوچستان اور سندھ اور شمال مغربی علاقوں کو ہمیشہ آزاد مسلم ریاست میں شامل کیا اور 23 مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور میں بھی یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلم اکثریتی علاقوں کو اس طرح ملایا جائے کہ وہ آزاد ملکیتیں بن جائیں اور ان ملکیتوں میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار اور صاحب اختیار ہوں۔ یہ بات ظفر اللہ کی سکیم سے امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ (16)

شیخ عبدالماجدان تاریخی حقائق پر غور کریں تو ان کو ظفر اللہ کی 'فوقیت زدہ' سکیم کی حقیقت معلوم ہو جائے گی اور انہوں نے جس انداز سے تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر ایک غلط نتیجہ نکالنے کی روش اختیار کی ہے اس کی اصلیت ان پر واضح ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ظفر اللہ کے نوٹ کے صرف وہ اقتباسات اپنی کتاب میں درج کئے ہیں جو اس کی حقیقت کو سمجھنے سے متعلق نہیں اور اصل مسئلہ کو قطعاً نظر انداز کر گئے ہیں۔ (17)

ہم ظفر اللہ کی دو فیڈریشنوں پر مشتمل علیحدگی کی سکیم اور آل انڈیا فیڈریشن کے قیام کی تجویز اور ان کے اور دیگر فیڈریشنوں کے تاج برطانیہ سے تعلقات وغیرہ کے نظریات کو محض اس عہد میں پیش

کی گئی متعدد سکیموں میں سے ایک سکیم سمجھتے ہیں۔ ان کی آل انڈیا فیڈریشن کی سکیم کے متعلق خود ان کا خیال تھا کہ یہ مسلمانوں کو قابل قبول نہ ہوگی۔ ان تجاویز کو غیر معمولی اہمیت دینا غلط ہے۔ انہوں نے یہ سکیمیں برطانیہ کے سیاسی مدبروں اور برطانوی رائے عامہ کی آگاہی کے لئے مرتب کیں۔ تحریک پاکستان میں ان کا یا جماعت احمدیہ کا عملی حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان سکیموں کا ذکر انہوں نے اپنی تصانیف میں نہیں کیا (18) اگر یہ واقعی کوئی اہم کارنامہ تھا تو وہ اس کا تذکرہ کرتے، یہ تو 1981ء میں ولی خان کی تاریخ پاکستان کے متعلق غلط بیانات تھیں جن کے نتیجے میں سر ظفر اللہ کی سکیمیں منظر عام پر آئیں اور لوگوں کو اصل حقائق معلوم ہوئے اور خود سر ظفر اللہ نے ان کی وضاحت میں ایک بیان جاری کیا۔

حوالے و حواشی

- (1) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال، دور تحریک احمدیہ ص 415
- (2) ایضاً
- (3) دلی خان کا انٹرویو ہفت روزہ چٹان لاہور، 21 دسمبر 1981ء ص 12-13 نیز محمد فاروق قریشی، دلی خان اور قرارداد پاکستان، کلکتہ ہاؤس لاہور 1997ء
- (4) Facts Are Facts, Vikas, New Delhi, 1987
- (5) زاہد چوہدری، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء 308-312
- (6) بجگ راوی پنڈی، 22 - 25 آگست 1987
- (7) The Pakistan Times, Lahore, 24 January 1982
- (8) The Pakistan Times, Lahore, 29 January 1982
- (9) زاہد چوہدری، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء ص 296 تا 308
- (10) ظفر اللہ کہتے ہیں کہ فیڈریشنوں کے قیام کا نظریہ جس تفصیل سے اور وضاحت کے ساتھ میرے نوٹ میں پیش کیا گیا یہ بات میرے ہم عصروں یا مجھ سے پہلے آنے والوں کی کسی دستاویز یا بیان میں قطعاً موجود نہیں تھا، پاکستان ٹائمز 13 فروری 1982ء
- (11) Muhammad Aslam Malik, The Making of Pakistan Resolution Oxford, 2001, p.175,251
- (12) ماہنامہ انصار اللہ ربوہ نومبر دسمبر 1985ء، ظفر اللہ کا نوٹ پاکستان ٹائمز 13 فروری 1982ء (اردو ترجمہ)
- (13) زاہد چوہدری حوالہ سابق ص 296 تا 312
- (14) تحدیث نعمت ص 219، اور P. 51, Servant of God
- (15) Muhammad Aslam Malik, The Making of Pakistan Resolution, Oxford, 2001 pp.169,175
- (16) محمد اسلم ملک، حوالہ سابق ص 213 ظفر اللہ کی سکیم کا مکمل متن کتاب کے ضمیمہ جی (G) میں موجود ہے۔

(17) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت ص 6-245، فکر اقبال اور جماعت احمدیہ باب 22 صفحات 401-416 نیز

صفحات 152-153

(18) تحدیث نعمت

- The Agony of Pakistan

-Servant of God

قادیانی سٹیٹ کا خواب

23 مارچ 1940ء کو قرارداد لاہور کی منظوری کے بعد مسلم لیگ مطالبہ پاکستان کو لے کر آگے بڑھی۔ قائد اعظم کی قیادت میں مسلمان آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی جدوجہد میں جوق در جوق شامل ہونے لگے۔ پنجاب میں جن دو جماعتوں کو قرارداد پاکستان کے بعد سخت خطرہ درپیش تھا ان میں ایک قادیانی اور دوسرے سکھ تھے۔ سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا کہ اسلامی ریاست کے قیام کے لئے مسلمانوں کو سکھوں کے خون کے سمندر سے گزرنا پڑے گا۔ قادیانیوں نے قرارداد پاکستان اور اسلامی مملکت کے قیام کی تائید میں کوئی آواز بلند نہ کی بلکہ اپنے لئے قادیان میں پوپ کی ریاست ویٹیکن کی طرز پر آزاد ریاست کے قیام کی تک و دو شروع کر دی۔ مرزا بشیر احمد نے اس پروجیکٹ پر کام شروع کیا۔ انہوں نے قادیان کی مجوزہ ریاست کی حدود متعین کرنے کے لیے ایک نقشہ تیار کیا۔ اصل مقصد کو چھپانے کے لئے اس کا نام ماحول قادیان رکھا جو ضلع گورداسپور کی تحصیل گورداسپور اور بٹالہ کے حصوں پر مشتمل تھا۔ اسے 15 جولائی 1940ء کو تیار کر لیا گیا۔

مصنف 'تاریخ احمدیت' لکھتے ہیں کہ مرزا بشیر احمد نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے تبلیغ، تنظیم اور خریدار ارضیات کے پیش نظر مرکز احمدیت قادیان کے ماحول کا ایک مفصل نقشہ اگست 1940ء میں شائع کیا جس میں قادیان کے ارد گرد کا دس دس میل تک کا علاقہ دکھایا گیا تھا اور دیہات کی حدود، اہم راستوں اور نہروں کے علاوہ تھانے، ضلعوں کے صدر مقام، موٹروں کے اڈے، ڈاک بنگلے اور سکول بھی دکھائے گئے تھے، نقشہ میں ہر گاؤں کی مسلمان، ہندو، سکھ، مخلوط اور احمدی آبادی کو ظاہر کیا گیا تھا (1)۔ احمدی آبادی مسلمان آبادی سے الگ طور پر ظاہر کی گئی تھی۔ یہ نقشہ صرف خاص خاص افراد کو مہیا کیا گیا جن کو یہ معلوم تھا کہ مجوزہ قادیانی سٹیٹ کیسی ہوگی۔ قادیانیوں کا کہنا تھا کہ یہ نقشہ تبلیغی اور تنظیمی مقاصد کے پیش نظر شائع کیا گیا ہے اور اس کے پیچھے کوئی

سیاسی مصلحت کارفرما نہیں لیکن پنجاب کے طول و عرض میں یہ بات پھیل گئی کہ احمدی انگریز حکومت سے ساز باز کر کے اپنی ریاست قائم کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ قادیان میں مرزا محمود کا حکم چلتا تھا اور یہ علاقہ ان کی سیٹھ تھی۔ اس کا ذکر برطانوی سول سروس کے بعض افسران جن میں او برائن شامل تھا کر چکے تھے۔ جسٹس کھوسلہ کے فیصلے (1935) میں بھی اس کا ذکر موجود تھا۔ اکالی سکھوں نے الزام لگایا کہ چونکہ دوسری جنگ عظیم جاری ہے اس لئے قادیانیوں نے انگریز سے وفاداری، فوجی بھرتی کے وعدوں اور گزشتہ سیاسی خدمات کی بنیاد پر قادیان کے ارد گرد دس دس میل تک اپنی ریاست کی حدود مقرر کر دی ہیں اور یہ ریاست جلد قائم ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں سکھ وفد قادیان آئے تاکہ حقیقت حال معلوم کریں۔ قادیانیوں کی تردید کے باوجود اکالیوں نے اپنے سکھ جتھے 17 نومبر 1940ء کو قادیان میں داخل کر دیئے اور ایک قریبی علاقے میں اکالی کانفرنس منعقد کر کے حکومت کو قادیانی ریاست قائم کرنے کے خلاف متنبہ کیا۔ سکھ۔ قادیانی نزاع بڑھتا چلا گیا۔ پنجاب کے سکھ جرائد نے مجوزہ قادیانی ریاست کے خلاف ادارے لکھے۔ جیسے جیسے پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا رہا سکھ اور قادیانی پنجاب میں اپنی ریاست قائم کرنے کے لئے انگریز سے ساز باز کرتے رہے۔ اکالی دل نے آزاد پنجاب کا نعرہ لگایا تاکہ پنجاب کی سرحدوں میں تبدیلی کر کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو الگ کر دیا جائے۔ 4 جون 1943ء کو شرومنی اکالی دل نے مزعومہ سکھ ریاست کی حدیں متعین کیں۔ 16 مئی 1946ء کو سردار بلدیو سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ لارڈ ویول سے ملے اور خالصتان کے قیام کا مطالبہ کیا۔ ادھر قادیانی قادیان کی مذہبی حیثیت کی بناء پر ایک صوبہ یا سیٹھ کا مطالبہ کرتے رہے۔

سکھ اور قادیانی دونوں اپنی اپنی ریاستوں کیلئے جدوجہد کر رہے تھے۔ سکھوں نے پہلے آزاد پنجاب کا نعرہ لگایا پھر کانگریس سے ساز باز کر کے پنجاب کی تقسیم کا اعلان کیا۔ سکھ قیادت کے قائد اعظم کے ساتھ مذاکرات ناکام ہو گئے۔ مسلم لیگ تقسیم پنجاب کے حق میں نہ تھی وہ پورے پنجاب کو پاکستان میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ قادیانی مسلم لیگ کی حمایت میں نہیں بلکہ قادیان میں اپنا

تسلط برقرار رکھنے کے لئے تقسیم پنجاب کے خلاف تھے۔ مرزا بشیر احمد نے ایک رسالہ 'خالصہ ہوشیار' لکھا جس میں تقسیم پنجاب کی معاشی، مذہبی اور سیاسی بنیادوں پر مخالفت کی اور اس کے ساتھ نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے ہزاروں کے خلاف آواز بلند کی۔ مرزا بشیر احمد نے سکھ لیڈروریام سنگھ کے ذریعے اکالی قیادت سے سیاسی مفاہمت کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ شیخ عبدالماجد کہتے ہیں کہ 1946ء میں سکھ لیڈروریام سنگھ نے مرزا بشیر احمد سے کہا کہ ملک بٹ رہا ہے مسلمان آپ کو اپنانے کے لئے تیار نہیں پس آپ ان کی وجہ سے سکھوں اور ہندوؤں سے نہ بگاڑیں۔ میں آپ کی ہمدردی کے خیال سے کہتا ہوں کہ آپ مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر ہمارے ساتھ سمجھوتہ کر لیں ہم آپ کی جماعت کو قادیان اور اس کے ماحول میں ایک قسم کی نیم آزاد حکومت دینے کو تیار ہیں۔ (2)

شیخ عبدالماجد کے بقول مرزا بشیر احمد نے اس پیش کش کو نہ مانا۔ دراصل خالصہ پن্থہ اس کے خلاف تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ قادیانیوں نے اپنی مزعومہ آزاد سٹیٹ یا نیم خود مختار صوبے کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی جواز پر مبنی ایک میمورنڈم لندن مشن کے ذریعے برطانوی وزیر اعظم اسٹیلی کی حکومت کو پیش کیا لیکن حکومت کے سیاسی مشیر ہیرلڈجے لاسکی نے اس کو ناقابل عمل بتایا کیونکہ مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان زور پکڑ رہا تھا اور پنجاب اسلامی ریاست میں شامل تھا۔ دوسرے قادیانی ریاست چاروں طرف سے گھری ہوئی لینڈ لاکڈ Land-locked ریاست بنتی تھی۔ اگرچہ قادیانی انگریز کو اس بات کا یقین دلاتے تھے کہ وہ مستقبل میں برطانوی مفادات کے لئے کام کریں گے اور یہ ہندوستان اور پاکستان میں ایک بفر سٹیٹ ہوگی لیکن انگریز نے اس کو نہ مانا۔ اس کے علاوہ مجوزہ نیم خود مختار قادیانی ریاست کا قیام اس لئے ممکن نہ تھا کہ احمدیوں کی علیحدہ سیاسی حیثیت کا تعین نہ ہوا تھا اور قادیان کے دس دس میل کے اندر جن علاقوں کو اس ریاست میں شامل کرنے کی تجویز تھی ان میں سے کئی علاقوں میں ہندو سکھ اکثریت تھی اور احمدیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ قادیانیوں نے ماسٹر تارا سنگھ، بلدیو سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ سے رابطہ قائم کیا لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ لارڈ مونٹ بیٹن

نے جب 3 جون کا انتقال اقتدار کا منصوبہ پیش کر دیا تو قادیانی ریاست کا خواب دم توڑ گیا۔

قادیانیوں نے 1945-46ء کے انتخابات میں انیس یونینٹ امیدواروں کی حمایت کی تھی اور ان کا ایک ممبر فتح محمد سیال آزاد حیثیت سے کامیاب ہوا تھا لیکن مسلم لیگ نے پنجاب کے مسلم حلقوں میں 86 نشستوں میں سے 75 نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ اس کامیابی سے یونینٹ پارٹی کو سخت دھچکا لگا تھا لیکن فروری 1946ء میں یونینٹ۔ اکان ازر کا ٹکریس گھ جوڑ سے خضر وزارت بنائی گئی، اس میں دس مسلمان یونینٹ شامل تھے۔ مسلم لیگ نے خضر وزارت کے خلاف تحریک چلائی 3 جون کے منصوبے کے تحت تقسیم پنجاب کو آئینی حیثیت حاصل ہو چکی تھی حکومت نے اس کے فیصلے کے لئے 23 جون 1947ء کا دن مقرر کیا۔ 17 جون 1947ء کو مرزا محمد نے اپنے سکھ قوم کے نام ایک اپیل جاری کی جس میں انہیں مشورہ دیا کہ پنجاب کی تقسیم پر راضی نہ ہوں اس سے ان کے سیاسی اور معاشی مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ انہوں نے دعا کی کہ یہ ملک بٹ نہیں اور اگر بٹے تو اس طرح بٹے کہ پھر مل جانے کے راستے کھلے رہیں لیکن کانگرس کے ایماء پر غیر مسلم ممبران اسمبلی تقسیم پر راضی ہو گئے۔ گورنر پنجاب ایوان جمیلنگر بھی سکھوں کے مطالبات کا حامی تھا۔ ان حالات میں قادیان کو بچانے اور آزاد یا نیم مختار قادیانی صوبہ یا ریاست قائم کرنے کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔

اب قادیانی پاکستان اور مسلم لیگ کی طرف جھکنے لگے کیونکہ ان کے لئے اب اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ظفر اللہ نواب بھوپال کے آئینی مشیر تھے جو ہندوستانی ریاستوں کے چیمبر آف پرنسز کے چانسلر تھے۔ ابھی تک ظفر اللہ نے تحریک پاکستان کے لئے کوئی خدمت انجام نہ دی تھی لیکن لگی قیادت کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے وہ خضر حیات سے ملے اور اسے وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دینے کی تجویز کی تاکہ مسلم لیگ حکومت، مازنی کر سکے، حراس نے مجبوراً مان لی۔ قادیانی یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ حکومت پاکستان ظفر اللہ کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنادے گی اور اسی منصب کے حصول کے لئے وہ زور لگا رہے تھے لیکن 25 ستمبر 1947ء کو نائد اعظم نے ان کو وزیر خارجہ بنا دیا۔ قائد

اعظم حسین شہید سہروردی کو وزیر خارجہ بنانا چاہتے تھے لیکن وہ اس بات سے ناراض تھے کہ خراجہ ناظم الدین کو مشرقی پاکستان کا وزیر اعلیٰ بنادیا گیا تھا۔ ظفر اللہ کو وزیر یہ مقرر کرنے کی پاکستانی پریس نے مخالفت کی کیونکہ وہ قادیانی تھے انہوں نے مسلم لیگ میں کبھی شمولیت اختیار نہ کی۔ قائد اعظم جانتے تھے کہ سر ظفر اللہ کے انگریزوں سے قریبی روابط ہیں اور مونٹ بیٹن پاکستان کے خلاف ہے اس طرح ممکن ہے کہ ظفر اللہ اپنے ذاتی رسوم سے حکومت برطانیہ کے ساتھ معاملات کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو سکیں۔

مرزا محمود قادیان کے آمر مطلق تھے یہ علاقہ ان کا مذہبی اور سیاسی سرچشمہ تھا جہاں ان کا حکم چلتا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ بے بسی کے عالم میں یہاں قیام پذیر تھے اور پاکستان آنا چاہتے تھے۔ ان کے منصوبے ناکام ہو چکے تھے۔ قادیان ہندوؤں اور سکھوں کے مزاحیہ انداز اور 1947ء کے آخر میں وہ لاہور کی طرف چل پڑے۔ جن لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے برقعہ پہن لیا تھا بعض افراد کہتے ہیں کہ انہوں نے ہندو جوگی کا روپ دھار لیا تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ کھڑکھٹاؤں میں گھر وہاں سے فرار ہوئے۔ یہ سب باتیں ان کو بدنام کرنے کے لئے ان کے دشمنوں نے گھڑی ہیں۔ اس احمدی نے جس کے سامنے وہ موٹر میں بیٹھ کر الہ آباد روانہ ہوئے تھے اپنے بھائی کو ان کی روانگی مارا قہہ سنایا اور اس نے راقم کو ان کی قادیان سے روانگی کا تمام واقعہ بتایا۔ اس کو اس بات پر افسوس تھا کہ حضرت صاحب احمدیوں کو آگ اور خون میں تڑپتا چھوڑ کر لاہور آ گئے لیکن وہ یہ بھی کہتا تھا کہ یہ ہجرت حضرت مرزا صاحب کے ایک الہام ”درغ ہجر“ کے لیے مصافحہ تھی۔

حوالے و حواشی

- (1) دوست محمد شاہد، تاریخ احمدیت جلد نہم ص 104
- (2) اقبال اور احمدیت ص 306 الفصل 23 اپریل 1955ء

منتخب کتابیات

حرفِ اقبال	لطیف احمد شروانی
علامہ اقبال: تقریریں، تحریریں اور بیانات	مترجم اقبال احمد صدیقی
اقبال اور قادیانی	نعیم آسی
اقبال اور قادیانیت	شورش کاشمیری
اقبالی مجرم	ایضاً
فیضانِ اقبال	ایضاً
اقبالیات شورش	مشتاق احمد
ختمِ نبوت اور عقیدہ اقبال	عبد المجید خان راجد
اقبال اور قادیانیت	خالد شبیر احمد
تاریخِ محاسبہ قادیانیت	ایضاً
اقبال اور احمدیت	بشیر احمد ڈار
انوارِ اقبال	ایضاً
دینِ بہائی اور احمدیت	سید محمد علی شاہ
زندہ رود (تین جلدیں)	ڈاکٹر جہادید اقبال
کلیاتِ مکاتیبِ اقبال حصہ اول تا چہارم	مظفر حسین برنی
اقبال نامہ (حصہ اول و دوم)	شیخ عطا اللہ
خطوطِ اقبال بنام جناح	مترجم حمید اللہ ہاشمی
خطوطِ اقبال	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
کتابیاتِ اقبال	ایضاً
تصانیفِ اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ	ایضاً

اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ

تصور پاکستان: اقبال پر اعتراضات کا جائزہ

معتبر ضمیمہ اقبال

اقبال کا فکری نظام اور پاکستان کا تصور

ملفوظات اقبال

ذکر اقبال

اساسیات اقبال

اقبال کے حضور

دائے راز

ملت اسلامیہ، ایک عمرانی مطالعہ

حیات اقبال میں نشتر اقبال

علامہ اقبال: حیات، فکر و فن

افکار اقبال

افکار اقبال

نظریات اقبال

اقبال اور مسلم مفکرین

اقبال کا فلسفہ سیاسیات

مفکر پاکستان

اقبال اور انجمن حمایت اسلام

اقبال کے ملی افکار

مقالات اقبال

ڈاکٹر ایوب صابر

ایضاً

ایضاً

پروفیسر فتح محمد ملک

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

عبدالمجید سالک

ڈاکٹر وحید قریشی

سید نذیر نیازی

ایضاً

مترجم شاہد اقبال کامران

ڈاکٹر تحسین فراقی

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر محمد ریاض

محمد حامد

کلیم نشتر

ڈاکٹر ملک حسن اختر

پروین شوکت علی

محمد حنیف شاہد

ایضاً

منمود عاصم

سید عبدالواحد معینی

اقبالیات کا تنقیدی جائزہ

سر سید سے اقبال تک

عام فکری مغالطے

گفتارِ اقبال

اقبال کا سیاسی کارنامہ

اقبال کے آخری دو سال

اقبال اور سیاست ملی

اقبال کا سیاسی سفر

آتشِ چنار

مجلسِ احرار اور تاریخی تحریف کی یلغار

تحریکِ پاکستان میں پنجاب کا کردار

پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد ۵

میاں فضل حسین کے خطوط

ان کی داستانِ کشمیر

تاریخِ کشمیر

اقبال اور کشمیر

اقبال اور کشمیر

اقبال اور تحریکِ آزادیِ کشمیر

روزگارِ فقیر جلد اول و دوم

روایاتِ اقبال

اقبال کی ابتدائی زندگی

قاضی احمد میاں اختر جو ناگزہی

قاضی جاوید

علی عباس جلالپوری

محمد رفیق افضل

محمد احمد خاں

عاشق حسین بٹالوی

رئیس احمد جعفری

محمد حمزہ فاروقی

شیخ عبداللہ

ماسٹر تاج الدین لدھیانوی

محمد اعظم چوہدری

زاہد چوہدری

مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد

ڈاکٹر سلام الدین نیاز

سید محمود آزاد

سلیم خان گگی

جگن ناتھ آزاد

غلام نبی خیال

فقیر وحید الدین

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین

القول الفیصل

ایضاً

مسلمانوں کے حقوق اور نہرو رپورٹ

ایضاً

ہندوستان کے مسئلہ کا سیاسی حل

ایضاً

سیرت مسیح موعود

ایضاً

آل انڈیا کشمیر کمیٹی اور احرار اسلام

ایضاً

اقبال اور احمدیت

شیخ عبدالماجد

فکر اقبال اور تحریک احمدیہ

ایضاً

مظلوم اقبال

شیخ اعجاز احمد

احمدیت اقبال کی نظر میں

عبدالمالک خاں

نور الدین اعظم

شائع کردہ یگ مین احمدیہ

ایسوسی ایشن، لاہور

حیات نور الدین

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

تحریک احمدیت

مولوی محمد علی لاہوری

تحدیثِ نعمت

سر ظفر اللہ خاں

علامہ اقبال مرحوم اور بانی سلسلہ احمدیہ

ڈاکٹر اللہ بخش

مجدد اعظم

ڈاکٹر بشارت احمد

مراۃ الاختلاف

ایضاً

رسالہ تبدیلی عقیدہ مولوی محمد علی

محمد اسماعیل

حیاتِ طیبہ

شیخ عبد القادر سوداگر مل

مجدد کامل

خواجہ کمال الدین

تحریک احمدیت اور اقبال

انتر حسین گیلانی

القول الفصل

تبلیغ رسالت جلد اول تا ششم

سیرت المہدی

اصحاب احمد

سوویتیر 87-1986

ماہنامہ انصار اللہ، ربوہ، سرظفر اللہ نمبر نومبر-دسمبر 1985ء

ماہنامہ الفرقان، ربوہ، جولائی-اگست 1967ء

ضمیمہ ماہنامہ خالد، ربوہ-ستمبر 1985ء

متفرق فائل

روزنامہ الفضل، قادیان

ہفت روزہ لائٹ، لاہور

ہفت روزہ پیغام صلح، لاہور

ریویو آف ریلی جنسز، قادیان (انگریزی-اردو)

میر حامد سیالکوٹی

میر قاسم علی قادیانی

مرزا بشیر احمد ایم اے

صلاح الدین ملک

مجلس خدام الاحمدیہ کراچی

SELECT BIBLIOGRAPHY

Ikram Ali Malik, A Book of Readings On the History of the Punjab, 1799-1947, Research Society of Pakistan, Lahore, 1979

G. Allana (Edit), Pakistan Movement: Historic Documents, Islamic Book Service, Lahore 1977

Sarfraz Hussain Mirza, Syed Farooq Hasnat, Sohail Mahmood, The Sikh Question, Punjab University Lahore, 1986

Syed Abdul Vahid, Studies in Iqbal, Lahore 1977

M. M. Sharif, A History of Muslim Philosophy Vol. (II) Karachi 1983-chap. LXXXI

Bashir Ahmad, Ahmadiyyah Movement: British-Jewish Connections, Rawalpindi (Islamic Study Forum P.O Box 639), 1994

Yousaf Saraf, Kashmir fights for freedom, 2 Volumes, Lahore, 1997

K. Warkoo. Central Asia and Kashmir, Gian Publishing House, New Delhi, 1989

Zarina Salamat, The Punjab in 1920s, Royal Book Academy, Karachi, 1979.

W.C. Smith, Modern Islam In India, Lahore, 1943, Rev. 1954,

Dr. L.S. May, The Evolution of India -- Muslim Thoughts After 1875, Lahore 1970, Chap IV, Ahmadiyyah Movement.

Sharif-ud-Din Pirzada, Foundation of Pakistan, Karachi 2 Vol, 1970.

A. M. Zaidi, Evolution of Muslim Political Thoughts, Vol, V 1929-1936.

S. A. Vahid (Edit), Thoughts And Reflections of Iqbal, Lahore.

Muhammad Aslam Malik, The Making of The Pakistan Resolution, Oxford, 2003.

V. Grover (Edit), The Story of Punjab Vol 1-3, Delhi,

Shahid Hussain Razzaqi (Edit), Discourses of Iqbal, Lahore

Iqbal – New Dimensions, A collection of unpublished and rare Iqbalian studies, compiled and annotated and translated by M. Ikram Chaghatai, Sang-e-Meel Publications, Lahore 2003

Rafiq Zakaria, Iqbal, The Poet and the Politician, Viking Delhi, 1994

Hafeez Malik (Edit), Iqbal-Poet Philosopher of Pakistan, New Delhi, 1977

Iqbal Singh, The Ardent Pilgrim, London 1951

Azim Hussain, Mian Fazl-i-Hussain, A Political Biography, London 1966

Malik Iftikhar Haider, Sikander Hyat Khan, 1892-1942, A Political Biography, Islamabad

Victoria Schofield, Kashmir In Conflict, London, 2000

B. A. Dar, Letters and Writings of Iqbal, Lahore

Y. B. Mathur, Growth of Muslim Politics in India, Lahore

Phoenix, His Holiness, Lahore

Pandit Jawaharlal Nehru, Selected Works, Longman, London.

Dr. Mahmood A. Ghazi, Islam and Qadianism.

Molvi Muhammad Ali, Sir Muhammad Iqbal's statement regarding Qadianis.

Mirza Mahmud Ahmad, The Truth About Split.

Sir Zafrullah Khan, Servant of God

Sir Zafrullah Khan, Agony of Pakistan.

A.R. Dard, Life of Ahmad.

Review of Religions, Qadian, June 1935, March 1936.